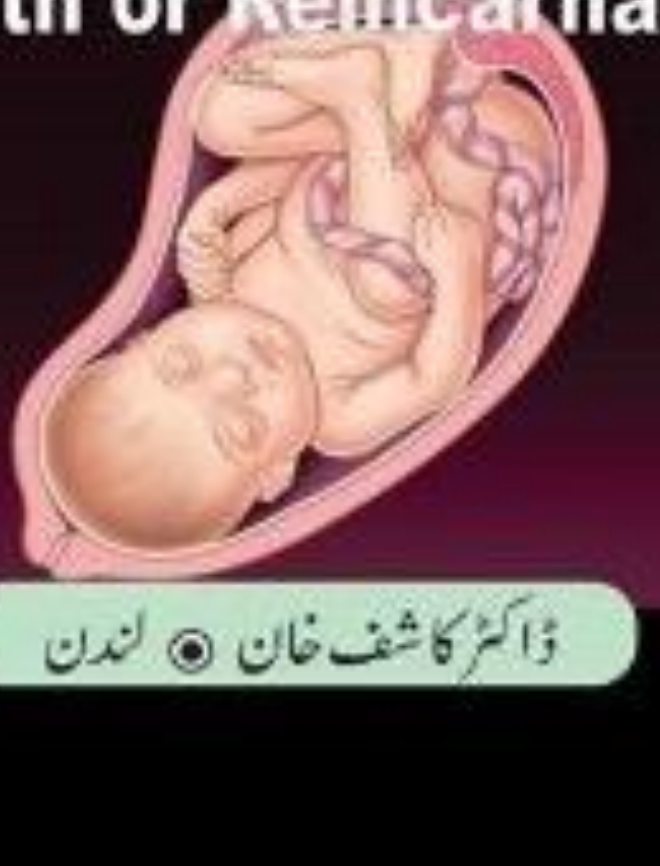
اِحتساب
اور
اِنسان کی پیدائشِ نَو

Rebirth or Reincarnation



ڈاکٹر کاشف خان ● لندن

منجانب: آپ کا ایک خیر خواہ بھائی

پوسٹ بکس نمبر 31، کراچی 74200

پیش لفظ

راقم الحروف نے ایک دین دار سنی گھرانے میں آنکھ کھولی اور سات سال کی عمر میں قرآن کی تعلیم کے لئے اسے مدرسہ تجوید القرآن کے مدرّس اور مدرسہ انوار القران کے بانی جناب حافظ صدر الدین صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد تجوید، قرأت اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور معروف محدث جناب حافظ عبدلقادر روپڑی صاحب سے حدیث سمجھنے کا فیض بھی حاصل ہوا۔ تحقیق و تجزیئے کا تجسس راقم الحروف کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں لے گیا اور لندن سے سائنسی تحقیق میں پیشہ ورانہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد راقم الحروف نے برطانیہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ انگلستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی سرکاری اور نیم سرکاری عہدوں پر کام کرنے کے دوران راقم الحروف کا تعلیمی اور اکتسابی عمل جاری رہا۔ خاص طور پر **مكة المكرمه** اور طائف میں قیام کے دوران مقامی عربی زبان کے ساتھ ساتھ اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ۱۹۹۴ء میں مغربی لندن میں واقع اپنے گھر سے راقم الحروف نے درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جس میں مقامی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ملحقہ علاقوں کے مسلمان بھی شرکت کرنے لگے۔ اگرچہ اس درسِ قرآن کا اولین مقصد روایتی اور نظریاتی درس کی بجائے لوگوں کو قرآن کا متن اور قرآن کی زبان سکھانا تھا تاکہ لوگ بغیر کسی ترجمے اور تفسیر کے خود قرآن پڑھ کر اس کے اصل مفہوم تک پہنچ سکیں۔ مگر چونکہ لوگ کیسٹ والے اور نظریاتی تراجم و تفسیر کے روایتی درسِ قرآن کے عادی تھے اس لئے ان کے اصرار اور دلچسپی کے پیشِ نظر راقم الحروف کو بھی مجبوراً اس خالص عربی درسِ قرآن کے آخر میں محتاط طریقے سے تفسیری گرم مصالحے کا معمولی سا تڑکہ لگانا پڑا تاکہ لوگوں کی حاضری برقرار رہے اور وہ رفتہ رفتہ قرآن کو سمجھ کر بغیر نظریاتی تراجم و تفسیر کے خود قرآن کا مفہوم سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔

راقم الحروف نے اپنے گھرانے میں ہر اچھے برے وقت پر باقاعدگی سے پڑھے جانے والے "مولا مشکل کشا علی" اور "بی بی فاطمہ" کے "معجزوں" کو اپنی اوائل عمری میں ہی صرف اس لئے جلا ڈالا تھا تاکہ اس کے گھر والے یہ سوچ کر شرک کرنے سے بچ جائیں کہ ان نام نہاد معجزوں میں جو بڑی تنبیہ کے ساتھ یہ کہہ کر ڈرایا جاتا ہے کہ ان کا انکار کرنے والے اپنے بھیانک انجام سے کسی صورت میں بھی نہیں بچ سکتے وہ سب جھوٹ ہے۔ اس کے بعد سچائی کی تلاش میں جب راقم الحروف نے اپنا آبائی بریلوی مسلک چھوڑ کر اہلِ حدیث مسلک اختیار کیا تو اس نے اپنے ہم عمر نوجوانوں کی ایک ٹولی بنائی اور بخاری ہاتھ میں لے کر گھر گھر دستک دے کے عملی طور پر احادیث کی پرزور تبلیغ کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو احادیث کا اتباع کر کے سنت رسول ﷺ پر چلنے کی تلقین بھی کرنا شروع کر دی۔ گھر والوں کی سخت مخالفت اور رفع یدین کے منکرین سنی حضرات سے "مکھی مار" جیسے ہتک آمیز نام ملنے کے باوجود راقم الحروف نبی کریم ﷺ کی محبت میں سرشار ہو کر رفع یدین پر سختی سے اس لئے کار بند رہا کہ کہیں اس کی نمازیں نبی کریم ﷺ کے طریقہ نماز سے اختلاف نہ کریں۔ اگر کوئی شخص بخاری، مسلم یا صحاح ستہ کے نام سے لکھ کر مشہور کی جانے والی کتابوں کی احادیث کے خلاف بات کرتا تو راقم الحروف کے جی میں آتا کہ اس نامراد منکر حدیث کی زبان گدّی سے کھینچ لے۔ چنانچہ منکرینِ حدیث کے ساتھ خوب زوردار مناظرے، بحث و مباحثے اور حتیٰ کہ جھگڑے تک ہونا شروع ہو گئے۔ منکرینِ حدیث میں دیگر فرقوں کے علاوہ اپنے آپ کو سنّی کہنے والے تمام بریلوی اور دیوبندی حضرات بھی شامل ہیں جو اپنے غیر سنّتی عقائد کے لحاظ سے نماز میں ادا کی جانے والی مبینہ بڑی سنت رفع یدین کے ساتھ ساتھ آمین بالجہر، وتر کی ایک رکعت اور ہاتھوں کی دونوں ہتھیلیوں کو جوڑ کے دعا مانگنے کے انداز میں دعائے قنوت پڑھنے کی احادیث کو نہیں مانتے۔ دیگر عقائد کے ساتھ ساتھ نماز جنازہ میں سورة الفاتحہ کا نہ پڑھنا، باقاعدہ نماز کی رکعتوں میں اختلاف اور عیدین کی نمازوں کی تکبیروں میں بھی احادیث کے خلاف چلنے کی وجہ سے سنی بھی سب سے بڑے اور پکے منکرینِ حدیث ہیں۔ اندر

سے تو اہل حدیث بھی سنیوں کو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ چلنے والے اور راستے سے بھٹکے ہوئے منکرین حدیث ، مشرک اور بدعتی سمجھ کر انہیں ویسا ہی اچھوت خیال کرتے ہیں جیسا کہ اہل قرآن اپنے مقابلے میں اہلِ حدیث کو کم عقل، بھٹکے ہوئے، مشرک اور منکر قرآن تصور کرتے ہیں۔مگر سنیوں کو کھلم کھلا منکرِ حدیث اس لئے نہیں کہا جاتا کہ وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے حدیث کی کتابوں یعنی صحاح ستہ کی احادیث کا نام سن کر دوسروں کے مقابلے میں کم از کم خاموش ضرور ہو جاتے ہیں۔اہلِ تشیع کا معاملہ تو بالکل ہی الگ ہے جس پر بحث کرنا ہی بے کار ہے۔ لہٰذا راقم الحروف نے نبی کریم ﷺ کی خالص سنت پر چلنے کی لگن اور آپ ﷺ کی اطاعت و پیروی کرنے کی دھن میں بطور راسخ اہلِ حدیث بیس سال گزار

دیئے جس کے بعد ایک نئی صبح طلوع ہوئی جب بخاری کے معمول کے مطالعہ کے دوران باب النکاح کی ایک ایسی حدیث نے راقم الحروف کو جھنجوڑ کے رکھ دیا جس میں نبی کریم ﷺ کی شانِ مبارک میں صریحاً گستاخی کی گئی تھی۔مزید دھیان دیا تو ایسی بہت سے احادیث مل گئیں جو نا صرف گستاخیِ رسول ﷺ کے زمرے میں آتی ہیں بلکہ قرآنی احکام کے بھی خلاف ہیں۔راقم الحروف نے یہ سنگین معاملہ جب اہلِ حدیث علماء کے سامنے رکھا تو ان کے پاس سوائے اِدھر ادھر کی باتوں کے کوئی معقول اور ٹھوس جواب نہیں تھا جس سے راقم الحروف کے اہل حدیث مسلک میں رہنے کا جواز بھی ختم ہو گیا کیونکہ یہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں تھی بلکہ نبی کریم ﷺ پر بہتان تراشی اور قرآنی احکامات سے انحراف کی راہ تھی۔راقم الحروف نے احادیث کے ذریعے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر چلنے کے لئے حدیث کی کتابوں کے مقابلے میں جس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا اسے کھول کر دیکھا تو قرآن کریم نے سوال پہ سوال کر دیئے کہ "اللہ سے زیادہ سچی حدیث اور کون لا سکتا ہے؟"۔ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيثًا(4:87)۔"اگر وہ سچے ہیں تو ایسی کوئی حدیث لا کر دکھائیں"۔ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ(52:34)۔"پھر وہ اس کے بعد کس حدیث پر ایمان لائیں گے؟"۔ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ(7:185)،(77:50)۔" کیا تمہارے پاس موسیٰ کی حدیث ہے؟"۔وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ(20:9)۔" کیا تمہارے پاس ابراھیم کے معزز مہمانوں والی حدیث ہے؟"۔هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ (51:24)۔ قرآن نے پھر وہی سوال کیا کہ " کیا تمہارے پاس موسیٰ کی حدیث ہے؟ "۔هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ(79:15)۔ اس کے بعد قرآن نے اس ساری صورت حال پر ملال کرتے ہوئے وعظ و نصیحت کے ساتھ اپنے خدشات کا اظہار اس انداز میں کیا کہ "اللہ نے بہترین حدیث نازل فرمائی ہے "۔ اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ(39:23)۔ " اگر وہ اس حدیث پر ایمان نہ لائے تو شائد تم اس دکھ میں کہیں اپنی جان ہی نہ گنوا بیٹھو۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا(18:6)۔ "یہ اللہ کی آیات ہیں جو حقیقتاً تم پر بیان کی گئی ہیں پھر اللہ اور اس کی آیات کے بعد وہ کون سی حدیث ہے جس پر ان کا ایمان ہے"؟۔تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ(45:6)۔ یہ (قرآن) کوئی ایسی حدیث نہیں جو گھڑ لی جائے بلکہ

اس کی جلدوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کے ہاتھوں تصدیق شدہ ہے۔ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ(12:111)۔قرآنی محاورے "بَيْنَ يَدَيْهِ " کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت ہے جس کے معانی ہمارے علمائے کرام نے قرآن سے پہلی کتابوں کے لئے ہیں۔يَدَي ہاتھوں (hands) کو کہا جاتا ہے جس کے آخر میں لگی ہوئی واحد غائب کی ضمیر " ہٖ " ایک سے زیادہ اشخاص یا اشیاء پر رجعت نہیں کرتی بلکہ His اور Its کے معانی میں کسی ایک ہی شخص یا اکیلی شے کا حوالہ دیتی ہے۔قرآن سے پہلی کتابیں چونکہ تعداد میں ایک سے زیادہ ہیں لہٰذا "يَدَيْهِ" کسی بھی قاعدے کی رو سے قرآن سے پہلی

کتابوں کے معانی نہیں دیتا۔ چنانچہ "یَـدَیـہِ" کا صحیح مفہوم اخذ کرنے کے لئے ہمارے پاس اب صرف دو باتیں باقی بچتی ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ "یَـدَیـہِ" کا لفظی ترجمہ "اس کے ہاتھ" (His Hands) کیا جائے اور اس سے پہلے آنے والے عربی لفظ "بَیــــنَ" کو فارسی زبان کے اسی لفظ "بَیـنَ" کے معانی مابین، درمیان اور بیچ میں لینے کی بجائے عربی لفظ "بَیــــنَ" کے حقیقی معانی یعنی بذریعہ (through)، بوساطت، نشان دہی، نمایاں

(show-indicate)، توضیح (explicate)، تعین (forth set) اور کسی شخص کے الفاظ کی وضاحت (articulate) کے مفہوم میں لئے جائیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ "بَیـنَ یَـدَیـہِ" کا محاورہ قرآنی حدیث کو اللہ کے ہاتھوں تصدیق شدہ حدیث قرار دینے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ ہماری طرح اللہ کے جسمانی ہاتھ تو نہیں ہیں مگر اللہ نے انسانوں کو اپنی بات سمجھانے کے لئے یہ محاورہ اسی طرح استعمال کیا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں معتبر شخص کے ہاتھوں فلاں بات کی تصدیق کی گئی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ "یَدَیهِ" کے ساتھ لگی ہوئی ضمیر " ہِ" کو کسی واحد شے کی ضمیر (its) سمجھا جائے اور "یَــدَيِ" سے مراد اللہ کی کتاب کے ہاتھ یعنی اس کی جلد اور اوراق لئے جائیں تو اس صورت میں "بَیــنَ یَــدَیـــہِ" کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ اللہ کی کتاب کی جلدوں یا اوراق میں واضح کیا گیا ہے وہ تصدیق شدہ ہے۔ لہٰذا دونوں باتوں کا حقیقی مفہوم ایک ہی نکلتا ہے۔ گویا قرآن ہمیں اس بات سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ حدیث گھڑی بھی جاتی ہے اور اسی آیت میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ صرف قرآن میں ہی ایسی قابل اعتبار حدیث ہے جو اللہ کی طرف سے تصدیق شدہ ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن سے باہر کی تمام احادیث غیر مصدقہ قرار دے دی گئیں کیونکہ اللہ نے ان کی تصدیق نہیں کی۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ " یہ لوگوں کو اللہ کے رستے سے گمراہ کرنے کے لئے بغیر سوچے سمجھے اس کی حدیث کا کاروبار کرتے ہیں اور اس کا مزاق اڑاتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے نچلے درجوں کی توہین آمیز سزا مقرر کردی گئی ہے"۔ وَمِنَ النَّـاسِ مَن یَشتَرِی لَھوَ الحَدِیثِ لِیُضِلَّ عَن سَبِیلِ اللهِ بِغَیرِ عِلمٍ وَیَتَّخِذَھَاھُزُوًا اُولٰٓئِکَ لَھُم عَذَاب مُّھِین۔(31:6)۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے سبھی علماء نے قرآن کی بالائی آیت کے تراجم و تفسیر میں بھی ایسا گھناؤنا مزاق کیا ہے جسے نہ تو کسی شخص نے پکڑا ہے اور نا ہی اسے کسی نے درست کرنے کی کوئی کوشش ہی کی ہے۔ بالائی آیت کا مفہوم بھی جان بوجھ کر اس لئے بگاڑا گیا کہ ایک تو لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ قرآن سے باہر بھی حدیث ہوتی ہے خواہ وہ بیہودہ ہی کیوں نہ ہو۔ تا کہ لوگوں کو اس بات کے لئے تیار کیا جائے کہ قرآن سے باہر اگر بیہودہ حدیث ہو سکتی ہے تو صحیح حدیث بھی قرآن سے باہر دستیاب ہوگی۔ اس آیت کے مروجہ تراجم میں بتایا گیا ہے کہ بعض لوگ بیہودہ حدیث کا دہندہ کرتے ہیں جس سے دراصل دشمنانِ اسلام کو یہ ثابت کرنا تھا کہ قرآن سے باہر بعض لوگوں کے پاس صحیح حدیث بھی موجود ہے جبکہ اس آیت میں نہ تو "بعض" کا کوئی لفظ ہے اور نہ ہی اللہ نے قرآن سے باہر کی کسی بات کو حدیث کہا ہے۔ اس آیت کے مفہوم کو بگاڑنے کا دوسرا بڑا مقصد موت کے بعد طبقاتی درجات میں انسان کی سطح سے گری ہوئی سزا کو چھپانا تھا جسے قرآن نے "عَـذَاب مُّھِیــنٌ" کہا ہے۔ اسی چالبازی سے قرآن کی دیگر آیات کا اصل مفہوم بھی غائب کیا گیا جن میں قرآن موت کے بعد ملنے والی زندگی میں دی جانے والی سزاء اور جزاء کا واضح نظریہ پیش کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان تراجم کو پڑھنے والے بھی آنکھ بند کر کے اندھوں اور بہروں کی طرح قرآن کی تفسیریں پڑھتے چلے گئے اور مکھی پہ مکھی مار کے ایک دوسرے کے تراجم نقل کرنے والے نااہل مترجمین اور علما بھی بغیر دیکھے قرآن کے تراجم نقل در نقل کرتے گئے۔ دراصل بالائی آیت (31:6) کا لفظ "لَھــو" مصدر "لھــا" سے ماخوذ ہے جس کے معانی ہیں" اس کی/اس کا/اس کے" مگر قرآن کا مفہوم تبدیل کرنے کے لئے " لَھـو" کو فارسی لہولعب سے جوڑ کر اس قرآنی لفظ کے معانی بیہودہ کھیل بنائے گئے اور پھر اس کو "الحَدِیث" سے جوڑ دیا گیا۔ جبکہ

"الحدیث" اسم خاص ہے جو صرف قرآن میں بیان کی ہوئی اللہ کی حدیث کی بات کرتا ہے اور قواعد کے لحاظ سے کسی عام کھیل تماشے والی یا بیہودہ حدیث کے لئے "الحدیث" اداۃ التعریف (The Definite Article) کے ساتھ نہیں آسکتا۔ ہمارے علماء قرآن سے اس قدر ناواقف ہیں کہ وہ قرآن کے الفاظ کی تکوین (formation) کا ابتدائی قاعدہ بھی نہیں جانتے کیونکہ اسی آیت کے اگلے حصے" وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا" میں آنے والے الفاظ "اس کا مزاق اڑاتے ہیں" اس بات کو مکمل طور پر واضح کررہے ہیں کہ اس آیت کے شروع کے حصے "لَهْوَ الْحَدِيثِ" میں اللہ کی حدیث کی بات کی گئی ہے جس کا یہ لوگ مزاق اڑاتے ہیں۔اگر ہمارے علماء نے "لَهْوَ الْحَدِيثِ" کے معانی بیہودہ حدیث نکالے ہیں تو کیا" وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا" میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ کسی بیہودہ یا لہوولعب والی حدیث کا مزاق اڑاتے ہیں؟۔ بے ہودہ باتوں پر کون نہیں ہنستا البتہ صحیح اور سنجیدہ باتوں کو ہنسی مزاق میں لینے والوں کی پکڑ ضرور ہوتی ہے جس کی سزا اسی آیت کے آخر میں اللہ نے بیان کردی ہے۔ من گھڑت اور بیہودہ حدیث تو بذاتِ خود اللہ کی حدیث کا مزاق ہے !۔ اسی طرح "عَذَابٌ مُّهِينٌ" کے الفاظ میں درحقیقت ان کے مرنے کے بعد ان کو دی جانے والی اس سزا کی بات کی گئی ہے جس میں ان لوگوں کو انسان سے پست درجے کے ذلت و رسوائی والے طبقے میں پیدا کیا جائے گا۔جیسے کوئی قابل نفرت یا حقیر جانور وغیرہ ہو کیونکہ "مُهِينٌ" insulting اور degrading تحقیر درجات کم کرنے کے معانی میں آتا ہے جو کسی کی تنزلی (demotion) پر دلیل ہے اور اگر کسی وجہ سے انسان کی ارتقائی تنزلی ہوتی ہے تو وہ یقیناً انسان نہیں بلکہ کسی اور کمتر مخلوق کی شکل میں ہی ہوگی۔جس کی مکمل تفصیل راقم الحروف کے مضمون "قرآنی نظریہ حیات" میں دی گئی ہے اور آپ کے زیر مطالعہ کتاب "احتساب اور انسان کی پیدائش نو" میں بھی اللہ کے نافرمانوں کو سزا کے طور پر انسان سے بندر بنائے جانے کے متعلق قرآنی حوالہ جات موجود ہیں۔ اللہ کی حدیث کو جھٹلانے والے انسانوں کی ارتقائی تنزلی کو قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت (68:44) میں آنے والے "سَنَسْتَدْرِجُهُم" کے الفاظ ان لوگوں پر مختلف مدارج میں ہونے والے عمل (calibration) کی بات ہی کرتے ہیں اور اس آیت کا بیان بھی اسی تناظر میں ہے کہ "فی الواقع تم اس حدیث کو جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو اب ہم انہیں ایسے بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوگی"۔ فَذَرْنِي وَمَن يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (68:44)۔"وہ (منکرین) تو اس (قرآنی) حدیث پر حیرت زدہ ہیں"۔أَفَمِنْ هَٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ (53:59)۔"درحقیقت تم اس حدیث کو ماننے میں تامل سے کام لیتے ہو"۔أَفَبِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ (56:81)۔" اور تم نے اپنی زندگی کا سروسامان ہی اسے جھٹلانے کو بنا رکھا ہے"۔وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ (56:82)۔ "بے شک یہ قرآن ہی قابل عزت ہے"۔ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ (56:77)۔" بہت شعوری گہرائیوں میں لکھا ہوا ہے"۔ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ (56:78) (مَّكْنُونٍ conscious/innermost/deepest) اور" تمام عالموں کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے"۔ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ (80:56)۔گویا اللہ تبارک تعالیٰ نے صرف قرآن کو ہی قابل عزت قرار دے کر ان لوگوں پر قرآن سے باہر کی روایات کے بارے میں وضاحت کردی ہے جو قرآن کے علاوہ یا قرآن کے ساتھ ساتھ دیگر ذرائع یعنی فقہ اور مبینہ حدیث کی روایات اور قرآن سے باہر کے عقائد کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔حقیقی اور مصدقہ حدیث کی نشاندہی کرنے کے بعد قرآنی حدیث کے علاوہ کسی اور بیان کو حدیث بھی نہیں کہا جاسکتا خواہ وہ کتنے ہی معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچا ہو اور قرآن سے باہر کی کسی روایت،عقیدے اور نظریئے کو ماننے والوں کے تابوت میں آخری کیل بھی اللہ نے یہ کہہ کر گاڑ دی is the Quran not enough? یعنی " کیا

قرآن ہی کافی نہیں ہے؟" (29:51) ۔گویا قرآن کی آیات میں اللہ کے احکام بھی بیان کئے گئے ہیں اور اسی قرآن میں حدیث بھی بیان کردی گئی ہے۔ جولوگ قرآن کی آیات میں آنے والے لفظ " حدیث " کے معانی بطور کلام، داستان اور بیان لیتے ہیں انہیں کسی مستند لغت سے فارسی زبان کے لفظ "حدیث " اور عربی زبان کی " حدیث " کے معانی دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ لوگ قرآن کی آیات اور قرآن کی حدیث کو ایک ہی مطلب میں لینے کی بجائے انہیں دو الگ الگ معانی میں عین اسی طرح لیں جیسے قرآن نے آیت اور حدیث کے لئے دو الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں جس سے حدیث کی حقیقت کھل کر سامنے آئے اور من گھڑت احادیث کا ایسا خاتمہ ہو کہ قرآنی حدیث کے علاوہ کسی اور کتاب کے بیان کو حدیث نہ کہا جائے۔ جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث اللہ کے نبی کی باتوں کو کہا جاتا ہے وہ یقیناً بالائی سطور میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انبیاء علیہ السلام کی حدیث بھی موجود ہے ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراھیم علیہ السلام کی احادیث کے ذکر والی آیات قرآن میں نہ آتیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حدیث تو وہ ہونی چاہیئے جو ہمارے نبی کریم ﷺ کے منہ مبارک سے براہِ راست نکلی ہو ، لفظ بہ لفظ اپنی اصل حالت میں ہمارے پاس موجود ہو اور جس میں فلاں نے فلاں سے سنا اور فلاں نے فلاں سے کہا والی کوئی آمیزش نہ ہو۔ ایسی محفوظ حدیث بھی صرف قرآن ہی ہے کیونکہ قرآن بے شک نبی کریم ﷺ پر اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے وحی کیا گیا تھا مگر اس کے کلمات تو یقیناً نبی کریم ﷺ کے منہ مبارک سے ہی نکلے تھے جنہیں درست حالت میں آپ ﷺ کی موجودگی میں ہی لکھ کر محفوظ کر لیا گیا تھا جس کا مجموعہ قرآن کی شکل میں آج بھی ہمارے پاس اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت بھی یہی ہے کہ اللہ نے جو کچھ اپنے رسول ﷺ کے ذریعے قرآن کی صورت میں ہم تک پہنچایا بلا شرکتِ غیرے صرف اسی کی اطاعت کی جائے۔ فقہ اور حدیث پر چلنے والوں کی حقیقت جاننے کے بعد خالص قرآنی فکر رکھنے کی دعوے دار جماعت اہلِ قرآن کے ساتھ دس برس سے زیادہ وقت گزار کے یہ معلوم ہوا کہ قرآن تو وہ بھی نہیں پڑھتے۔ بلکہ وہ بھی درحقیقت خالص قرآن کے نام پر اپنے بانیوں کی نظریاتی تفسیروں کی تبلیغ ہی کرتے ہیں اور قرآنی آیات میں آنے والے الفاظ کو خوب توڑ مروڑ کے ان سے اپنی مرضی کا مفہوم نکالتے ہیں جس کا نہ تو جدید علوم اور کائناتی حقائق سے کوئی تعلق بنتا ہے اور نا ہی قرآن کے متن میں آنے والے الفاظ اور قرآنی بیان کے تسلسل سے اس کا کوئی واسطہ ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ محسوس ہونے لگا کہ اہلِ قرآن کے درس میں قرآنی آیات کی تفسیر جس انداز سے بیان کی جاتی ہے اس کا عملی طور پر کہیں بھی اطلاق نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ اصل قرآنی تعلیمات سے انحراف اور قرآن کی آڑ میں اپنی تحریک کے نظریات کا بھرپور پرچار ہے۔ یہ جان کر دلی صدمہ ہوا کہ اگر 'خالص قرآنی تعلیمات' کے ابلاغ کے نام پر قرآن کی اصل تعلیم کو ہی چھپایا جا رہا ہے تو پھر قرآن کی حقیقی تعلیمات کیسے اجاگر ہوں گی؟۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہر کوئی قرآن کے نام پر اپنا اپنا راگ الاپ رہا ہے مگر قرآن کے متن میں آنے والے الفاظ پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔ نہ کوئی حقیقت سننے کو تیار ہے اور نہ ہی سمجھنے کو بلکہ اگر حقیقت بیان کی جائے تو لوگ جھگڑنے اور مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ۲۰۱۳ء کی پہلی سہ ماہی میں والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد راقم الحروف نے مغربی لندن میں 'محمودہ بیگم ویلفیر ٹرسٹ' قائم کیا جس کا بنیادی مقصد اصل قرآنی تعلیمات کا اَحیاء اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'احتساب اور پیدائش نو' بھی اَحیائے قرآن کے اسی سلسلے کی ایک اہم

کڑی ہے ۔اس کتاب کا مسودہ پہلے انگریزی میں تیار کیا گیا تھا جس کے گہرے مطالعے کے بعد قرآنی فکر کے حقیقی علم بردار جناب حسین امیر فرہاد صاحب مدیر ماہنامہ صوت الحق نے اس کتاب کو اردو میں تحریر کرنے کی پرزور خواہش کا اظہار کیا تا کہ قرآن میں بیان کی ہوئی آخرت کا حقیقی تصور منظر عام پر لایا جائے جو بحیثیت مسلمان ہمارے ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ موصوف خود بھی اس موضوع پر تحقیق کر کے پینتیس صفحات پر مشتمل "حیات بعد الممات" کے نام سے قرآنی حوالوں کے ساتھ ایک سیر حاصل مضمون تحریر کر چکے ہیں جو راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔دراصل قرآنی تعلیمات کا نچوڑ ہی آخرت کی تربیت اور تیاری ہے جس پر عین قرآن کی رو سے ایمان لائے بغیر ہمارا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر کاشف خان

quranguide@hotmail.com

احتساب اور انسان کی پیدائشِ نو

آخرت پر ایمان ۔ایک تحقیقی مقالہ

باپ دادا نے جو اپنے بڑوں سے سیکھا وہ نہایت ایمان داری سے ہم تک منتقل کر دیا۔ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ابا جان انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ مسجد لے جانے لگے۔مولوی صاحب نے بھی جو کچھ اپنے اساتذہ کرام سے سیکھا تھا اس سے ہمیں فیض یاب کرنے میں کوئی کسر روا نہیں رکھی بلکہ تحفے میں مشکوۃ شریف ایسی کتابیں بھی پڑھنے کو دے دیں۔پھر چند احباب ایسے بھی ملے جنہیں مولوی صاحب کے خیالات اور ان کی تعلیمات پر یہ اختلافات تھے کہ وہ صرف اپنے فقہی مسلک کے حوالے سے بات کرتے ہیں جبکہ مستند احادیث میں نماز کا طریقہ بھی ان سے الگ ہے اور مسائل کا بیان بھی۔وقت کے نامور محدثین کی صحبت نصیب ہوئی اور صحاح ستہ میں سے بخاری کا تحفہ اسی کی قسم کھا کر دیا گیا کہ یہ وحی خفی کی سب سے سچی کتاب ہے جو متفقہ طور پر قرآن کے بعد اول درجے پر آتی ہے۔شرک سے بچنے اور نماز میں پابندگی کے ساتھ ساتھ رفع یدین اور آمین بالجہر کی بھی زبردست تلقین کی گئی۔اب ایمان مکمل ہو گیا اور زندگی اس تصور کے ساتھ رواں دواں ہو گئی کہ ہم ان خوش قسمت امتیوں میں سے ہیں جو خالصتاً نبی کریم ﷺ کی سنت مبارکہ پر عمل کر رہے ہیں۔دوسرے لوگ ایمان میں گھٹیا دکھائی دینے لگے کیونکہ وہ ہم میں

سے نہیں تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی کی تقلید کرتے تھے جبکہ ہم کسی کے مقلد نہیں تھے۔ بڑھ چڑھ کر نیک کام کرنے لگے۔ حج اور عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوگئی جس سے ایمان مزید پختہ ہوگیا۔ پھر بالآخر ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو صرف اور خالص قرآنی تعلیمات پر چلنے کے دعوے دار تھے۔ ان کے یہاں وہی صحاح ستہ والی احادیث قرآنی تعلیم کے دائرے سے باہر کی روایات مانی جاتی تھیں۔ جن کی دین میں حیثیت متضاد اختراعات سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ پچھلا ایمان جاتا رہا اور ایک بار پھر یقین ہونے لگا کہ اتنے دھکے مکے کھا کے آخر کار ہم صراطِ مستقیم کی راہ پر گامزن ہوگئے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ بار شکر ادا کیا کہ تو نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔

یہ کسی فردِ واحد کی کہانی نہیں بلکہ ہر اس شخص کی آپ بیتی ہے جو راہِ حق کی تلاش میں گرتے پڑتے یہاں تک پہنچا۔ جہاں سے آگے وہ سیدھا جنت میں جھانکتا ہے کیونکہ یہ گمان غالب ہونے لگتا ہے کہ ہم بالکل سیدھے راستے پر ہیں، صراطِ مستقیم بھی ہمیں مل گیا اور ہم ہدایت یافتہ بھی ہوگئے۔ عقل و شعور میں اپنے آپ کو باقی لوگوں سے افضل بھی سمجھنے لگے۔ اِدھر اُدھر کی دو چار کتابیں پڑھ کے قرآن کا علم اس قدر بڑھ گیا کہ دوسرے لوگ اپنے مقابلے میں حقیر دکھائی دینے لگے۔ کیونکہ وہ قرآن کے الفاظ کا تجزیہ اور قرآنی آیات کی تشریح اس دانشورانہ انداز میں کر نے کے قابل نہیں تھے جو ہمارے دماغ میں حرفِ آخر تھی۔ قرآنی آیات پر غور و فکر کے دعوے کے ساتھ قرآن تو کھولنے لگے مگر اسے قرآن کی حقیقی رو سے پڑھنے کی بجائے تحریک کے بانیوں اور ہم خیال مولویوں کے نظریات کی روشنی میں ہی پڑھا۔ ان خیالات میں پختگی کی انتہا یہ کہ کسی منطق اور کسی علمی دلیل نے ہمیں اپنے نظریات سے کبھی ٹس سے مس نہیں ہونے دیا۔ در حقیقت نہ تو ہمارا علم بڑھا اور نہ ہی عقل البتہ فرق صرف اتنا پڑا کہ ہم نے ہزار سالہ قدیم روایات کو چھوڑ کر صد سالہ جدید روایات کو اپنا لیا اور جہاں سے چلے تھے گھوم پھر کے وہیں پہنچ گئے مگر قرآن پھر بھی سمجھ نہ آیا!

قارئینِ کرام اور اپنے عزیز دوستوں سے اس بے لاگ تبصرے پر معذرت خواہ ہونے کے ساتھ ساتھ معافی کا طلبگار بھی ہوں۔ مگر قرآنی تعلیمات کے انحطاط اور جمود کی وجوہات کا تجزیہ کرنا بھی ضروری تھا تاکہ ذاتی خیالات اور انسانی نظریات کو بالائے طاق رکھ کر صرف اور خالص قرآنی تعلیمات کو اجاگر کیا جائے۔ یہ غلط فہمی بھی دور کرنا ضروری ہے کہ قرآنی تعلیم کا جمود صرف ہمارے زیرِ نظر آخرت کے مضمون میں ہی نہیں دکھائی دیتا بلکہ ہر مقام پر کم و بیش یہی صورتِ حال پائی جاتی ہے جس میں قرآن مجھول کا مجھول ہی دکھائی دیتا ہے۔

آخرت (Hereafter) سادہ الفاظ میں ''انسان کا مستقبل'' ہے۔ جس کو سنوار نے اور تابناک بنانے کا عمل عین مشیتِ الٰہی ہے۔ اس پر ایمان لانے کا حکم اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایات دراصل ہمارے بہتر مستقبل کی ضمانت ہیں۔ والدین کی جبلت میں بھی اللہ تعالیٰ کی اسی خصوصیت کا عکس پایا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے خواہاں ہوتے ہیں اور اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح ان کے بچوں کا مستقبل بن جائے۔ انہیں لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں، کتابیں لاکر دیتے ہیں اور ان کے لئے اچھے سے اچھے معلم کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ انہیں گاہے بگاہے یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ مثبت راہِ عمل ہی ان کے بہتر مستقبل کی ضامن ہے اور یہی ان کی اصل منزلِ مقصود بھی ہے۔ بعینہ اللہ تعالیٰ نے بھی انسان کی تعلیم کے لئے کتابیں نازل فرمائیں اور انبیا علیہ السلام کو انسان کا معلم بنا کر بھیجا مگر انسان نے اللہ کی وحی کا مزاق اڑایا اور اس میں دخل اندازی کی جس کے نتیجے میں وہ راستے سے بھٹک گیا۔

ہمارا مضمون پیدائشِ نو (Rebirth or Reincarnation) بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جو قرآن میں تو موجود ہے مگر امتِ مسلمہ نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔ جس کی وجہ فارس سے درآمد شدہ بابلی تہذیب کے قدیم زرتشی نظریات (Zoroastrianism) اور یہود و نصاریٰ کی وہ سازشی اختراعات ہیں جنھوں نے اسلام کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ اہلِ کتاب حیات بعد الممات پر یقین نہیں رکھتے اور اللہ کی طرف سے نازل کردہ دیگر کتابوں یعنی انجیل، توریت اور زبور وغیرہ میں بھی پیدائشِ نو (Reincarnation) کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے اس لئے ہم مسلمان بھی دوبارہ پیدائش کو نہیں مانتے اور قرآن کے تراجم و تفسیر بھی اسی نظر سے کرتے ہیں۔ بہت خوب! قرآن کو نہ سمجھنے کا اچھا بہانہ ہے۔ دراصل ہم نے کبھی عقل اور غور و فکر کو اپنے قریب پھٹکنے کی دعوت ہی نہیں دی۔ بہت سے بہت یہ کیا کہ روایتی غلام گردشوں میں بھٹکتے ہوئے

دو چار کتابیں لکھیں، مکھی پہ مکھی ماری اور علامہ و مولانا کی ٹوپی پہن کر اندھی اور بہری بھیڑوں کو ہانکنے لگے۔

جس طرح ایک ڈاکٹر کسی مرض کی گہرائی تک جا کے اس کی تشخیص کرتا ہے اور ایک انجینئر تحقیق کرتے کرتے کسی نقص کو اس کی جڑوں سے نکال کے لے آتا ہے بعینہ سائنسی اصولوں کا اطلاق کر کے تحقیق کرتے ہوئے جب اہلِ کتاب کی بنیادوں کو کھنگالا گیا تو انہوں نے بھی ''پیدائشِ نو'' (Reincarnation) کے اسی قانونِ قدرت کی گواہی دے دی جو قرآن بار بار واضح کرتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کی رہنمائی کے لئے مختلف ادوار میں بہت سے احکامات اور صحیفے نازل ہوتے رہے ہیں جن کی مکمل تعداد اور نام انسان کی موجودہ علمی دسترس سے باہر ہیں مگر ان صحیفوں کے نزول کے ثبوت ضرور دستیاب ہیں جو گمشدہ صحیفوں کی تلاش میں تحقیق کی نئی راہیں کھولنے کے لئے کافی ہیں۔ قرآن سے پہلے نازل ہونے والے کچھ صحیفے اور کتابیں جو ہمارے پاس اب تک موجود ہیں ان سب کو اکٹھا کر کے ان کے دو مجموعے بنائے گئے ہیں۔ پہلا مجموعہ عہد نامہ قدیم (Old Testament) کہلاتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بارہ صدیوں کے عرصے پر محیط ہے جس کا تسلسل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آنے والی وحی کے دوسرے مجموعے عہد نامہ جدید (New Testament) تک چلتا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کے مجموعے کو قرآن کا نام دیا گیا جو اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی تصدیق کرنے کے ساتھ ساتھ تمام بنی نوع انسان کی رہنمائی، فلاح اور نجات کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔



دائیں سے پہلی تصویر پتھر پر کھدی ہوئی لکھائی، دوسری تصویر قدیم سومری زبان کی لکھائی اور تیسری تصویر قدیم پیپرس کے کاغذ پر ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر ہے جو ہاورڈ یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

قدیم آسمانی صحیفے ابتدا میں بھیڑ کی کھال اور پتھروں پر کھدائی کر کے لکھے جاتے تھے۔اس کے علاوہ لوگ انہیں حفظ کر کے انسانی یادداشت میں بھی محفوظ کر لیتے تھے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے چار ہزار سال قبل(fourth millennium BCE) جب قدیم مصر میں پانی کے پو دے پیپرس کے گودے سے بنائے گئے پیپرس کے اوراق(papyrus sheets) کی ایجاد ہوئی تو یہ صحیفے اور ان کے بعد آنے والی آسمانی کتابیں باقاعدہ پیپرس کے اوراق پر لکھ کر محفوظ کی جانے لگیں۔نزول قرآن کے وقت تک لکھائی کے لئے اوراق بنانے کی صنعت اتنی ترقی کر چکی تھی کہ چین کا تیار کردہ کاغذ عرب کے تجارتی ذرائع سے نا صرف بجیرہ عرب بلکہ یونان اور روم تک جاتا تھا۔جس سے بات بھی مکمل طور پر ثابت ہوتی ہے کہ نزول قرآن کے وقت یا اس کے بعد قرآنی آیات کو جانوروں کی کھال، پتھر، درختوں کی چھال اور ہڈیوں کے ٹکڑوں پر لکھ کر محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر قبل مسیح میں لکھی ہوئیں پانچویں خانوادے(Fifth Dynasty) کے باد شاہ نفرتیتی الکا کائی(Nrfertiti Kakai) کے کھاتوں (accounts) کی مجلد کتابیں آثارِ قدیمہ کے عجائبات میں آج بھی محفوظ ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ قرآن بھی اپنے ابتدائی دور سے ہی مکمل کتابی شکل میں موجود نہ ہو۔



1500 سال قبل زمانہ نزول قرآن سے پہلے ہاتھ سے لکھی ہوئی بائبل کی یہ مکمل کتاب

ترکی کے دارالحکومت انقرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

دوسری صدی قبل مسیح میں یہودیوں نے حضرت موسی علیہ السلام تک نازل ہونے والے عہد نامہ قدیم کے سب صحیفوں اور کتابوں کو اکٹھا کر کے اس مجموعے کو مقدس بائبل (Holly Bible) یعنی کتاب المقدس کا نام دیا۔ چونکہ عہد نامہ قدیم کے عنوان ہائے عہد و تکمیل عہد نامہ جدید میں بھی بعینہ جاری رہے اس لئے بعد میں ان دونوں عہد ناموں کو ملا کر ان کا موجودہ نام بھی بائبل ہی رکھا گیا۔جس کو یہودی اور عیسائی دونوں ہی خدا کے مقدس الفاظ مانتے ہیں مگر نظریات میں اختلاف ہونے کی وجہ سے یہودی بائبل کے اپنے حصے کا ترجمہ اور تفسیر الگ کرتے ہیں اور عیسائی الگ۔ دنیا کی تہذیب وتمدن میں ترقی اور تبدیلی کے پیش نظر عہد نامہ قدیم کی کتابیں عبرانی (Hebrew) اور ارامی(Aramaic) زبانوں میں نازل ہوئیں اور عہد نامہ جدید کی کچھ کتابیں ارامی اور زیادہ تر یونانی(Greek) زبان میں آئیں۔

حضرت موسی علیہ السلام کی پرورش اور تربیت شاہی گھرانے میں ہونے کی وجہ سے انہیں عبرانی (Hebrew) اور ارامی زبانیں بولنے اور لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل تھی۔ارامی (Aramaic) زبان انھوں نے اپنی والدہ سے سیکھی جو ان کی دائی بن کر ان کے ساتھ ہی فرعون کے شاہی محل میں رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ موسی علیہ السلام کو قدیم سومری (Sumerian) زبان میں بھی خصوصی ملکہ حاصل تھا جو لکھنے میں ریاضی یا آج کے کمپیوٹر کوڈ سے ملتی جلتی زبان ہے۔اس میں ۱۰۰۰، ۲ اور ۵۰ کے مضاعف(multiple) کو خاص ترتیب میں لکھ کر حروف کی بجائے ہندسوں میں عبارت مکمل کی جاتی ہے۔ان سبھی زبانوں کی مثالیں عہد نامہ قدیم کے اصل متن میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ چونکہ موسی علیہ السلام سے پہلے اور ان کے زمانے میں مندرجہ بالا زبانیں رائج تھیں اس لئے متن کے اعتبار سے عہد نامہ قدیم یعنی یہودیوں کی بائبل جسے تنخ بھی کہا جاتا ہے عبرانی اور ارامی زبانوں میں ہے جو ابتداء میں ۲۴ کتابوں اور تین حصوں پر مشتمل تھی جس میں پہلی پانچ کتابیں ابتدا، خروج، احبار، گنتی یا اعداد اور استثنا تورات(Torah) کی ہیں۔ پھر انبیا میں ایوب، یشوع، سیموئیل، یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیال، ہوسیع، حبقوق، زکریا، ملاخی، دانیال، نحمیاہ، عزیر، قضات اور اس کے بعد اسفار الکتابات میں زبور (Psalms) یعنی

حمد، ضرب الامثال، غزل یا نغمہِ سلیمان، روتھ، (Ruth) یعنی رحمۃ اور واعظ شامل ہیں۔ عہد نامہ جدید کے نزول کے بعد عہد نامہ قدیم میں عبرانی زبان کی کتابیں جویل، عاموس، عبدیاہ، یونس، البعثہ، حجی، صفنیاہ اور ناحوم بھی شامل کر لی گئیں۔

عہد نامہ جدید (New Testament) کا اصل مسودہ کچھ عبرانی اور ارامی مگر زیادہ تر یونانی (Greek) زبان میں ہے جس کے تین حصوں میں ۲۷ کتابیں شامل ہیں۔ پہلے حصے میں چار وہیت اناجیل یعنی متی، علامت (Mark)، لوقا اور یوحنا کے ساتھ انبیاء کے اعمال یا قوانین (Acts) کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں خطوط (Epistles) اور کتاب الوحی (Revelation) شامل ہے۔ چھٹی اور ساتویں صدی تک عیسائیوں کے عہد نامہ جدید کی کتابوں کی فہرست میں سینٹ برنابا کی انجیل (Gospel of Barnabas) بھی شامل تھی جو بعد میں مسلمانوں کی سازش سمجھ کر عہد نامہ جدید کی کتابوں کی فہرست سے نکال دی گئی۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہونہار شاگرد سینٹ برنابا کی وہ انجیل تھی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت محمد ﷺ کے نام ''احمد ﷺ'' کے ساتھ یہ حوالۂ جات تھے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبی ہوں گے۔ یہ حوالہ جات انجیل سے خارج نہیں کئے گئے بلکہ موجودہ چاروں اناجیل میں موجود ان آیات کے تراجم سے نبی کریم ﷺ کا نام ''احمد'' نکال کر اس کی جگہ ان کے نام کے معانی لکھ دیئے گئے ہیں مگر چونکہ عربی میں سب سے پہلا ترجمہ سینٹ برنابا کی انجیل سے کیا گیا تھا اس لئے انجیل کے عربی تراجم کی مذکورہ آیات میں ''احمد'' ہی لکھا ہوا ہے جو مطالعہ کے لئے اب بھی موجود ہے۔

یہود و نصاری نے ان کتابوں کے تراجم اصل متن کے سیاق وسباق سے ہٹ کر اپنے ذاتی خیالات اور نظریاتی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کئے ہیں جو بہت سی جگہوں پر اصل وحی کی آیات کے متن سے مطابقت نہیں رکھتے۔ جس کی وجہ سے عیسائی اور یہودی نظریاتی طور پر مسلمانوں سے دور ہونے کے ساتھ ساتھ آپس میں بھی بہت سے فرقوں اور عقائد میں بٹے ہوئے ہیں۔ تاہم موجودہ دور کے تعلیم یافتہ، وسیع النظر اور غیر جانب دار یہودی اور عیسائی یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ان کی کتابوں کے تراجم غلط ہیں جو یقیناً مثبت تبدیلی کے رجحان کا عندیہ ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں ان کتابوں کا علمی مطالعہ اور غور وخوض کے ساتھ تجزیہ کرنا اشد ضروری ہے تاکہ تراجم میں پایا جانے والا سقم اور غلطیوں کی نشاندہی کر کے انہیں وحی کے اصل متن کے مطابق درست کیا جا سکے مگر کلیسا (Church) اور یہودیوں کی عبادت گاہیں (Synagogue) ابھی اس بارے میں خا موش ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ وقت کبھی بھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب کلیسا نے سینٹ جیروم کے چوتھی صدی عیسوی میں عبرانی اور یونانی سے کئے گئے بائبل کے لاطینی زبان میں ترجمے کے علاوہ کسی اور زبان میں ترجمہ کرنے پر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھی اور سولہویں صدی عیسوی تک عام آدمی کے لئے مذکورہ لاطینی ترجمہ بھی کلیسا سے پیشگی اجازت لئے بغیر پڑھنا منع تھا۔ اگر وہ وقت نہیں رہا تو یہ وقت بھی نہیں رہے گا اور اصلی متن کے لحاظ سے ترجمہ کرنے میں حائل رکاوٹیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ انفرادی طور پر لوگ ان کتابوں کے اصل متن سے ترجمہ اب بھی کرتے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اس ترجمے کو کلیسا تسلیم نہیں کرتا۔

تورات (Torah) یعنی عہدِ عتیق کے پانچ صحیفے (Pentateuch) جو بارہویں اور تیرہویں صدی قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور حیات میں موجود تھے ان میں موت کے بعد ملنے والی زندگی جس جگہ پر ہوگی اس کو ''شیول'' (Sheol) یعنی زمین کہا گیا ہے۔ جس میں نیک و بد اپنے اعمال کے لحاظ سے مقیم ہوں گے۔ بہت سی جگہوں پر ''شیول'' (Sheol) کا ترجمہ بطور ''پاتال'' (**عالم تحت الارض**) بھی کیا گیا ہے جو تورات کے حقیقی متن کے لحاظ سے درست نہیں بلکہ ''شیول'' (Sheol) عہد نامہ قدیم کی کچھ آیات میں زمین یعنی دنیا اور کچھ میں زمین پر جہنم کے استعارے میں استعمال ہوا ہے۔

مندرجہ ذیل حوالہ جات ملاحظہ فرمائیے:

"Sheol from beneath is excited over you to meet you when you come; It arouses for you the spirits of the dead, all the leaders of the earth; It raises all the kings of the nations from their thrones(Isaiah 14:9)

پاتال (زمین) اندر سے بے تاب رہتی ہے تم سے ملنے کو جب تم آتے ہو، اسی سے تمہارے لئے مردے کی زندگیاں پیدا کی جاتی ہیں، اسی سے زمین کے تمام رہنماؤں، سب قوموں کے بادشاہوں کو ان کی جگہوں سے زندہ کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ (**یسعیاہ ۱۴:۹**)

ground opens its mouth and swallows them up with all that is theirs, and they descend alive into Sheol, then you will understand that these men have spurned the LORD."(Numbers 16:30)

لیکن اگر خداوند ان کے خلاف کوئی بالکل نئی چیز لے آئے اور زمین کا منہ کھلے اور وہ ان کو بمع ان کے مال و اسباب نگل لے اور وہ پھر زندہ کر کے پاتال (جہنم) میں اتارے جائیں، پھر تمہیں سمجھ آئے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کو ٹھکرایا۔ (گنتی:۱۶:۳۰)

Bring about کا مطلب کسی سمت کے برخلاف ہوتا ہے جس کا استعمال عام طور پر ایسے کیا جاتا ہے طوفان آتا دیکھا تو وہ اپنی ناؤ لے آئے۔" انگریزی کے جملوں میں بھی اس کے استعمال کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

cause to move into the opposite direction;

"They brought about the boat when they saw a storm approaching"

To bring back his soul from the pit, That he may be enlightened with the light of life. (Job 33:30)

اس کی روح کو پستی سے واپس لانے کے لئے وہ زندگی کے نور سے روشن کیا جاتا ہے۔ (ایوب:۳۰:۳۳)

یعنی بڑے سے بڑے گناہ گاروں اور بداعمال لوگوں کو بھی ان کے اعمال کے مطابق پست سے پست طبقے میں دوبارہ زندگی دے دی جاتی ہے تا کہ وہ کوشش کر کے اپنے اعمال درست کریں اور اوپر والے طبقے میں پہنچ جائیں۔

"Behold, God does all these oftentimes with men. (Job 33:29)

"دیکھو، خدا سب لوگوں کے ساتھ اکثر یہی کرتا ہے۔" (ایوب:۲۹:۳۳)

But God will redeem my soul from the power of Sheol, For He will receive me. Selah (Psalms 49:15)

لیکن خدا پاتال (جہنم) سے میری جان چھڑا دے گا، وہ (خدا) قبول کر کے مجھے۔ سلاہ (زبور:۴۹:۱۵)

قارئین کرام غور فرمایئے زبور کے مندرجہ بالا حوالے: میں ایک لفظ "سلاہ" (Selah) آیا

He keeps back his soul from the pit, And his life from passing over into Sheol.(Job 33:18)

وہ بچاتا ہے اس کی روح کو پستی میں جانے سے، اور اس کی زندگی کو پاتال (جہنم) میں جانے سے۔ (ایوب:۱۸:۳۳)

Whatever your hand finds to do, do it with all your might; for there is no activity or planning or knowledge or wisdom in Sheol where you are going?

(Ecclesiastes 9:10)

جو کچھ بھی تمہارے ہاتھوں کو کرنے کو ملتا ہے وہ تم اپنے تئیں کر لیتے ہو، کوئی ٹھوس منصوبہ بندی یا علم یا عقل کا استعمال پاتال (دنیا) میں نہیں کرتے، تم کہاں چلے جا رہے ہو؟ (واعظ۔۹:۱۰)

Activity اردو میں "روبہ عمل" ہونے کو کہا جاتا ہے جبکہ انگریزی میں اس کی تعریف ذیل کے الفاظ میں کی جاتی ہے۔

1-The condition in which things are happening or being done.

2-A thing that a person or group does or has done.

The wicked will return to Sheol, Even all the nations who forget God. (Psalms 9:17)

غلط کار لوگ پاتال (جہنم) میں واپس بھیج دیئے جائیں گے اور دیگر تمام قومیں بھی جنہوں نے خدا کو بھلا دیا ہے۔ (زبور۔۹:۱۷)

Let death come deceitfully upon them; Let them go down alive to Sheol, For evil is in their dwelling, in their midst. (Psalms 55:15)

موت ان پر دھوکہ دے کر (بغیر بتائے) آتی ہے؛ پھر انہیں زندہ کر کے پاتال (دوزخ) میں بھیج دیا جاتا ہے، شیطان صفت لوگوں کے لئے یہی ٹھکانا ہے، جو اسی کے اندر رہتے ہیں۔ (زبور۔۵۵:۱۵)

Midst وسط، دل اور قلب کے معانی میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا رواں ترجمہ "ان کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے جو ان کے دلوں میں لگتی ہے" قرآنی اعتبار سے بھی درست معلوم ہوتا ہے۔

"But if the LORD brings about an entirely new thing and the

ہے جو عبرانی زبان کے اصل متن میں ایسے ''לָה, '' لکھا ہوا ہے۔ دورانِ تحقیق یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے بڑے بڑے علما اس کا مطلب نہیں جانتے اور دورانِ تلاوت اس کے تلفظ سلاہ (Selah) کو ہی زبان سے ادا کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ''سلاہ'' قدیم آسمانی صحیفوں کے علاوہ ۷۴ بار عبرانی بائبل (Hebrew Bible) ۷۱ بار عبرانی زبور (Hebrew Psalms) اور کئی بار حبقوق (Habakkuk) میں آیا ہے ''وکی پیڈیا'' (Wikipedia) کے الفاظ میں (Selah is difficult concept totranslate) سلاہ کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ علماءِ اہلِ کتاب کی رائے میں ''سلاہ'' بطورِ اوقاف (punctuation) ان آیات میں استعمال ہوتا ہے جہاں قاری کو پڑھنے کے دوران ٹھہراؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ لوگ ''سلاہ'' کو صوتی لحاظ سے اس سے ملتا جلتا لفظ ''سلَع'' سمجھتے ہیں جو عبرانی زبان میں ''پتھر کی چٹان'' (rock) کے لئے استعمال ہوتا ہے اور عبرانی لکھائی میں اس کے ہجے بھی سلاہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اہلِ کتاب کے کچھ دانشوروں کے خیال میں ''سلاہ'' موسیقی کی سمت یا سنگیت کی وہ ہدایات (Musical Instructions) ہیں جو زبور (Psalms) کو پڑھتے وقت ملحوظِ خاطر رکھی جانی چاہئیں۔ کیونکہ زبور کو موسیقی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

اللہ اللہ! رنگ رنگ کے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں۔ علمائے اہلِ کتاب کا حال بھی ہمارے علمائے کرام جیسا ہی ہے۔ جو من میں سمایا وہ ہی بول دیا۔ نہ سوچا نہ سمجھا بنا تحقیق کئے اختراعات لکھ لکھ کے کتابوں کے انبار لگا دیئے۔ زیرِنظر مضمون پیدائشِ نو کی تحقیق کے دوران یہ گتھی بھی کھل گئی کہ تورات، زبور، انجیل اور دیگر آسمانی صحیفوں میں لکھا ہوا ''پراثرار'' لفظ ''سلاہ'' در اصل وہی صلاہ ہے جس کا حکم قرآن میں تواتر کے ساتھ آیا ہے۔

قارئینِ کرام ملاحظہ فرمائیے۔ اگر زبور کی آیت کے آخری لفظ ''سلاہ'' کو قرآنی لفظ ''صلاہ'' سے بدل دیا جائے تو اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

But God will redeem my soul from the power of Sheol, For He will receive me. Selah (Psalms 49:15)

لیکن خدا پاتال (جہنم) سے میری جان چھڑا دے گا، وہ (خدا) قبول کر کے مجھے سلاہ (زبور: ۴۹:۱۵) موجودہ ترجمہ

زبور کی اسی آیت کے رواں تراجم ملاحظہ فرمائیے:

لیکن خدا میری صلاہ قبول کر کے جہنم سے میری جان چھڑا دے گا۔

لیکن خدا میری پتھر کی چٹان قبول کر کے جہنم سے میری جان چھڑا دے گا۔

لیکن خدا تلاوتِ کلام میں میرا وقف قبول کر کے جہنم سے میری جان چھڑا دے گا۔

لیکن خدا میری موسیقی قبول کر کے جہنم سے میری جان چھڑا دے گا۔

قارئینِ کرام مندرجہ بالا تراجم میں سے کونسا ترجمہ صحیح ہے اس کا فیصلہ تو آپ خود کریں گے۔ ہمارا کام تو صرف اپنی تحقیق کا نتیجہ آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔

عہد نامہ قدیم (Old Testament) میں انتہائی تحقیق کے بعد اعادۃ التدویر (Recycling) کا قدرتی نظام معلوم ہوا۔ ان آیات کے شروع میں ہی لوگوں کے نسل درنسل لوٹ کر واپس آنے کا ذکر وحی کے اسی مخصوص انداز میں ہے جو قرآن میں پایا جاتا ہے۔ سورج کا طلوع ہونا، غروب ہونا اور الٹے پیروں واپس لوٹ کے پھر وہیں آ جانا جہاں سے وہ نکلا تھا۔ ہوا کا گھوم پھر کے وہیں پہنچ جانا جہاں سے وہ شروع ہوئی تھی۔ ندی نالوں کا گھوم پھر کے واپس وہیں پہنچ جانا جہاں سے وہ شروع ہوئے تھے۔ جو پہلے ہو چکا وہ دوبارہ ہونے کی تکرار کی مماثلت انسان کی دوبارہ پیدائش (Reincarnation) سے نہیں تو اور کیا ہے؟ خاص طور پر آخری جملہ بہت اہمیت کا حامل ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ سورج کے نیچے جو کچھ بھی ہے اس میں کچھ بھی نیا نہیں! سورج کے نیچے کیا ہے؟ سورج کے نیچے تو وہی دنیا ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ اگر اس دنیا میں کچھ بھی نیا نہیں اور سب کچھ ری سائیکل (Recycle) ہو کے وہی بار بار آ رہا ہے تو اس لحاظ سے انسان کے ارتقاء کی تاریخ بھی نئے سرے سے رقم ہوگی۔ تحقیق کے کئی نئے باب کھل جائیں گے۔ قدرت کے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھے گا۔ زمین، آسمان اور انسان کی تخلیق کے وہ عوامل جو ابھی تک انسان کی نظر سے باہر ہیں سامنے آ جائیں گے۔ سائنسی علوم میں بھی ترقی ہوگی اور بہت سی ایسی گتھیاں کھل جائیں گی جنہیں جاننے کے لئے انسان اب بھی اپنا ماتھا پیٹ رہا ہے۔

قارئینِ کرام اس بیش قیمت وحی کی تفصیل واعظ کی مندرجہ ذیل آیات (۴،۱،۹) میں حاضرِ خدمت ہے:

"Generations come and generations go, but the earth remains forever. The sun rises and the sun sets, and hurries back to where it rises. The wind blows to the south and turns to the north; round and round it goes, ever returning on its course. All streams flow into the sea, yet the sea is never full. To the place the streams come from, there they return again...What has been will be again, what has been done will be done again; there is nothing new under the sun." (Ecclesiastes 1:4-9)

لوگوں کی نسلیں آتی ہیں اور نسلیں چلی جاتی ہیں مگر دنیا ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔سورج طلوع ہوتا ہے اور سورج غروب ہو جاتا ہے، اور جہاں سے نکلتا ہے تیزی سے وہیں واپس آ جاتا ہے۔ہوا جنوب کی سمت میں چلتے چلتے شمال کی جانب مڑ جاتی ہے۔یہ گھومتی پھرتی ہے اور گھوم گھوم کر چلتی ہے اور ہمیشہ اپنے رستے پر واپس لوٹتی ہے۔سب ندی نالوں کا بہاؤ سمندر میں ہوتا ہے لیکن سمندر کبھی نہیں بھرتا۔جس جگہ سے یہ ندی نالے نکلتے ہیں دوبارہ وہیں پر واپس چلے جاتے ہیں۔جو کچھ ہو چکا وہ پھر سے ہوگا، جو کچھ کیا گیا وہ پھر سے کیا جائے گا۔سورج تلے (دنیا میں) کچھ بھی نیا نہیں ہے۔(واعظ ۱:۴،۹)

اللہ اللہ۔قدیم آسمانی صحائف میں نازل کی گئی وحی کی تحقیق کے دوران شانِ الٰہی اور اس کے عظیم الشان کارخانہ قدرت کو دیکھ کر کئی بار ایسا وجد تاری ہوا جو احاطہ بیان سے قطعی باہر ہے۔اللہ کی کاریگری جوں جوں عیاں ہوتی رہی آنکھوں سے نیند اڑتی گئی اور شب و روز کی ایک ایک ساعت ورطہ حیرت میں گزری۔روح کی بےقراری بڑھتی گئی اور بار بار جی میں آیا کہ سب کام چھوڑ کے کلام الٰہی کے حقیقی متن کا ترجمہ ابتدائی صحیفوں سے شروع کر کے قرآن تک کرتا چلا جاؤں اور ان تمام غلط فہمیوں اور تضادات کو مٹادوں جو وحی الاول سے لے کر وحی الآخر تک انسان نے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے اللہ کے سر تھوپ رکھے ہیں۔انجیل، تورات، زبور اور دیگر آسمانی صحیفوں کے من گھڑت تراجم اور لامعنی اختراعات کی بھرمار کے باوجود وحی کا اصل متن بڑی حد تک اپنی اصل حالت میں موجود ہے اور اس پر وقت کی شکست و ریخت کا اتنا اثر نہیں ہوا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔اگر کہیں فرق آ بھی رہا ہے تو قرآن کی کسوٹی اس فرق کو دور کرنے کے لئے ہمارے پاس موجود ہے۔مگر افسوس کہ ہم نے کلام اللہ کے اس انمول ذخیرے کو یہودیوں، عیسائیوں، مشرکوں، کافروں اور بت پرستوں کی کتابیں سمجھ کر چھوڑ دیا۔اگر ان کتابوں کی منسوخی کا حکم بھی قرآن میں نہیں آیا اور اللہ کے قوانین بھی تبدیل نہیں ہوتے تو پھر انہیں رد کیوں کر دیا گیا؟ جواب آپ کے پاس محفوظ ہے کہ کن لوگوں کے کہنے پر ایسا کیا گیا؟

اللہ کی اس وحی کا انکار کرنے والوں کے لئے لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتابوں پر ایمان کا کیا ہوگا؟ تورات، زبور، انجیل اور دیگر آسمانی صحیفوں کا خالی نام ہی زبان سے ادا کر لینا تو ان پر ایمان لانے کے زمرے میں نہیں آتا۔لہٰذا قرآن کے ساتھ ساتھ اللہ کی نازل کردہ دیگر کتابوں میں بھی وحی کیا گیا ایک ایک لفظ ہمارے پاس وہ نعمتِ خداوندی اور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔بلاشبہ قرآن اکیلا ہی اپنے بیان کی تفصیل بیانِ مقرر کے اچھوتے انداز میں دہراتا ہے تاکہ غور و فکر کرنے والے کہی گئی بات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔لیکن پھر بھی اگر کسی معاملے میں حوالہ جات لینا ناگزیر ہوں تو انسانوں کی لکھی ہوئیں روایتوں اور تفسیروں میں بھٹکنے کی بجائے قرآن سے پہلے اللہ کی نازل کردہ کتابوں سے استفادہ کرنا ہی اللہ کی کتابوں پر ایمان ہے۔

قارئینِ کرام غور فرمائیے قرآن اور اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کے مابین حوالہ جات (Cross References) کس طرح مل رہے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ۔

''وہ لوگ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو نبی امی ہے جسے اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔'' (الاعراف:۱۵۷:۷)

یسعیاہ کے باب ۲۹ کی آیت ۱۲ میں قرآن کے اس حوالے کی تصدیق کی گئی: اسے ایک کتاب دی جائے گی جو امی ہوگا، کہا جائے گا، اسے پڑھ۔وہ کہے گا میں تجھ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں اسے پڑھ نہیں سکتا۔

"And the book is delivered to him that is not learned, saying, Read this, I pray thee: and he saith, I am not learned." (Isaiah chapter 29 verse 12)

تورات کی دوسری کتاب تثنیہ۱۸:۱۸، تثنیہ۳۲:۲ میں بنی اسرائیل کے دو نبی بھائیوں کی اولاد میں سے مستقبل میں ایک کا نبوت کے منصب پر فائز ہونے کا ذکر ہے جو خدا کی وحی کے ذریعے نیا قانون لائے گا۔ پھر آگے چل کر ابتداء کی آیت۲۲:۲۱ میں بنی اسرائیل میں سے اسماعیلیوں کا حوالہ دے کر ان کی آل میں سے محمدﷺ کے منصبِ نبوت پر فائز ہونے کی تصدیق کی گئی۔

اسی طرح یوحنا۱۶:۱۴ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں ایک رحمت والا (نبی) دے جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔ (رواں ترجمہ)

"And I will pray the Father, and he shall give you another Comforter, that he may abide with you forever"(John 14:16)

پھر یوحنا کی آیت ۲۶:۱۴ میں اسی بات کو دوسرے انداز سے دہرایا گیا۔ لیکن خدا میرے نام میں (یعنی مسیح علیہ السلام سے مسیحا، نجات دہندہ یا رحمت) جو رحمۃ للعالمین بھیجے گا وہ تمہیں سب کچھ بتائے گا اور تمہیں وہ چیزیں یاد دلائے گا جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔

"But the Comforter whom the Father will send in my name, he shall speak to you all things, and bring all things to your remembrance, whatsoever I have said unto you."(John 14:26)

انجیل یوحنا الفصل ۱۶ الآیۃ ۷ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے درج ہے: ''تاہم میں تمہیں سچائی بتاتا ہوں، اسی میں تمہارا فائدہ ہے کہ میں چلا جاں۔ اگر میں نہیں جاتا تو وہ رحمۃ للعالمین تم تک نہیں آئیں گے، میں انہیں تم تک بھیجوں گا۔''

"Nevertheless I tell you the truth; it is expedient for you that I go away: for if I go not away, the Comforter will notcome unto you; but if I depart, I will send him unto you".(John 16:7)

یوحنا۲۶:۱۵ کے مزید دو مختلف تراجم کی نقل بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہے جن میں کہا گیا ہے: جب وہ مددگار آئے گا، جس کو میں خدا سے تمہاری طرف بھجواؤں گا، وہ سچی روح خدا کی طرف سے آئے گی تو میری تصدیق کرے گی۔ دوسرے ترجمے میں کہا گیا ہے کہ وہ جب خدا کی طرف سے آئیں گے تو میری گواہی دیں گے۔

"When the Advocate comes, whom I will send to you from the Father--the Spirit of truth who goes out from the Father--he will testify about me.(John 15:26)New International Version Translation

But when the Helper comes, whom I will send to you from the Father, the Spirit of truth, who proceeds from the Father, he will bear witness about me. .(John 15:26)English Standard Version

یوحنا کی انجیل کی مندرجہ بالا آیات کے اصل متن میں یونانی لفظ ''پیراقلیطس'' (Paracletos) استعمال ہوا ہے جو حقیقت میں اسم ''احمدؐ'' ہے جس کے اگر معانی بھی بطورِ اسم لئے جاتے تو محمدﷺ ہی بنتا۔ نام کا ترجمہ ہی مقصود تھا تو ''تعریف کیا جانے والا'' (The Praised One) بنتا مگر اس لفظ کی جگہ انگریزی ترجمے میں (Comforter) یعنی تسلی دینے والا یا راحت دینے والا لگا دیا گیا جو کسی طور پر بھی درست نہیں۔ تاہم رحمۃ للعالمین (mercy for all creatures)، مہربان رفیق (Kind Friend)، ایڈووکیٹ (Advocate) ترجمے کے لحاظ سے کسی حد تک اصل متن کے یونانی لفظ ''پیراقلیطس'' کے معانی کے قریب ہیں۔ چونکہ سینٹ برنابا کی انجیل (Gospel of Barnabas) کو کلیسا کی منظوری حاصل نہیں۔ لہٰذا غیر جانب داری کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے سینٹ جیمز (Saint James) اور اسٹینڈرڈ انگریزی بائبل کے نسخوں (Standard English Version Translation) کے رائج الوقت اور تسلیم شدہ انگریزی تراجم کو اس مضمون میں ہو بہو نقل کیا گیا ہے۔

زبور کے نغمۂ سلیمان ۵:۱۶ میں حضرت محمدﷺ کا نامِ گرامی عبرانی زبان کے جلی حروف میں ''محمدؐ'' لکھ کر ان کی تعریف کی گئی اور اسی باب کی مختلف آیات میں یہ بھی بتایا گیا کہ وہ عرب کے علاقے سے ہوں گے اور ان کا کردار اور حلیہ مبارک کیسا ہوگا۔

۵:۱۶ کا اصل عبرانی متن مندرجہ ذیل ہے جس میں عبرانی لفظ ''מחמדים'' محمد اِم بطور اسم آیا ہے۔ ''اِم'' عبرانی میں کسی نام کو عزت سے مخاطب کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور انبیاء علیہ السلام کے ناموں کے ساتھ بھی لگتا ہے۔

חִכּוֹ, מַמְתַקִּים, וְכֻלּוֹ, מַחֲמַדִּים; זֶה דוֹדִי וְזֶה רֵעִי, בְּנוֹת יְרוּשָׁלִָם

(5:16 Song of Solomon)

نغمۂ سلیمان ۵:۱۶ کی مندرجہ بالا آیت کو عبرانی تلفظ میں ایسے پڑھیں گے: ھیـــــــکّـــــو

ممیتّا کم وی کُلّوُ محمد اِم زہِ دّودہ وا زیَھرائی بیَنا۔

ترجمہ: ان کا منہ میٹھا ہے، وہ جناب محمد ﷺ ہیں۔ یہ میرے محبوب ہیں اور یہ میرے رفیق ہیں۔ اویروشلم کی بیٹی! (نغمۂ سلیمان ۵:۱۶)

English: His mouth is most sweet; yea, he is ALTOGETHER LOVELY. This is my beloved, and this is my friend, O daughters of Jerusalem. (5:16 Song of Solomon)

عبرانی متن میں لفظ محمد ﷺ جوں کا توں موجود ہے مگر اس آیت کے انگریزی ترجمے میں سینٹ جیمز نے محمد ﷺ کے نام کا بھی ترجمہ کر کے (ALTOGETHER LOVELY) مجموعی طور پر پیارا یعنی ہر دل عزیز لکھا ہے جو کسی بھی زبان کی صرف ونحو کے حوالے سے درست نہیں اور اس آیت کے اصل متن سے بھی مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ کسی کا نام ترجمے میں بعینہٖ نام لکھا جاتا ہے نہ کہ اس کے معانی۔

اس کے علاوہ اسی عنوان کی آیت ۱۰:۵ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ میرے محبوب کی رنگت سفید اور گلابی ہے اور وہ دس ہزار سپاہیوں کے فاتح سردار ہوں گے۔

Song of Solomon 5:10 says: "My beloved is white and ruddy, pre-eminent above ten thousand."

اس تاریخی حقیقت سے کون واقف نہیں کہ حضرت محمد ﷺ دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ فاتح سپہٗ سالار کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تھے؟

قارئینِ کرام! یہ سب ہمارے علما کے قائم کردہ مفروضے ہیں کہ قرآن سے پہلی کتابوں سے بہت سا مواد خارج کر کے انہیں مسخ کر دیا گیا۔ ان میں بہت سی تبدیلیاں کر دی گئیں اور یہ کہ ان کتابوں میں وحی کا اصل متن ناپید ہو چکا ہے۔ اگر واقعی میں ایسا ہے تو اس مضمون میں تورات، زبور، انجیل اور دیگر آسمانی صحیفوں سے لی گئیں آیات یہود ونصاری نے ابھی تک ان کتابوں کے اصل متن سے خارج کیوں نہیں کیں؟ باوجود اس کے کہ یہ مذکورہ آیات ان کے موجودہ عقائد کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ ہم سلاہ کے لفظ کے بارے میں مندرجہ بالا سطور میں ذکر کر چکے ہیں کہ یہ وہی صلاہ ہے جس کا حکم اسلام سے پہلے دیگر مذاہب کو بھی دیا گیا تھا۔ اور یہ لفظ ابھی تک ان کتابوں کے اصل متن میں س-ل-ا- کے حروف میں جوں کا توں موجود ہے۔ اگرچہ یہود ونصاری خود قبول کرتے ہیں کہ انہیں اس لفظ ''سلاہ'' کے معانی کا کچھ ادراک نہیں مگر کسی نے پھر بھی اس لفظ کو ان کتابوں کے اصل متن سے خارج نہیں کیا۔ بلکہ جہاں جہاں ''سلاہ'' اصل متن میں موجود ہے تمام تراجم میں یہ لفظ بغیر ترجمہ کئے ان آیات کے ترجمے میں لگا دیا جاتا ہے۔ رہی بات آیات کے ترجمے اور تفسیر میں مفہوم کے بدلنے کی۔ وہ تو ہم بھی قرآن کے ترجمے اور تفسیر میں کرتے ہیں جس سے اللہ کی کتابوں کے اصل متن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اِکا دکا آیات میں اگر قرآن سے اختلاف پایا بھی جائے تو ان پر نئے سرے سے غور کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وحی کا اندازِ بیاں انسانی بیان سے یکسر مختلف ہوتا ہے اور اس میں پنہاں کائناتی سچائیاں (Universal Truth) خود گواہی دیتی ہیں کہ یہ کسی انسان کا لکھا ہوا کلام نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اختلاف باقی رہنے کی صورت میں اس بیان کو چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ مگر پوری کی پوری کتابیں ہی رد نہیں کی جا سکتیں۔ ورنہ ہمارا شمار یقیناً منکرینِ وحی میں ہوگا!

یہودیت پر پارسی مذہب کے اثر ورسوخ سے پہلے یہودی پیدائشِ نو (Rebirth or Reincarnation) پر مکمل ایمان اور کامل یقین رکھتے تھے۔ جس کا ثبوت عہد نامہ قدیم میں ''ابتداء'' (Genesis) کی آیات ۳۵، ۳۷، ۲۹، ۴۴، ۳۸، ۴۲ ''گنتی'' (Numbers) کی آیات ۳۰:۱۶ اور ۳۳:۱۶ اور ''استثنا'' (Deuteronomy) کی آیت ۲۲:۳۳ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۵۸۷ء قبل مسیح میں بابل کے دراندازحملہ آوروں کے ہاتھوں یہودی جلاوطن ہو گئے اور جب چھٹی قبل مسیح میں ''سائرس'' نے اس خطے میں سلطنتِ فارس قائم کی تو یہودیوں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ اس طرح فارس کے بادشاہ سائرس نے قدیم یہودیوں کے نجات دہندہ کا کردار ادا کیا جس کی وجہ سے وہاں کے مقامی زرتشی اور یہودی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ جب دونوں مذاہب میں باہمی روابط بڑھنے لگے اور زرتشی علما یہودی مذہب پر اثر انداز ہونے لگے تو سائرس نے ایک طرف تو یہودیوں کا دل جیتنے کے لئے انہیں مذہبی آزادی دے دی مگر دوسری طرف فارس کے سرکاری مذہب کے طور پر زرتشی مذہب کا اعلان کر دیا۔ جس سے یہودی مذہب میں بہت سی ثقافتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ وحی کی گئی ''پیدائشِ نو'' کے ذریعے آخرت کی زندگی بھی

''قیامت کے بعد مردوں کے قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے'' کے زرتشی تصور میں بدل گئی۔ اگر یہودیوں پر سائرس اور زرتشی مذہب کے اثرات نہ ہوتے تو آج یہودیت کا چہرہ بالکل مختلف ہوتا۔ عہد نامہ جدید (New Testament) کے آنے تک یہودی تین فرقوں یعنی فریسی (Pharisees)، صدوکی (Sadducees) اور عیسینی (Essenes) میں بٹ چکے تھے۔ قیامت اور آخرت کے فارسی تصورات مسترد کرنے اور یہودی مذہب میں زرتشی در اندازی کے خلاف یروشلم میں مظاہرے بھی ہوئے جن کی فارسی گورنروں نے کھل کر مزاحمت کی۔ فارسی گورنروں نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے یروشلم میں زرتشی آبادی بڑھا دی اور فارسی مبلغین نے یہودیوں کے بھیس میں زرتشی مذہب کی زوردار تبلیغ شروع کردی جس سے رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی اور یہودیت میں زرتشی مذہب پوری طرح سرایت کر گیا۔

اسلام کے حوالے سے بھی یہ بات خاصی توجہ طلب ہے کہ جو فارسی مبلغین یہودیوں کے بھیس میں پہلے سے خطہ عرب میں موجود تھے انہیں کی آل اولاد کو استعمال کر کے اسلام کا حلیہ بگاڑا گیا کیونکہ اس وقت تک وہ مجوسی بہروپیئے مقامی زبان اور اہلِ کتاب کے عقائد سے بخوبی واقف ہو چکے تھے جن کے لئے مسلمانوں کے نظریات تبدیل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

یہودیوں کے بعد عیسائیوں میں بھی قیامت کے دن مردوں کے زندہ ہونے کا نظریہ زرتشی تسلط کے زیر اثر عیسائیت کے دورِ اول کی فرقہ بندی کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ وہی دور ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ مفروضہ قائم کیا گیا تھا کہ یا تو وہ خود خدا ہیں جو انسانی شکل میں پیدا ہوئے ہیں یا کوئی ایسے انسان ہیں جو خدا بن گئے ہیں؟ اس وقت یعنی ۷۰ عیسوی میں رومیوں کے اسرائیل پر حملے کے بعد مصر کی طرف فرار ہونے والی کلیسائے یروشلم کی باقیات اور پال (Paul) کے قائم کردہ کلیسائے روم کے درمیان کھینچا تانی خوب زور شور سے چل رہی تھی جس کے نتیجے میں رومن دھڑے نے عیسائیت کی بہت سی وحی کردہ تعلیمات کے ساتھ ساتھ پیدائشِ نو (Reincarnation) کے قدرتی نظام کو بھی مسترد کر دیا اور یہ یقین کرنے لگے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تھے جو انسانی شکل میں دنیا میں آئے تھے (Jesus was God become man)۔ اس دن سے یہ عقائد عیسائیوں کے ایمان کا مستقل حصہ بن گئے۔ عیسائیوں کا یروشلم والا دھڑا جانتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فقط ایک انسان تھے جو حکم الٰہی سے نبوت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ یروشلم والے عیسائی پیدائشِ نو (Reincarnation) پر بھی یقین رکھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب دنیا میں واپس تشریف نہیں لائیں گے کیونکہ ان کا دنیا میں آنے کا مقصد پورا ہو چکا ہے اور وہ حیات و ممات کے دائرے سے نکل کر ابدی زندگی پا چکے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے رومی عیسائیوں نے سیاسی جنگ جیت لی اور کلیسائے روم نے 'ہر بار مرنے کے بعد فوری حساب کتاب اور اگلی زندگی میں سزا اور جزا پر فوری عمل درآمد'' یعنی بار بار مرنے کے بعد حساب کتاب اور پھر گزشتہ زندگیوں کے اعمال کے مطابق بار بار زندہ ہونے کے وحی کئے ہوئے قانون کی تعریف آخرت میں ایک ہی بار برپا ہونے والی قیامت کے بعد مردوں کے ہمیشہ کے لئے زندہ ہونے کے زرتشی تصور سے بدل دی۔ رہی سہی کسر پال (Paul) اور اس کے حواریوں نے اس کی تشریح میں چار چاند اور لگا کے اس طرح پوری کی کہ ''یسوع'' پہلی بار آئے تو سب کے گناہ لے کر اوپر چلے گئے اور اب وہ دوبارہ قیامت کے دن فرشتوں کے ساتھ آسمانوں سے ہمیں بخشوانے کے لئے اتریں گے۔ ہمیں موت کے بعد گہری نیند سے جگا کر (Resurrection) ابدی زندگی دیں گے اور ہمیشہ کے لئے ہماری نجات (Salvation) کرا دیں گے۔ اس غلط عقیدے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے حوالے بھی تراشے گئے اور انجیل کی ان آیات کا گمراہ کن ترجمہ بھی کیا گیا جن میں مرنے کے بعد فوری احتساب اور جزا و سزا کے ساتھ نئی زندگی کے آغاز کے بارے میں وحی کی گئی تھی۔ لیکن اگر اب بھی انجیل کے اصلی متن کو غور سے پڑھا جائے تو بے شمار آیات میں کھلی آنکھوں سے پیدائشِ نو (Reincarnation) کے بیانات اور ان کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا قبروں میں سوئے ہوئے مردوں کی لاشوں کو قیامت کے دن زندہ کر کے اٹھائے جانے کا عقیدہ (resurrection of corpses) صرف یہودیت، عیسائیت یا اہلِ کتاب کے مذاہب کے ساتھ ہی شروع نہیں ہوا۔ بلکہ یہ ایمان بالآخر (Eschatology) قدیم فارس ایران کے ان ستارہ پرست روحانی مجوسیوں کی ایجاد ہے جنہوں نے زرتشی مذہب (Zoroastrian Religion) کی بنیاد رکھی تھی جس نے پہلے یہودیوں پھر عیسائیوں اور ان کے بعد مسلمانوں کو ڈسا۔

تین عقلمند آدمی(Three Wise Men) جنہیں عیسائیوں کی تاریخ میں تین روحانی بادشاہ بھی کیا جاتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعدان کے لئے تین تحائف لے کرآئے تھے۔ جو بعد میں عیسائی روایات کا ایک اہم اور مستقل حصہ بن گئے۔ کرسمس کی تقریبات اوران میں تحفے(Christmas Gifts) لینےاور دینے کا رواج عیسائیوں میں اِنہیں تین مجوسیوں کی وجہ سے شروع ہوا۔متی کی انجیل بھی ان تین ممتاز غیرملکی ستارہ شناس لوگوں کا حوالہ دیتی ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زیارت لوبان، مر(گنقرس) اورسونے کے تحائف کے ساتھ کی تھی۔ تاریخ میں یہ واقعہ ''مجوسی شہرت'' (Magi Fame) کے نام سے خاصہ مشہور ہے۔اگر وقت اجازت دے تو اس تاریخی واقعہ کا مطالعہ کرنا بہتر ہوگا تا کہ آپ خود حقیقت جان سکیں۔انگریزی میں میجک Magic کا لفظ انہیں تین لوگوں کے گروہ میجی Magi سے ماخوذ ہے۔کیونکہ وہ مجوسی ستارہ شناس علمِ نجوم اور علم السحر یعنی جادو میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ان **المجوس الثلاثه** (Three Magi) کے نام بالتازار (Balthasar)اسپار (Caspar) اورملیور (Melchior) تھے جن کے ایرانی لباس میں اصل تصویری خاکے نیویارک میں آثارِقدیمہ کے عجائب گھر بروک لین (Brooklyn Museum)میں محفوظ ہیں۔ان کی عکسی نقول آپ کی خدمت میں حاضر ہیں:







عہدِقدیم (Old Testament) کے دور میں جب یہودی بابل کی جلاوطنی سے گزررہے تھے تو ان کے مذہب میں آخرت اورقیامت کا موجودہ زرتشی تصور داخل کیا گیا۔جس میں پوری دنیا کے مردوں کوان کی قبروں سے زندہ کر کے فیصلے کا آخری دن روزِ قیامت مقرر ہوا،پَروں والے فرشتوں کے موجودہ تنظیمی ڈھانچے کا تصور تشکیل پایا، شیطان کو اللہ کا حریف بنا کر پیش کیا گیا، مہراب والی عبادت گاہوں کا قیام عمل میں لایا گیااور پیدائشِ نو کے ربی عمل کو زمین دوز پاتال کے غیرمنطقی تصور سے تبدیل کر دیا گیا۔

متی(Matthew) کے مطابق چار میں سے صرف ایک وہیت اناجیل (Canonical Gospels) میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا میجی(Magi) ہی وہ لوگ تھے جنہوں نے یسوع کی عبادت کرنے کی طرح ڈالی اوران کو خدا کا درجہ دیا۔جس کو بعد میں کلیسائے روم نے زبور کی آیت ۱۱:۷۲ کی غلط تشریح کر کے زرتشیوں کے میجی عقیدے سے منسلک کر لیا اورتحریری طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوخدا مان کے ان کی عبادت شروع کر دی۔زبور کی مذکورہ آیت ۱۱:۷۲ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

Psalms 72:11, "May all kings fall down before him

تمام بادشاہ اس کے سامنے گر جائیں گے۔(زبور۱۱:۷۲)

قارئینِ کرام ملاحظہ فرمایئے زبور کی اس آیت ۱۱:۷۲ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنا کے

ان کی عبادت کرنے کی بات نہیں کی جا رہی بلکہ ان کے مرتبے اور مقام کی بات ہو رہی ہے۔مگر عیسائیوں نے اس کا مطلب بدل کے اس کی تشریح اپنے نظریات کے مطابق کر لی! یہی حال اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ دیگر کتابوں کی تشریح اور تراجم میں بھی کیا گیا۔

پہلی صدی کے مشہور یہودی مورخ فلاویس یوسیفس (Flavius Josephus) لکھتے ہیں کہ زرتشی سازش کے بعد جب یہودی تین بڑے فرقوں میں بٹ گئے تب بھی یہودیوں کے فرقہ فریسی(Pharisees) سے تعلق رکھنے والے راست باز یہودی پیدائشِ نو(Reincarnation) پر ایمان رکھتے تھے۔ پال(Paul) خود بھی یہودیت چھوڑ کے عیسائیت اختیار کرنے سے پہلے فریسیوں کے فرقے سے ہی تعلق رکھتا تھا۔

فریسیوں کا شجرۂ نسب ۱۶۵ قبل مسیح کے ان نیک کاروں کے قبیلے سسدانس(Assideans) سے جا ملتا ہے جنہوں نے مکابی شورشوں(Maccabean Revolt) کے خلاف یونان اور شام کے حکمران نطیوخس چہارم(Antiochus IV) سے ٹکر لی تھی۔ یہ عہد نامہ قدیم کے بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے درمیان چار صدیوں پر محیط وہ دور تھا جب ابھی سلطنتِ روم معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی اور یروشلم میں یونانی بت پرستوں کا اثر اور عمل دخل اپنے عروج پر تھا۔

مورخ یوسیفس (Josephus) مزید لکھتے ہیں کہ فریسیوں کا ایمان تھا کہ موت کے بعد شیطان صفت برے لوگوں کی روح کو سزا دی جاتی ہے لیکن راست باز اور اچھے لوگوں کی روح دوسرے جسموں میں لوٹا کر ان کی زندگی بحال کر دی جاتی ہے تا کہ وہ دوبارہ جی سکیں۔ یہودی تاریخ کے مستند حوالوں سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے اس زمانے میں یہودیوں میں یہ ایک راسخ عقیدہ تھا کہ جو انبیا علیہ السلام اس دنیا سے رخصت فرما جاتے ہیں وہ اپنی وفات کے بعد پیدائشِ نو (Reincarnation) کے ذریعے اسی دنیا میں واپس تشریف لے آتے ہیں۔مگر یہودیوں کے یہ عقائد یروشلم پر زرتشتیوں کے غلبے کی وجہ سے دم توڑ گئے۔

یہودیوں کے ایمان اور قدیم عقائد میں پیدائشِ نو(Reincarnation) کے ثبوت عبرانی زبان کے لفظ گل گل ''לגול'' (Gilgul) یعنی ''اوتار'' سے ملتے ہیں۔عبرانی کے اس لفظ کا عربی میں ترجمہ ''خط الرم'' بھی کیا جاتا ہے۔سادہ اردو میں اسے گول دائرہ اور فارسی میں ''خطِ دروازہ'' کہا جاتا ہے۔''گل گل''(Gilgul) کے ساتھ عبرانی زبان کا دوسرا لفظ ''הבשמות'' ہا-نے-شاموت(ha'ne'shamot) بھی لگایا جاتا ہے جس کا عربی میں ترجمہ ''النفس'' اور فارسی میں ''ارواح'' کیا جاتا ہے۔یہودی تعلیمات میں یہ دونو عبرانی لفظ ''לגול'' اور ''הבשמות'' اکٹھے ملا کے بولے جاتے ہیں جن سے روح کی ری سائیکلنگ (transmigration and Reincarnation) اور پیدائشِ نو کے دائرے کا مطلب لیا جاتا ہے۔یہ حیات و ممات کا وہی گول دائرہ(cycle) ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی موجود ہے اور ہم اس کا حوالہ ''واعظ'' کی آیات -: میں اسی کتاب کی بالائی سطور میں دیکھ چکے ہیں۔لہٰذا گل گل نشا موت (Gilgul Neshamot) کو تقمصِ روح(metempsychosis of souls) یا روح کا سائیکل کہا جاتا ہے۔جو یہودیوں کی مقدس تحریروں(Kabbalah) میں ملتا ہے اور ان عقائد پر ایمان رکھنے کی تعلیم ان کے یہاں قرونِ وسطیٰ(Medieval) کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔قدامت پسند (Orthodox) یہودی اگرچہ دوبارہ پیدائش(Reincarnation) یا اوتاروں کے سوال پر زیادہ زور نہیں دیتے مگر اس کی تعلیم کو صحیح ضرور مانتے ہیں۔یہودیوں کے فرقہ الحسید یہ(Hasidic) کے لوگ جلجلم یعنی پیدائشِ نو کے سائیکل پر سب سے زیادہ ایمان رکھتے ہیں اور مقدس تحریروں (Kabbalah) میں اس کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

عبرانی میں ''زوہار''(Zohar) مرنے کے بعد درجات بلند کر کے دوبارہ اٹھائے جانے کو جاتا ہے۔انگریزی میں اس کا ترجمہ(Elevation) کیا گیا ہے جس کی تشریح انگریزی کی جامع لغات میں ان الفاظ میں کی جاتی ہے۔

The action or fact of raising or being raised to a higher or more important level, state, or position or increase in the level of something,

یعنی اعلیٰ اور زیادہ اہم سطح، حالت یا موقف پر اٹھانے یا اٹھنے کا عمل۔

زوھار کو تیرہویں صدی میں اس وقت خاصی مقبولیت حاصل ہوئی جب یہودی علما کے درمیان طویل بحث و مباحثوں کے بعد بالآخر پیدائشِ نو کی حقیقت کو تسلیم کر کے اِسے تورات کے حصہ ''بالک''(Balak) کے ساتھ جوڑ کر سمجھا گیا جس میں پیدائشِ نو کے سلسلے کے حوالہ جات پہلے

سے موجود تھے۔لہٰذا پیدائشِ نو اور اوتاروں کی آمد کے سلسلے میں ''زوھار'' (Zohar) کا تصور بھی یہودیوں کے عقیدے میں شامل ہے۔دانیال کی مندرجہ ذیل آیت ۱۲:۳ میں شجرِ زندگی (The Tree of Life) سے ترقی دے کر دوبارہ اٹھائے جانے (Elevation) کا بیان بطورِ دلیل پیش کیا جاتا ہے۔

"But the wise shall understand that their elevation comes from the Creator, the Tree of Life. And they who are righteous shall shine like the brightness of the firmament" (Daniel 12:3)

لیکن عقلمند سمجھ جائیں گے کہ انہیں ترقی دے کر اٹھایا جانا، آتا ہے، خالق، زندگی کے شجر کی طرف سے۔اور جو لوگ صالح ہیں وہ چمک اٹھیں گے چمکتے ہوئے آسمان کی طرح۔(دانیال ۱۲:۳)

The Tree of Life یعنی زندگی کے شجر کے ساتھ elevation یعنی، اوپر اٹھانا، ارتقاع، بالا رفتن، بوجود آمدہ یا نہض کا بغور مطالعہ کیا جائے تو دانیال کی مندرجہ بالا آیت ۱۲:۳ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ زندگی کا منبع (source) یعنی شجرِ حیات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس سے سب زندگیاں نکلتی ہیں اور لوٹ کر اسی میں جاتی ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں لتھوانیا کے یہودی استاذ العلما راہب یلیاہ (Elijah) نے بائبل کی کتاب یونس (the biblical Book of Jonah) پر ایک سیر حاصل تبصرہ لکھا جس میں انہوں نے مدلل حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ کتابِ یونس پیدائشِ نو (Reincarnation) کے استعاروں (allegory) پر مبنی ہے جو اوتار کی شکل میں انسان کے دوبارہ پیدا ہونے کے عمل کی وضاحت کرتے ہیں۔

معروف یہودی مذہبی شخصیت راہبہ یتشک لوریا (Rabbi Yitzchak Luria) لکھتی ہیں کہ موشہ (Moshe) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت آدم کے تیسرے بیٹے شیث کی پیدائشِ نو (Reincarnation) تھے جبکہ شیث ہابیل کا اگلا جنم تھا۔راہبہ لوریا مزید لکھتی ہیں کہ ''م'' (mem) سے نئے جنم کے نام موسیٰ کے شروع کا حرف، ''ش'' (shin) سے اس سے پہلے جنم کے نام شیث کا پہلا حرف اور ''ہ'' (heh) سے ہابیل بنتا ہے ان عبرانی حروف کو ملا دیا جائے تو مکمل نام موشہ (Moshe) بنتا ہے جو عبرانی صحیفوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام ہے۔اسی طرح یہودیوں کی تاریخ میں ھلیل دوسرا جنم لے کر حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔

یہودی تعلیمات کے مایہ ناز محقق راہب حایم (Rabbi Haim) الشعار جلجلم (Shaar HaGilgulim) میں رقم طراز ہیں کہ یہودی تاریخ کے دو معروف کردار سکم (Shechem) اور دینہ (Dinah) بھی پیدائشِ نو (Reincarnation) کے دائرے (Cycle) میں رہ چکے ہیں۔ سکم جب ایک عزت دار گھرانے کی عورت دینہ بنتِ یعقوب کی عصمت دری کا مرتکب ہوا تو سکم اس کی ذمہ داری اپنی پرورش پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو گیا۔جب ان دونوں نے دوبارہ جنم لیا تو دونوں کا کردار الٹ گیا۔سکم دوبارہ جنم لے کر اسرائیلی جنرل ''جمری'' (Zimri) بنا اور دینہ مدیانی قبیلے کی ''کزبی'' (Cuzbi) نامی عورت بنی۔جمری نے بری نیت سے کزبی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دونوں کے درمیان تعلقات استوار ہونے کی خبر جب انتہا پسند بنحاس (Pinhas) کو ملی تو اس نے دونوں کو قتل کر دیا۔اس طرح جمری یعنی سابقہ سکم کو ہمیشہ کے لئے جہنم رسید کر دیا گیا۔اسے اس کی کرنی کی سزا مل گئی اور وہ اس بار اچھے گھرانے میں پرورش پانے کی وجہ سے پچھلی بار کی طرح اپنے جرم کی ذمہ داری اپنی بری پرورش پر نہیں ڈال سکا۔حیات و ممات کا سائیکل آگے بڑھا، بنحاس (Pinhas) کا اگلا جنم بطور راہب اکیوا (Rabbi Akiva) اور کزبی روم کے جنرل ترمس روفس (Turnus Rufus) کی بیوی بن کر پیدا ہوئی۔جس نے یہودی مذہب اختیار کر کے راہب اکیوا کے مذہبی اجتماعات منعقد کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔اس زندگی میں اس نے یہودیت کی تعلیمات کا فروغ دے کر اپنی پچھلی زندگی میں جنرل جمری کے ساتھ کئے گئے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔اس طرح اس کے گل گل (gilgul) کے سائیکل کا اچھا اختتام ہوا۔

اس واقعہ کے ساتھ گنتی کی مندرجہ ذیل آیات :- کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔

A Midianite woman, distinguished as the daughter of Zur, "head of the people of a fathers' house in Midian." She was slain by Phinehas at Shittim in company with "Zimri, the son of Salu, a prince of a fathers' house among the Simeonites" (Numbers 25:6-18).

مدیانی قبیلے کی ایک عورت جو مدائن کے سردار زور کی دختر کے نام سے مشہور تھی اسے بنحاس نے شیتم (سفید پھولوں والے کیکر کا درخت) کے پاس شمونیوں کے راجہ سلو کے بیٹے جمری کے ساتھ

قتل کر دیا۔(گنتی:۱۸-۶:۲۵رواں ترجمہ)

تثنیہ(Deuteronomy) کے مندرجہ ذیل حوالے ۱۰-۵:۲۵ بھی اہل یہود میں کسی آدمی کی دوبارہ پیدائش(reincarnation) کے ضمن میں دیئے جاتے ہیں جن میں عبرانی زبان کا ایک لفظ ملتا ہے جس کا تلفظی یبم(yibum) ہے۔اسے انگریزی میں levirate اور عربی میں السلفہ کہا جاتا ہے۔اس کے مطابق اگر کسی یہودی عورت کا جوان آدمی مرجائے تو وہ اپنے آدمی کے بھائی سے شادی کرتی ہے اور پیدا ہونے والے بچے کا نام اپنے مرے ہوئے آدمی کے نام پر رکھتی ہے۔یہودیوں کا یقین ہے کہ یہ بچہ اس عورت کے پہلے آدمی کا ہی اوتار یعنی دوسرا جنم ہوتا ہے جس سے اس آدمی کی آئندہ نسل چلتی ہے۔

تثنیہ(Deuteronomy)۱۰-۵-۲۵ کا ترجمہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے:

اگر بھائی اکٹھے رہتے ہوں اور ان میں سے کوئی بغیر بیٹا پیدا ہوئے گزر جائے تو اس کی بیوہ خاندان سے باہر ہرگز شادی نہیں کرے گی۔اس عورت کے مرحوم شوہر کا بھائی اسے قبول کر کے اس کے ساتھ شادی کرے گا اور اس عورت کے آدمی کے بھائی کے طور پر اپنی ذمہ داری ادا کرے گا۔پہلا بیٹا پیدا ہوگا تو اس کا نام اپنے مرے ہوئے بھائی کے نام پر رکھے گا تا کہ اس کا نام بنی اسرائیل سے نہ مٹے۔تاہم اگر یہ آدمی اپنے مرحوم بھائی کی بیوی کے ساتھ شادی نہ کرنا چاہے تو اس عورت کو چاہئے کہ وہ علاقے کے بڑے بزرگوں کے پاس جا کر کہے کہ میرے آدمی کا بھائی اپنے مرے ہوئے بھائی کا نام بنی اسرائیل میں جاری رکھنا نہیں چاہتا۔پھر شہر کے بڑے لوگ اسے طلب کر کے اس سے بات کریں گے۔اگر وہ اس بات کا اصرار کرے کہ میں اس عورت سے شادی نہیں کرنا چاہتا تو اس کے بھائی کی بیوہ ان بڑے لوگوں کی موجودگی میں ننگے پاؤں ہو کے اس پر چڑھائی کرے گی۔اور اس آدمی کے منہ پر تھوکتے ہوئے کہے گی کہ اس ادمی کے ساتھ یہی کرنا چاہئے جو اپنے بھائی کے شجرۂ نصب کا انشا نہیں کرتا۔اس آدمی کا شجرہ اسرائیلیوں میں ننگے پاؤں والا خاندان کہلائے گا۔تثنیہ(Deuteronomy)۱۰-۵-۲۵(بین الاقوامی نسخۂ جدید)

5 If brothers are living together and one of them dies without a son, his widow must not marry outside the family. Her husbands brother shall take her and marry her and fulfill the duty of a brother-in-law to her.6 The first son she bears shall carry on the name of the dead brother so that his name will not be blotted out from Israel.7 However, if a man does not want to marry his brothers wife, she shall go to the elders at the town gate and say, My husbands brother refuses to carry on his brothers name in Israel. He will not fulfill the duty of a brother-in-law to me.8 Then the elders of his town shall summon him and talk to him. If he persists in saying, I do not want to marry her,9 his brothers widow shall go up to him in the presence of the elders, take off one of his sandals, spit in his face and say, This is what is done to the man who will not build up his brothers family line.10 That mans line shall be known in Israel as The Family of the Unsandaled.)Deuteronomy 25:5-10)New International Version (NIV)

لوقا کی آیات ۹-۷:۹ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے اہلِ کتاب میں حیات بعد الممات پر ایمان اور دوبارہ پیدا ہونے والے اوتاروں(reincarnated people) کے آنے کے عقائد اتنے مضبوط تھے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا آغاز ہوا تو لوگ بہت دیر تک اس اچھنبے میں پڑے رہے کہ کہیں عیسی علیہ السلام پیدائشِ نو کے بعد آنے والے کسی سابقہ نبی کے اوتار تو نہیں؟ کچھ لوگوں نے ان کو یحیٰ علیہ السلام (John) کی دوبارو پیدائش یعنی ان کا اوتار خیال کیا اور کچھ نے حضرت الیاس علیہ السلام کا۔پیدائشِ نو(Reincarnation) کے سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنے شاگردوں سے گفتگو اس ضمن میں بہت غور طلب ہے۔جب انہوں نے اپنے شاگردوں سے حلفیہ انداز میں کہا کہ یوحنا (یحیٰ) در اصل حضرت الیاس (Elijah) کے اوتار تھے جو دوبارہ پیدائش (Reincarnation) کے ذریعے دنیا میں تشریف لائے تھے۔

حضرت یحییٰ(John) علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں نے حضرت زکریا علیہ السلام کو خوش خبری سنائی کہ ان کی بیوی ایک بچہ جنے گی جس کا نام یحییٰ ہوگا اس خوش خبری میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی سرگرمیوں کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا اس کا بیان متی اور لوقا دونوں میں ایک جیسا

ہے جن کے حوالے آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

And he will go before him in the spirit and power of Elijah to turn the hearts of the fathers to the children and the disobedient to the wisdom of the just; to make ready a people prepared for the Lord (Luke 1:17. Italics mine).

اور وہ اس کے سامنے جائے گا یلیاہ (الیاس) کی روح اور طاقت میں، باپوں کے دل بچوں کی طرف پھیرنے کے لئے اور نافرمان کو راست باز بننے کی عقل دے کر تیار کرے گا اپنے رب کے لئے۔ (لوقا ۱:۱۷)

لوقا ۱:۱۷ کا جملہ "in the spirit and power of Elijah" (یلیاہ کی روح اور طاقت میں) یہ حقیقت کھلے انداز میں واضح کر رہا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام دو الگ الگ جسم ضرور تھے مگر ان میں روح ایک ہی تھی یعنی یحییٰ علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام کی پیدائشِ نو (reincarnation) تھے۔ لہٰذا متی کی انجیل میں دو نکات بتائے گئے ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ پیدائشِ نو ایک مسلمہ حقیقت ہے اور دوسرا یہ کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی پیدائشِ نو (reincarnation) بطور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ہوئی تھی جو اس زمانے میں کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ یہ دونوں نکات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دورِ حیات میں ان کے پیروکار پیدائشِ نو (reincarnation) پر مکمل یقین رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بھی عیسائیوں کے کچھ فرقے پیدائشِ نو کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔

ہمارے قدیم روایتی علما کی بات تو احاطۂ بیان سے قطعی باہر ہے مگر جنہیں ہم خالص قرآنی سوچ کے حامل جدت پسند علما کہتے ہیں ان کی عمر بھی پوپ کے نظریات اور عیسائیت کے مغربی فلسفے کا چربہ اپنی کتابوں میں لکھتے ہوئے گزری۔ ہمیں اس حقیقت کا پتہ صرف اس لئے نہیں چلا کہ ہم نے نہ کبھی پوپ اور پادریوں کی کتابیں پڑھی تھیں نہ مذہب کا مغربی فلسفہ اور نہ ہی کلیسا اول کی سازشیں۔ مذکورہ علما لوقا کی مندرجہ بالا آیت: کا ترجمہ ایسے کرتے جس سے یہ مطلب نکلے کہ ''حضرت یحییٰ علیہ السلام میں کام کرنے کی صلاحیت اور جذبہ ایسا تھا جیسا کہ حضرت الیاس علیہ السلام میں دیکھا جاتا تھا'' ان کے نزدیک اللہ کی راہ میں مارا جانے والا شہید بھی اپنی شہادت کی موت کے بعد جسمانی زندگی نہیں پاتا بلکہ اس کا صرف نام ہی زندہ رہتا ہے اسی طرح وہ موت کے بعد حیات والی قرآنی آیات کو بھی جسمانی زندگی کے مطلب میں لینے کی بجائے صرف مردہ سوچ میں تبدیلی کا استعارہ لیتے ہیں۔ یہ علماء اس دور کی پیداوار ہیں جب ہر شے کو کمیونزم (communism) کے میکانکی اور مادی قوانین کی روشنی میں دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے قرآن کہتا ہے تو کہتا رہے مگر انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ کبھی مرنے والے بھی لوٹ کر آتے ہیں؟

متی (Matthew) کے مندرجہ ذیل حوالہ جات نہ صرف عقل سے عاری علما کے خودساختہ فلسفے کی نفی کرتے ہیں بلکہ موت کے بعد ملنے والی جسمانی زندگی کی توثیق بھی کر رہے ہیں۔

And if you are willing to accept it, he is Elijah who is to come. He that hath ears to hear, let him hear. (Matthew 11:14-15)

اور اگر تم اس بات کو قبول کرنے کو تیار ہو تو یہ وہی یلیاہ (الیاس) ہے جو آنے والا ہے۔ جس شخص کے پاس سننے کے لئے کان ہیں وہ سن لے۔ (متی ۱۱:۱۴-۱۵)

And if you are willing to understand what I, mean, he is Elijah, the one the prophets said would come. And if ever you were willing to listen, listen now! (Matthew 11:14-15, the Living New Testament).

اور اگر آپ یہ سمجھنے کے لئے تیار ہیں کہ میرا مطلب کیا ہے؟ وہ الیاس ہے، وہی جس کے بارے میں نبیوں نے کہا تھا کہ وہ آئے گا۔ اور اگر کبھی آپ یہ سننے کے لئے تیار تھے، تو اب سنئے! (متی ۱۱:۱۴-۱۵ از زندہ نیا عہدنامہ)

قارئینِ کرام متی اور مرقس کے مندرجہ ذیل بیانات ملاحظہ فرمائیے جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت یلیاہ (لیاس) کے اوتار کی آمد (Rebirth of the same person) کی تصدیق خود فرمائی۔

But I tell you that Elijah has already come, and they did not know him, but did to him whatever they pleased (Matthew 17:12).

لیکن میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ یلیاہ (الیاس) پہلے ہی آ چکے ہیں، اور لوگوں نے ان کو جانا

نہیں تھا مگر لوگوں نے جو کچھ بھی ان کے لئے کیا اس پر خوش ہیں۔ (متی ۱۲:۱۷)

But I tell you that Elijah has come, and they did to him whatever they pleased, as it is written of him (Mark 9:13).

مگر میں تمہیں بتا تا ہوں کہ یلیاہ (الیاس) آ گیا ہے، اور وہ خوش ہیں جو کچھ بھی اس کے لئے کیا ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ (مرقس ۹:۱۳)

کلیسا اول کی سازش (conspiracy of early church) کی وجہ سے متی اور مرقس کی ان آیات کو اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ اس نظر سے بھی دیکھتے ہیں کہ یہاں تو صرف یہ بات بتائی جا رہی ہے کہ حضرت یلیاہ (الیاس) اپنے وقت پر دنیا میں تشریف لائے تھے۔ مگر اس غلط فہمی کو بھی متی، مرقس اور لوقا کی انجیل نے بخوبی دور کر دیا۔ مندرجہ ذیل حوالہ جات ملاحظہ فرمائیے جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت یحییٰ کی بطور حضرت الیاس علیہ السلام دوبارہ پیدائش (Reincarnation) کی تصدیق کر رہے ہیں۔

And if you are willing to receive it, he is Elijah who was to come." (Matthew 11: 14)

اور اگر تم اس بات کو قبول کرنے کو تیار ہو تو یہ وہی یلیاہ ہے جو آنے والا تھا۔ (متی ۱۱:۱۴)

He said, It is John whom I beheaded; he is risen from the dead (Mark 6:14-16).

اس نے کہا یہ وہی یوحنا ہے جس کو میں نے سر بریدہ کیا تھا؛ یہ مر کے زندہ ہو گیا۔ (مرقس ۶:۱۴-۱۶)

And he (King Herod)said that John the Baptist was risen from the dead, and therefore mighty works do show forth themselves in him. Others said that it is Elijah. And others said that it is a prophet, or as one of the prophets. But when Herod heard thereof, he said, It is John whom I beheaded; he is risen from the dead (Mark 6:14-16). (Authorized King James Version).

اور اس (بادشاہ ہیرودیس) نے کہا یوحنا بپتست مر کے زندہ ہو گیا تھا، خداوندِ غالب کے کام اسی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کئی لوگوں نے کہا کہ یہ یلیاہ ہے۔ اور کئی نے کہا کہ یہ کوئی نبی ہے یا نبیوں میں سے ہے۔ مگر جب ہیرودیس نے یہ سنا تو اس نے کہا کہ یہ تو وہی یوحنا ہے جس کو میں نے سر بریدہ کر دیا تھا؛ یہ مر کے زندہ ہو گیا۔ شاہ جیمز کا تصدیق شدہ نسخہ۔ (مرقس ۶:۱۴-۱۶)

Luke (9:7-9)people thought that Jesus was John the Baptist resurrected, or a reincarnation of Elijah or one of the old prophets.

روح اصلاح اور روحانی تعمیر و ترقی کے لئے بھی دنیا میں آتی ہے اور دوبارہ پیدائش کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے بھی ہوتی ہے۔ اگر یہ مقصد کسی کی زندگی کے ایک دور میں پورا نہیں ہوتا تو روح کو دوبارہ واپس زمین پر بھیج دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات دنیا میں واپسی محدود حالات اور مختصر وقت کے لحاظ سے بھی ہوتی ہے مثلاً چھوٹی عمر اور کوئی معزوری وغیرہ۔ پیدائشِ نو کے ذریعے روح کی دنیا میں واپسی گزشتہ زندگی کے اعمال کی سزا کے لئے بھی یہ ناگزیر ہے۔ جیسے کہ اگر کسی امیر آدمی نے پچھلی زندگی میں اپنی دولت اور طاقت کا ناجائز استعمال کیا تو وہ ہوسکتا ہے کہ اگلی زندگی میں مفلوک الحال اور غریب بنا کر بھیجا جائے۔ دوبارہ پیدائش کے ذریعے روح کی دنیا میں واپسی کا حوالہ تورات کی کتاب ''روتھ'' (Ruth) یعنی رحمۃ کی آیت ۶:۱ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

بائبل کا باب نہم پیدائشِ نو کے بعد ملنے والی سزا کا حوالہ دیتا ہے۔ جب ایک اندھے کو دیکھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں نے کہا۔

Rabbi, who sinned, this man, or his parents, that he was born blind? (John 9:2)

راہب، جو اندھا پیدا ہوا، اس آدمی نے یا اس کے والدین نے کیا گناہ کیا تھا؟ (یوحنا ۹:۲)

اس اندھے نے ظاہر ہے کہ اپنی ماں کے پیٹ میں تو کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا۔ لہٰذا پچھلے جنم کے گناہوں کی پاداش میں اس شخص کو اس جنم میں سزا دی گئی۔

ہمارے مضمون سے متعلق عہدِ نامہ قدیم (Old Testament) اور عہد نامہ جدید (New Testament) کے مزید حوالہ جات حاضرِ خدمت ہیں۔

"And many of those who sleep in the dust of the ground will awake, these to everlasting life, but the others to disgrace and everlasting contempt.(Daniel 12:2)

اور جو زمین کی دھول میں سو جاتے ہیں ان میں سے بہت سے لوگوں کو ہمیشہ کی زندگی کے

لئے، جگا دیا جائے گا، لیکن دوسروں کے لئے ابدی ذلت اور توہین آمیز زندگی ہے۔(دانیال ۱۲:۲)

Psalms 16:9, 10... my flesh also shall rest in hope. For thou wilt not leave

my soul in hell..."Ecclesiastes 12:7 ...then the dust will return to the earth as it was, and the spirit will return to God who gave it.

میرا جسم بھی اس امید میں آرام سے رہے گا کہ تو جہنم میں میرے نفس کو نہیں چھوڑے گا (زبور ۱۶:۹،۱۰)۔ پھر زمین کی دھول زمین پر ایسے ہی واپس آ جائے گی جیسے کہ یہ تھی اور پھر روح اسی خدا کے پاس واپس چلی جائے گی جس نے اسے دیا تھا۔(واعظ ۱۲:۷)

"Listen, I tell you a mystery: We will not all sleep, but we will all be changed." (1 Corinthians 15:51)

سنو، میں تمہیں بھید کی بات بتاتا ہوں؛ ہم سب سوئیں گے نہیں لیکن ہم سب کو تبدیل کر دیا جائے گا۔(1 کرنتھیوں ۱۵:۵۱)

دانیال کی آیت ۱۲:۱۳ میں بھی موت کے بعد زندگی ملنے کا بیان ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

"Now go your way to the end and rest, and you shall arise to your destiny at the end of days." (Daniel 12:13)

’’اب اپنے راستے پر چلتے جاؤ آخر تک اور سکون رکھو، اور تم زندہ کئے جاؤ گے اپنی قسمت کے مطابق، زندگی کے دن پورے ہونے پر۔‘‘(دانیال ۱۲:۱۳)

go your way to the end آخر تک کوشش کرنے کے محاورے میں استعمال ہوا ہے،
rest سے مراد اطمنان رکھنے کے ہیں، destiny وہ قسمت ہے جو گزشتہ اعمال کے مطابق ہوگی۔
end of days زندگی کے دن پورے ہونے یعنی موت کے مطلب میں ہے۔

تم اپنی انتہائی کوشش کرتے رہو اور اطمنان رکھو کہ مرنے کے بعد تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق زندگی دی جائے گی۔(رواں ترجمہ)

اس کے علاوہ وحی ۷:۱۴ (Revelation 7:14) کا مندرجہ ذیل بیان بھی پیدائشِ نو کے دائرے (cycle of reincarnations) کے عمل اور تسلسل کی وضاحت کرتا ہے۔ جس کا اختتام اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ انسانی روح ترقی کرتے کرتے اپنی بلوغت کے انتہائی مقام تک نہ پہنچ جائے۔ یہ مقام مکاشفہ (Revelation) کی انجیل میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔

"These are the ones who died in the great tribulation. They have washed their robes in the blood of the Lamb and made them white.(New Living Testament, Revelation 7:14)

"These are they who have come out of the great tribulation; they have washed their robes and made them white in the blood of the Lamb.(Revelation 7:14)

یہ وہ ہیں جو بڑی مصیبت سے باہر آئے ہیں۔ انہوں نے برہ کے خون میں رنگے اپنے کپڑے دھو کے سفید کر لئے ہیں۔(وحی ۷:۱۴)

"No one can see the kingdom of God unless he is born again";(John 3:3)

کوئی بھی خدا کی بادشاہی کو نہیں دیکھ سکتا جب تک وہ دوبارہ پیدا نہ ہو۔(یوحنا ۳:۳)

مندرجہ ذیل حوالوں میں جنم کرم یعنی مکافاتِ عمل کے اس پہیئے کی مثالیں دی جا رہی ہیں جو گزشتہ زندگی کے اعمال کے حساب سے آنے والی زندگی مرتب کرتا ہے۔ اسے قسمت یا تقدیر بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے جدید نے قسمت اور مقدر کا تصور ختم کرنے کی کوشش میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں بھر دیں۔ انہیں علما کے سچے پیروکار عرصہ دراز سے ان کی کتابوں کا باقاعدگی سے درس بھی دیتے چلے آ رہے ہیں۔ مگر لوگوں پر اس درس و تدریس کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور نا ہی لوگ اس جھوٹی بات کو ماننے کے لئے تیار ہیں کہ قسمت کوئی چیز نہیں۔ لوگ بھی سچے ہیں کیونکہ وہ روزمرہ زندگی میں قسمت کا عملی مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کوئی فاقے کر رہا ہے تو کوئی سونے کے نوالے کھا رہا ہے۔ کوئی محتاج ہے تو کوئی غنی۔ کوئی تنگدستی مصیبت اور پریشانیوں میں گھرا ہے اور کسی کا گھر آسودگی اور خوشحالی سے جنت بنا ہوا ہے۔ یہ سب اصل میں پچھلے جنم کے اعمال کے ہی کرم ہیں۔ جی ہاں تقدیر ہے اور وہ باقاعدہ مرتب کی جاتی ہے۔ مگر اللہ کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرتا بلکہ بندہ خود اپنے ساتھ ظلم کر کے اپنی بری تقدیر کے لکھے جانے کا ذمہ دار ہے۔ جو اس نے کل بویا تھا وہ آج کاٹ رہا ہے۔

"The wheel of nature";(James 3:6)

فطرت کا پہیہ۔(جیمز ۳:۶)

"A man reaps what he sows";(Galatians 6:7)

کوئی شخص جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔(گلتیوں ۶:۷)

"All who draw the sword will die by the sword";(Matthew 26:52)

تلوار نکالنے والے تلوار سے ہی مریں گے۔(متی ۲۶:۵۲)

"If anyone is to go into captivity, into captivity he will go. If anyone is to be killed with the sword, with the sword he will be killed."(Revelation 13:10)

اگر کسی کو قید میں جانا ہے تو وہ قید میں ہی جائے گا۔اگر کسی کو تلوار سے مرنا ہے تو وہ تلوار سے ہی مرے گا۔(وحی ۱۳:۱۰)

LORD says: "'Those destined for death, to death; those for the sword, to the sword; those for starvation, to starvation; those for captivity, to captivity'" (Jeremiah 15,2).

خداوند کہتا ہے،جن کی قسمت میں مرنا ہے وہ مریں گے،جن پر تلوار زنی ہونی ہے وہ تلوار زَن ہوں گے،جنہیں فاقے کرنے ہیں وہ فاقے کریں گے،جنہیں قید ہونا ہے وہ قید میں ڈالے جائیں گے۔(یرمیاہ ۱۵:۲)

نیو یارک کے مشہور ناشر ادارہ بانٹم بکس(Bantam Books Publisher)نے ۱۹۸۳ء میں نامور ماہر نفسیات ڈاکٹر برائن ویز (Dr Brain Weiss) کی مشہورِ زمانہ کتاب بہت سی زندگیاں بہت سے ماسٹر(Many Lives, Many Masters)شائع کی جس کو نہ صرف نفسیاتی سائنس کے علمی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی بلکہ کتاب کے مصنف ڈاکٹر برائن نے اپنے مریضوں پر ان کی گزشتہ زندگیوں کی تحقیق وتفتیش میں کئے گئے جو تجربات اپنی کتاب میں رقم کئے ہیں ان پر کئی فلمیں بھی بن چکی ہیں۔

ڈاکٹر برائن اپنی کتاب کے صفحہ ۳۵ اور ۳۶ پر لکھتے ہیں کہ عہد نامہ قدیم(Old Testament) اور عہد نامہ جدید(New Testament) میں دو بارہ پیدا ہونے (Reincarnation) کے بارے میں وحی کئے گئے حوالہ جات بدرجہ اتم موجود تھے جو ۳۲۵ عیسوی میں سلطنت روم کے شہنشاہِ اعظم قسطنطین (Constantine) نے اپنی ماں ہلینا(Helena) سے مل کر عیسائیوں کے موجودہ نئے عہد نامے سے نکال کے عیسائیت کو روم کا سرکاری مذہب قرار دے دیا تھا۔اور ۳۵۵ عیسوی میں منعقد ہونے والے قسطنطنیہ کی مجلسِ شوریٰ (The Council of Nicea) کے دوسرے اجلاس میں شہنشاہ کے اس عمل کی توثیق کرتے ہوئے پیدائشِ نو(Reincarnation) کو عیسائیت میں بدعت (heresy) قرار دیدیا گیا۔لہٰذا اصل بائبل کے متن کی رو سے دوبارہ پیدائش (Reincarnation) کے بیانات تو انجیل میں جوں کے توں موجود رہے مگر کلیسا کی مجلس المسکونی(Ecumenical Council) نے بائبل کے ترجمے اور تفسیر سے ان بیانات کو خارج کر دیا۔کلیسا کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان نے کلیسا کے نظریات کو مستحکم کرنے کے لئے بائبل کی دوبارہ پیدائش والی تعلیم کے خلاف رائے دہی دے کر اسے روک دیا اور اس سے متعلقہ تعلیمی مواد کو بھی کالعدم قرار دے کر بحقِ کلیسا ضبط کر لیا۔اس کے بعد کلیسا اور حکومتِ وقت کی ملی بھگت سے اس دور کا آغاز ہوا جب پیدائشِ نو(Reincarnation) کی تعلیم دینے والوں کو سزائے موت دی جانے لگی۔راست باز علماء کو سیاسی دباؤ اور طاقت کے زور پر خاموش کر دیا گیا اور بارہویں صدی عیسوی تک حالت ایسی ہی رہی۔جس کے بعد یہ غلط عقائد ہی عیسائیوں کا موجودہ ایمان بن گئے۔

کارل یونگ(Carl Jung)اسگمنڈ فرائیڈ(Sigmund Freud)،ہینری فورڈ (Henry Ford)،چارلس لینڈبرگ(Charles Lindbergh)،ولیم ییٹس(William Yeats)،ایڈگر کائس(Edgar Cayce)اور النور روز ولت (Eleanor Roosevelt) جیسے دورِ حاضر کے غیر متعصب اور علمی بصیرت رکھنے والے قابل مفکرین نے پیدائشِ نو کی تعلیمات کی نشاطِ ثانیہ اور ترویج کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔جس سے عیسائیت کے اعتقاد میں توفی الحال کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی کیونکہ کلیسا والے ہمارے مولویوں کی طرح اپنے مسلک پر ڈٹے ہوئے ہیں مگر پیدائشِ نو(reincarnation) کے بارے میں عوام الناس میں آگاہی ضرور دیکھی گئی اور یہ موضوع محفلوں اور رسمی وغیر رسمی گفتگو میں بھی زیر بحث آنے لگا ہے۔ایک حالیہ سروے کے مطابق مغربی ممالک بشمول امریکہ کے ۳۳ فیصد اور مشرقی یورپ کے ۴۰ فیصد عیسائی پیدائشِ نو (reincarnation) پر یقین رکھتے ہیں جو آخرت پر ایمان لانے کی مد میں یقیناً خوش آیند بات ہے۔کیونکہ قرآن خود کہتا ہے کہ اللہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو کوئی خوف وحزن

نہیں ہوتا۔خواہ وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا زرتشی (دیگر مذاہب کے ماننے والے) ہوں۔ (البقرہ:۶۲)

امریکی ریاست ورجینیا کی میڈیکل یونیورسٹی کے پچاس سال تک چیئر مین رہنے والے ماہرِطب، نیویارک کی کورنیل میڈیکل یونیورسٹی، (Cornell University)، لوئسیانا اسٹیٹ یونیورسٹی (Louisiana State University) اور لاس اینجلس کی ٹیولین میڈیسن یونیورسٹی (Tulane University of Medicine) کے رئیس الجامعہ (dean of university) اور حیاتیات، بائیوکیمسٹری، ادویات، دماغی امراض، طب الباطنی، نفسیاتی امراض اور دیگر طبی مضامین پڑھانے کے استاد، سائنس کی تحقیقی سوسائٹی کے بانی، تین سو سے زائد تحقیقی مقالوں اور پیدائشِ نو (Reincarnation) پر دو ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل چالیس معروف کتابوں کے مصنف، طبی تحقیق اور ریسرچ میں بین الاقوامی شہرت کے حامل پروفیسر ڈاکٹر آئن سٹیونسن (Ian Stevenson) کے خیال میں عیسائیت اور اسلام کے علاوہ دنیا کے تقریباً سبھی مذاہب پیدائشِ نو (Reincarnation) میں یقین رکھتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے علمِ اسباب المراض پر اپنی کتابوں میں پیدائشی نشانوں (Birthmarks) اور پیدائشی نقائص (Birth Defects) پر سیر حاصل بحث کی ہے جس میں انھوں نے طبی سائنس کی رو سے ثابت کیا ہے کہ ہمارے جذبات (emotions)، یادیں (memories)، اور حتیٰ کہ گزشتہ زندگیوں میں پیش آنے والے حوادث کی وجہ سے لگنے والی جسمانی چوٹیں (physical injuries) تک ایک زندگی سے دوسری زندگی میں منتقل ہوتی ہیں۔ کسی انسان میں کوئی مخصوص صلاحیت، کلا، آرٹ، فن یا قابلیت نہ تو موروثی ہوتی ہے اور نا ہی کسی ماحول کے مرہونِ منت ہوتی ہے۔ بلکہ روح جب ایک جسم کی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر کسی نئے جسم میں جاتی ہے تو وہ پچھلی شخصیت کے نقوش بھی نئی زندگی میں اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ پروفیسر سٹیونسن نے نیویارک اسپتال میں نفسیاتی مریضوں کا علاج کرتے ہوئے یہ دریافت کیا کہ ان کے مریضوں میں ذہنی تنا اور ڈپریشن کے اثرات ان کی پچھلی زندگیوں سے وابستہ تھے جو بڑھتے بڑھتے فشارِ خون (High Blood Pressure) اور سانس کے امراض میں تبدیل ہو گئے۔ امریکی ریاست اریزونا کے سینٹ جوزف اسپتال میں بھی مریضوں کو اندرونی امراض (internal disease) کی ادویات دیتے ہوئے اسی قسم کے تجربات ہوئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر موصوف نے نہ صرف امریکہ بلکہ ہندوستان اور دنیا کے دیگر ممالک میں جا کر سینکڑوں مریضوں پر تحقیق کی جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ بہت سی دائمی بیماریوں، جسمانی معذوریوں، ڈپریشن اور ذہنی تنا کا تعلق کسی انسان کی گزشتہ زندگی سے ہوتا ہے نہ کہ موروثیت یا ماحول سے۔ پروفیسر ڈاکٹر آئن سٹیونسن کی کتابوں اور مقالات کا مطالعہ کر کے پیدائشِ نو (Reincarnation) کی حقیقت کو سائنس اور طب کی روشنی میں بخوبی جانا جا سکتا ہے۔ اگر وقت اجازت دے تو آئن سٹیونسن کی کم از کم ایک کتاب ''حیاتیات اور پیدائشِ نو'' (Biology and Reincarnation) کا مطالعہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

علمِ حیاتیات اور طبی سائنس کے مطابق ڈی این اے (DNA) کے ترکیبی تسلسل میں جنیاتی تحویل (Gene Mutation) کی وجہ سے جو مستقل تبدیلی واقع ہوتی ہے وہ ہمارے جین بناتی ہے۔ ہر انسان میں جنیاتی تحویل دو طرح سے ہوتی ہے۔ جن میں سے ایک تو ماں باپ کے کروموسوم سے ہوتی ہے جسے جین کی موروثی تحویل یا سلال الجرثومی کہتے ہیں۔ دوسری تحویلات (Mutations) صرف بیضہ (Egg) یا صرف نطفہ یعنی الخلی المنوی (sperm cell) میں زرخیزی (Fertilisation) کے فوراً بعد واقع ہوتی ہیں جن کو نئی تحویلات (De Novo Mutations) کہتے ہیں۔ یہ نئی اور باہر سے آئی ہوئی جنیاتی تحویل بھی والدین کی طرف سے آئی ہوئی موروثی تحویل کے ساتھ ساتھ بچے کے تمام خلیات میں پائی جاتی ہے۔ نومولود کے خلیات میں ان اضطرابات (Disorders) کا تعلق موروثیت یا کسی قسم کے خاندانی پس منظر (Family History) سے بالکل نہیں ہوتا اور نا ہی یہ نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ انسان نے ایک عرصے تک یہ مفروضہ قائم کر رکھا تھا کہ انسانی خلیوں میں مذکورہ پراثر نئی جنیاتی تحویل ماحول اور سورج کی غیر مرئی قوتوں کی بدولت ہوتی ہے جس میں سورج سے آنے والی بالائے بنفشی تابکاری (ultraviolet radiation) اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مگر موجودہ دور میں جنوم (Genes) پر ہونے والی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زیرِ بحث بیرونی جین (Muted Genes) نہ ماں باپ سے وراثت میں آتے ہیں اور نا ہی کوئی خاندانی پس منظر رکھتے ہیں بلکہ ان میں گزشتہ زندگی کے نقوش ثبت

(Record) ہوتے ہیں جنہیں نئی زندگی اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتی ہے اور یہ ایک برقیرے (Electronic Chip) کی طرح پہلے سے ریکارڈ شدہ پروگرام اور گزشتہ زندگی میں کئے جانے والے اعمال کے اثرات نئی زندگی میں منتقل کرتے ہیں۔

اہلِ نصاریٰ کے جانے مانے پادری، عیسائی مذہب کے ممتاز عالم، امریکہ کی کیلیفورنیا یونیورسٹی کے رئیسِ فلسفہ، ادبی رائل سوسائٹی کے رکن، غیر خیالی (non-fiction) یعنی سچی اور حقیقت پر مبنی تحریروں کے ادبی مقابلے میں امریکی ریاست کیلیفورنیا سے گولڈ میڈل پانے والے پروفیسر گڈیز مک گریگر (Geddes MacGregor) اپنی کتاب ''عیسائیت میں پیدائشِ نو'' (Reincarnation in Christianity) میں لکھتے ہیں کہ پیدائش نو کے بارے میں عیسائیوں کا روایتی عقیدہ مذہبی کتابوں کے نظریات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پروفیسر موصوف نے پیدائشِ نو کے نظریئے کی صداقت پر زور دیتے ہوئے عیسائی سوچ میں پیدائشِ نو کے کردار کا نیا تصور پیش کیا جو الہامی کتابوں سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ پروفیسر گریگر مزید لکھتے ہیں کہ دس سال قبل عیسائیوں کے کسی بڑے عالم نے انہیں تورات کی کتاب پیدائش کے اولین اصولوں کے لاطینی اور یونانی نسخہ جات اس درخواست کے ساتھ بھیجے کہ ان پر غور فرما کر یہ بتائیے کہ دونوں میں سے کونسا صحیح ہے۔ کیونکہ دونوں کا بیان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ جب دونوں نسخوں پر غور و خوض کے بعد پروفیسر گریگری نے اس عالم کو پیدائشِ نو کی حقیقت اور لاطینی زبان میں کئے گئے غلط ترجمہ اور تفسیر کی تفصیل لکھ کر بھیجی تو وہ اسے پڑھ کر سکتے میں آ گیا اور اس ڈر سے کہ اگر یہ تفصیل منظر عام پر آ گئی تو کہیں عیسائیت کی روح نہ زخمی ہو جائے اس عالم نے وہ رپورٹ ہمیشہ کے لئے اپنی دراز میں بند کر دی۔ کیونکہ اس بات کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ پال (Paul) کے زیر اثر عیسائیت کے ابتدائی ادوار میں مذہبی تعصب کی بنا پر کلامِ الٰہی کا لاطینی زبان میں گمراہ کن ترجمہ کیا گیا تھا جس کے اثراتِ بد نے عیسائیت کو مذہب کی اصل تعلیم سے دور کر دیا۔ سینٹ جیروم (St. Jerome) کے خطوط میں سے خط ۱۲۴ جو اس نے مغربی روم کے حکمران اویطس کو لکھا تھا اس میں سینٹ جیروم نے اس بات کو خاص طور پر واضح کیا تھا کہ یونانی سے لاطینی میں ترجمہ کرتے وقت **قبل الوجود** (pre-existence)، **المبادئالأولی** (First Principles) اور پیدائش کے بیانات تبدیل کر کے ان کا غلط ترجمہ کیا گیا ہے۔ سینٹ جیروم کا خط اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں کلیسا کی سازشوں سے پہلے پیدائشِ نو (reincarnation) کی تعلیم کتابِ مقدس کے مطابق دی جاتی تھی۔ یاد رہے کہ اویطس عیسائیوں کی تاریخ میں وہ شخصیت ہے جس نے روم کی ثقافت اور عیسائیت کے مشکل وقت میں ان کے لئے اپنا انتہائی ساز گار اثر و رسوخ استعمال کیا۔ دنیا کے مشہور و معروف دانشور اور علمی اعتبار سے جانی مانی ہستیاں اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئیں کتابوں کو سمجھ کر پڑھنے اور ان میں غور و فکر کرنے کی وجہ سے پیدائش نو (Reincarnation) پر مشتمل آخرت پر یقین رکھتے تھے۔ معروف عیسائی عالم طرطولین (Tertullisn) اپنی کتاب **رسالہ علی الروح** (Treatise on the soul) کے باب ۳۳ میں پیدائشِ نو (reincarnation) پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مشہور ریاضی دان فیثا غورث بھی پیدائش نو پر یقین رکھتا تھا۔

عیسائیوں کی پہلی تین صدیوں کے دوران نئے جسم میں تناسخِ ارواح (Transmigration of souls) کا یونانی فلسفہ عیسائیت پر نمایاں طور پر چھایا رہا جو تاریخ میں افلاطونی نظریات (Platonism) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مشرق کے روحانی فلسفہ کے برعکس افلاطون کا خیال تھا کہ روح انسانی موت کے بعد عالم ارواح میں اپنے شعور اور ذاتِ منفردہ کے طور پر ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اور ہندو عقیدے کے برعکس انسانی روح نا تو خدا بنتی ہے اور نا ہی وہ کسی اور طریقے سے اپنے وجود کا اظہار کر سکتی ہیں۔ بلکہ نئے جسم میں پیدا ہو کر دوبارہ دنیا میں آ جاتی ہیں۔ افلاطون اپنی زرنگ یعنی عقلی یاداشتوں (Phaedrus) میں لکھتا ہے کہ اگر کوئی روح احکام الٰہی پر عمل پیرا نہیں ہوتی اور سچائی کا ادراک کرنے میں ناکام رہتی ہے تو اس غفلت اور گناہ کی وجہ سے وہ مصیبتوں کے دگنے بوجھ تلے دب کر کچلی جاتی ہے جس سے اس کی پرواز کرنے کی صلاحیت چھن جاتی ہے اور وہ الٹے منہ زمین پر پٹخ دی جاتی ہے۔ روح اپنی پیدائش کے عمل سے گزرنے کے بعد قانونِ الٰہی کے تحت جب دوبارہ زندگی پاتی ہے تو وہ عام طور پر کسی جانور کے جسم میں نہیں جاتی بلکہ اسے انسانی جسم ہی عطا کیا جاتا ہے۔ اور وہ روح جس نے سچائی کا راستہ اختیار کیا تھا اس کی پیدائش بطور فلسفی یا کسی بھی آرٹ، کلا اور پیشہ کے ماہر فن مثلاً ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، قانون دان، ادیب، استاد،

عالم وغیرہ اور ہنستی گاتی خوش طبع شخصیت کے ہوتی ہے۔

Plato writes in Phaedrus about this:

"But when she (the celestial soul)is unable to follow, and fails to behold the truth, and through some ill-hap sinks beneath the double load of forgetfulness and vice, and her wings fall from her and she drops to the ground, then the law ordains that this soul shall at her first birth pass, not into any other animal, butonly into man; and the soul which has seen most of truth shall come to the birth as a philosopher, or artist, or some musical and loving nature".

افلاطون مزید لکھتا ہے کہ ایک عام روح کو جہاں سے وہ چلی تھی واپس اسی جگہ پہنچنے میں دس ہزار سال لگتے ہیں۔صرف فلسفی اور مقرب لوگ ہی کم وقت میں اپنے اصلی مقام پر واپس پہنچتے ہیں۔جو روحیں مقصدِ حیات کی تکمیل نہیں کر پاتیں اور جہالت میں زندگی گزار دیتی ہیں ان کی دنیاوی موت کے بعد فیصلہ کر کے سزا تعین کی جاتی ہے اورانہیں اصلاح کے لئے زمین کے نچلے درجے کے گھروں میں بھیج دیا جاتا ہے۔

In the same work, Plato statesthat "ten thousand years must elapse before the soul of each one can return to the place from whence she came." Only the soul of the philosopher or of the lover can get back to its original state in less time (i.e., in three thousand years). The souls that fail to aspire to perfection and live in ignorance are judged after their earthly life and then punished in "the houses of correction, which are under the earth."

افلاطون کے خیال میں روحانی تطہیر کے لئے زندگی کا ایک دور کافی نہیں اس لئے گناہ اوراس کے بدلے میں ملنے والی سزائے قید کی نوعیت کے اعتبار سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ درندہ صفت انسانوں کو ان کے برے اعمال کے بدلے میں جانور کی زندگی دے دی جائے اور ایک خاص مدت کی قید کاٹنے کے بعد یہ روحیں جانور سے واپس انسانی جسم میں دوبارہ پیدا ہوں اور باقی کی سزا بطورِ انسان اس وقت تک بھگتیں جب تک ان کی مکمل تطہیر نہیں ہو جاتی۔روح کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے پیدائشِ نو(reincarnation) کا یہ افلاطونی نظریہ اگرچہ حیات وممات کے بے شمار ادوار پر مشتمل ہے مگر اس نظریئے میں روح کے سفر کا آخری مقام برہمن کے نظریہ اتحاد بالمطلق (union with the Absolute) کے برعکس ہر روح کا بذات خود اپنا ایک الگ پاکیزہ وجود ہے۔لہٰذا، افلاطون روح کی نجات(salvation) کو انسان کی ذاتی بخشش کے طور پر لیتا ہے نہ کہ خدا کے وجود میں جا ملنے کو۔

کلیسا کے بالکل ابتدائی دور میں افلاطون کے مندرجہ بالا نظریات کی چھاپ اور پیدائشِ نو کے بارے میں الہامی کتابوں میں دی گئی تعلیم وہ مصدقہ اوران مٹ تاریخی شواہد ہیں جنہیں کسی طور پر بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ پیدائشِ نو کے نظریات میں تبدیلی عیسائی مذہب کے بانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حکم پر یا نزولِ وحی کے سر پر نہیں کی گئی کیونکہ اس وقت تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا سے رخصت فرما چکے تھے۔لہٰذا عیسائیت میں یہ تباہ کن تبدیلی پال(Paul) کی پیدا کردہ سیاسی وجوہات کی بنا پر کی گئی جس کو ۳۵۵ء میں قسطنطنیہ کی مجلسِ شوریٰ کی منظوری سے عیسائیت میں داخل کیا گیا۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد پال(Paul) نے ان کی شریعت میں نبی ہونے کا خود ساختہ مقام حاصل کر لیا اور آج بھی عیسائی اس ملعون کو نبی بشریعت مسیح کا درجہ دیتے ہیں۔جس نے عیسائیوں کو بے وقوف بنانے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اتنی محبت دکھائی کہ ان کو اوپر خدا اور زمین پر خدا کا بیٹا بنا دیا۔کلامِ الٰہی کے تراجم میں تبدیلی اوراس کے استعارات (Metaphors) کی خود ساختہ تشریح بھی مذہب کی دنیا(Theology) میں پہلی بار اسی مردود نے کی۔انجیل کی مختلف آیات کے ٹکڑوں کو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں ملا کر اور وحی کے مختلف الفاظ کے معانی اپنے نظریات کے مطابق ڈھال کر تفسیر لکھنے کی طرح بھی اسی کم بخت نے ڈالی۔کائنات کا نظام چلانے والی طاقت خدا کی بجائے قوانین الطبیعیہ (Natural Laws and Natural Forces) کی اصطلاح بھی اسی کی ایجاد ہے۔جس کی تقلید میں ہمیں بھی خدا کی ذات کو اٹھا کر ایک طرف رکھنے کا درس دیا جانے لگا اور رب العالمین کے نام کی جگہ روزگارِ کائنات چلانے والی ''کائناتی قوتوں'' نے لے لی۔مرنے کے بعد قیامت تک ٹھاٹھ سے سونے اور روزِ قیامت مرقد سے اٹھ کر نجات حاصل کرنے کی جیسی اختراعات نکالنے کا سہرہ بھی اسی کے سر ہے۔اسی کی نقل میں ہم میں سے بھی بعض لوگ درسِ قرآن میں اعلانیہ طور پر یہ کہنا شروع ہو گئے کہ

قرآن میں جہاں کہیں بھی اللہ کا نام آیا ہے اس کی جگہ .قانون کا لفظ لگا کر قرآن کو سمجھا جائے۔

مگر افسوس صد افسوس کہ ہمارے علما نے اسی مردود پال کی تقلید میں قرآن کے تراجم اور تفسیریں لکھ دیں۔ ہم نے اپنے علما کی تحریریں پڑھنے سے پہلے اگر پال اور پوپ کو پڑھ لیا ہوتا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نتھر کے سامنے آ جاتا اور یہ جاننے میں بالکل بھی دیر نہیں لگتی کہ ہمارے علما نے اپنے غور و فکر کو استعمال کر کے خود سے کوئی تحقیقی کام نہیں کیا بلکہ ہمیں مرغوب کرنے کے لئے پال اور پوپ کو پڑھ کر انہیں کے نظریات سے اپنی کتابیں بھر دیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے مسیح الموعود بننے کا خیال بھی پال سے چرایا کیونکہ پال ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے اپنے آپ کو نبی بشریعتِ مسیح کہلایا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے فارورڈ بلاک (Forward Block) کے سبھی چھوٹے بڑے علماء اسی کی نقل کر کے ادبی سرقہ بازی میں ملوث رہے۔ کوئی ایک بھی ایسا نام نہیں جس نے قرآن کے ترجمے یا تفسیر کا کام عین قرآنی تعلیمات کے مطابق کیا ہو۔ حیات و ممات کے قدرتی نظام کو سمجھے بغیر کامل انصاف اور احتساب کا موجودہ تصور بے معنی ہے۔ اسی لئے آخرت کے اس نظام کو ایمان کا لازمی حصہ بنایا گیا جس پر یقینِ کامل کئے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ ایمان ہی مکمل نہ ہوا تو کردار کیا درست ہوگا اور پھر صراطِ مستقیم کہاں جانے کے لئے ملے گا کیونکہ منزل تو ہمیں معلوم ہی نہیں!

حقیقتِ آخرت کے بارے میں سائنس اور منطق سے علمی دلائل دیئے جائیں تو جواب آتا ہے کہ ''یہ قرآن میں نہیں'' اور اگر قرآن سے ہی ثابت کیا جائے تو ''میں نئی بول دی میرے وچہ میرا یار بول دا'' کے مصداق ان آیات کا حوالہ دے کر جن میں کچھ اور کہا جا رہا ہے، قرآن کو صرف قرآن سے ہی سمجھنے کے واعظ مقرر کے ساتھ یہ بھی دھرایا جاتا ہے کہ فلاں صاحب نے آخرت کے بارے میں کیا کہا اور فلاں صاحب نے فلاں کتاب میں کیا لکھا۔ یہ کیسے ''خالص قرآن'' کی بات ہو رہی ہے جس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ادھر ادھر سے اکٹھے کئے ہوئے غیر قرآنی مواد کے منوں اور ٹنوں کے حساب سے حوالے دیئے جاتے ہیں؟ جب قرآن سے پہلے نازل کی ہوئیں کتابوں سے حوالہ جات پیش کئے جاتے ہیں تو دوٹوک جواب آتا ہے کہ ان کتابوں کو تو ہم مانتے ہی نہیں! سمجھ میں نہیں آتا کہ کس قرآن کی بات ہو رہی ہے؟ کم از کم یہ لوگ اس قرآن کی بات تو نہیں کرتے جو محمدِ عربی ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ اس میں تو آخرت پر ایمان لانے اور قرآن سے پہلے اللہ کی نازل کردہ کتابوں پر بھی ایمان لانے کے احکام موجود ہیں۔ البتہ اگر ہم یہ سوچ کر ان کتابوں کو رد کر چکے ہیں کہ بے شمار ترامیم اور تبدیلیوں کی وجہ سے یہ کتابیں اب وہ نہیں رہیں جن پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا تھا تو بھی ہم غلطی پر ہیں کیونکہ ان کتابوں میں جو بھی مبینہ تبدیلیاں ہوئیں تھیں وہ سب عیسائیت کے دورِ اوّل میں زمانۂ نزولِ قرآن سے بہت پہلے کی باتیں ہیں اور ہمارا علم اللہ سے زیادہ نہیں جس نے پھر بھی ان کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا۔ نزولِ قرآن کے بعد ان کتابوں کے تراجم ضرور بدلے ہوں گے مگر متن نہیں بدلا جس سے ان کتابوں کی اصل حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاریخ گواہ ہے اور اہلِ علم بھی جانتے ہیں کہ یہ کتابیں نزولِ قرآن کے وقت بھی ایسی ہی تھیں جیسی آج ہیں۔ بلکہ جب قرآن نازل ہوا تو یہی بائبل مکہ مکرمہ میں بھی موجود تھی۔ جی ہاں انجیل پر ایمان لانے کا حکم دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بہت بعد ان کے شاگردوں نے لکھی مگر ہم پھر بھی اس پر ایمان نہیں لاتے اور سوچتے ہیں کہ یہ کیسی وحی ہے جسے کسی نبی نے کاتبینِ وحی کو اپنے سامنے بٹھا کے نہیں لکھوایا؟ کیونکہ ہماری سوچ ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی ہے اور ہم یہ سوچتے ہی نہیں کہ ہر زمانے کا ایک اپنا ماحول ہوتا ہے جس میں ہر کام اس زمانے کے حالات کے مطابق سرانجام دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن حالات میں دنیا سے رخصت ہوئے تھے ان حالات میں وحی کی کتابت ان کے بعد ہی ممکن تھی۔ جو کہ ضروری نہیں کہ غلط ہی ہو کیونکہ کلامِ الٰہی کے حفاظ ہر دور میں رہے ہیں جنہوں نے اللہ کی وحی کو سینہ بسینہ اور لفظ بلفظ آگے پہنچایا۔ یہ کلام اللہ ہے کوئی بخاری کی روایتیں نہیں جن پر ہم جھٹ سے فتویٰ صادر کر دیں کہ دادا سے پوتے تک بات پہنچتے پہنچتے اس میں فرق آ جاتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نبیِ کریم محمد ﷺ کے دور کے حالات گزشتہ انبیا علیہ السلام کے ادوار سے قطعی مختلف تھے جن کا بہترین استعمال کرتے ہوئے انھوں نے کاتبینِ وحی سے قرآن لکھوا کر اپنی حیاتِ مبارک میں ہی کتابی شکل میں محفوظ کر لیا تھا۔ ہم صرف انجیل پر ہی شبہ کیوں کریں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تورات اور زبور کی بھی کسی کو کچھ خبر نہیں کہ انہیں کس نبی علیہ السلام نے کب اور کونسے کاتبینِ وحی کو اپنے سامنے بٹھا

کے لکھوایا تھا؟۔اہلِ کتاب کے مذکورہ مجموعات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے نازل کئے ہوئے کچھ صحائف بھی شامل ہیں۔وہ کس نے لکھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وحی کا کتنا حصہ خود لکھا اور کتنا ان کے بعد لکھا گیا؟ مگر پھر بھی ۶۱۰ اور ۶۳۰ عیسوی کے دوران نازل ہونے والے قرآن میں ان کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دے دیا گیا۔اور انبیا علیہ السلام پر نازل کی ہوئیں کتابوں کی تصدیق کر کے انہیں ہمارے ایمان کا حصہ بنا دیا گیا۔جس طرح مختلف انبیا علیہ السلام کے درمیان تخصیص خالصتاً ان کی ذمہ داریوں اور استطاعت کے لحاظ سے کی گئی اور ان کی عزت و توقیر میں فرق نہ رکھنے کا حکم دیا گیا بعینہٖ ان جلیل القدر انبیا علیہ السلام کو دی گئیں کتابوں کو ماننے کا حکم بھی واضح طور پر دیا گیا ہے۔قرآن ان کتابوں کو رد نہیں کرتا بلکہ ان کی تصحیح کرتا ہے۔لہٰذا، اب انسان کا کام ہے کہ ان کتابوں کو قرآن کی روشنی میں غلطیوں سے پاک کر کے سنبھال لے۔المیئے کا مقام ہے کہ نہ تو اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ ہی ان کتابوں کو سمجھ کر آخرت کی حقیقت جاننے کے لئے تیار ہیں اور نا ہی امتِ مسلمہ۔جبکہ قرآن، انجیل، تورات، زبور اور اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے قرآن سے پہلے نازل کئے ہوئے تمام صحیفوں میں آخرت کا بیان پیدائشِ نو کی تکرارِ کے تسلسل کے ساتھ آ رہا ہے۔

قارئینِ کرام ہم شروع میں تورات (Torah) کی آیات کا مطالعہ کر چکے ہیں جن میں پاتال یا شیول (sheol) کے لفظ سے زمین پر قائم ہونے والی دوزخ یا اس جہنم کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں بداعمال لوگوں کو ان کی موت کے بعد سزا کے طور پر بھیجا جاتا ہے۔جب وہ لوگ سزا بھگت کر دوبارہ واپس جاتے ہیں تو پھر نئے سرے سے ان کا حساب کتاب ہوتا ہے جس کے مطابق ان کی آنے والی زندگی مرتب ہوتی ہے۔بعینہٖ کتاب الوحی کے حصہ اول میں جنتی روحوں کو سفید لباس (White Robes) دیئے جانے کا مطلب انہیں آئندہ خوش بخت زندگی دیا جانا ہے۔اگر موت کے بعد کوئی دوبارہ زندہ ہی نہیں کیا جائے گا تو مندرجہ ذیل وحی میں بیان کی ہوئی امارت اور اعلیٰ لباس با ہم پہچانے کا کوئی مطلب نہیں۔

Then each of them was given a white robe, The Book of Revelation 6:11

پھر ان میں سے ہر ایک کو سفید لباس دیا گیا تھا۔(کتاب الوحی ۶:۱۱)

He who overcomes will, like them, be dressed in white. Revelation3:5

جو اپنے نفس پر قابو پا لیتا ہے، ان لوگوں کی طرح، سفید لباس میں ملبوس کیا جاتا ہے۔مکاشفہ (وحی ۳:۵)

I counsel you to buy from me gold refined in the fire, so you can become rich; and white clothes to wear۔Revelation 3:18

میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں آگ میں نکھرا ہوا سونا مجھ سے خریدنے کے لئے، تاکہ تم دولت مند بن سکو اور سفید کپڑے پہن سکو۔(وحی ۳:۱۸)

مندرجہ بالا آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنت اور دوزخ ہمارے اعمال کے نتیجے میں زمین پر ہی قائم ہوتی ہیں اور وحی کی مندرجہ ذیل آیت ۲۰:۶ اور ۲:۱۱ میں یہ بتا دیا گیا کہ قیامت جسے ہمارے غیر قرآنی عقائد نے ہم سے بہت دور کر دیا وہ ہمارے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی قائم ہو جائے گی۔

Blessed and holy are those who share in the first resurrection. The second death has no power over them, but they will be priests of God and of Christ and will reign with him for a thousand years.Revelation 20:6

مبارک اور مقدس ہیں وہ لوگ جو پہلی قیامت میں حصہ لیتے ہیں۔دوسری موت ان پر کوئی اختیار نہیں رکھتی، کیونکہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے ہوں گے اور مسیح کے اور اس کے ساتھ ہزار سال تک راج کریں گے۔(وحی ۶:۲۰)

Whoever has ears, let them hear what the Spirit says to the churches. The one who is victorious will not be hurt at all by the second death.(Revelation 2:11)

جس شخص کے کان ہیں وہ سن لے روح المقدس کلیسا والوں سے کیا کہتا ہے۔کامیاب شخص کو دوسری موت کی تکلیف نہیں دی جائے گی۔(وحی ۲:۱۱)

قارئین کرام قرآنِ کریم کی سورالدخان کی آیت: میں بھی وحی کی مندرجہ بالا آیت ۴۴:۵۶ کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ پرہیزگار لوگوں کو پہلی موت کے سوا کوئی اور

موت نہیں آئے گی۔ یعنی ان کے لئے قیامت ان کی پہلی موت کے بعد ہی قائم ہو جائے گی اور جو لوگ راست بازی اور پرہیز گاری کے مقررہ معیار پر پورے نہیں اتریں گے ان کے لئے کئی اموات اور ہر موت کے بعد نئی قیامت ہوگی۔ لہٰذا، قیامت کا کوئی ایک دن مقرر نہیں اور نہ ہی یہ ہمارے موجودہ عقیدے کے مطابق کسی غیر معینہ مدت تک ٹالی جائے گی۔ قیامت کا مطلب تو کسی عمل کے قائم ہونے (to establish something) سے زیادہ کچھ نہیں مگر افسوس کہ ہم صرف لفظ ''قائم ہونے'' کا ہی ڈھنڈورہ پیٹے جا رہے ہیں لیکن جو کچھ قائم ہوگا اس کی بات ہی نہیں کرتے ماسوائے اس کے کہ اس دن پہاڑ روئی کے گالے بن کر اڑ جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا، چاند بے نور ہو جائے گا اور سورج بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہ تو موت کے وقت حالتِ نزع میں انسان کی اندونی کیفیات کا بھی اشارہ ہے اور اس سے یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ روح اور جسم کا موجودہ مجموعہ (combination) جو حالتِ نزع میں ہے وہ اس موت کے بعد نہ تو یہ سورج دیکھے گا نہ چاند۔ نا ہی یہ آسمان دیکھے گا اور نا ہی یہ زمین اور اس پر موجود پہاڑ۔ یعنی روح اور جسم کے ملاپ سے ملنے والی اس زندگی کا سورج ڈوب رہا ہے۔ دنیا میں اس شخص کی حیثیت، مرتبے اور شان و شوکت کا چراغ (چاند) بھی بجھ رہا ہے۔ اس شخص کے زمین پر کھڑے کئے ہوئے محلات اور بلند و بالا عمارتیں زمین بوس ہو رہی ہیں۔ آج غرور و تکبر کے سب پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے کیونکہ واپسی کی سواری تیار ہے۔ اعمال اچھے ہوئے تو اگلے جنم میں غم کے دن ختم ہو جائیں گے ورنہ ہمیشہ کے لئے یعنی اگلے جنم کی پوری زندگی میں غموں اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہیں گے۔ حالتِ نزع میں جب ان سب باتوں کا احساس ہوتا ہے تو انسان بڑبڑاتا ہے کہ اگر اس کی جان بخش دی جائے تو واپس جا کر وہ ایسے کام نہیں کرے گا جن کی وجہ سے وہ آج مصیبت میں گرفتار ہے۔ قرآن ان کی اسی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ فقط بڑبڑا رہے ہیں۔ آج کچھ بھی ان کے کام نہیں آئے گا۔ قرآن اور اس سے پہلے نازل کی ہوئیں کتابوں میں ایسے حوالہ جات جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی ضمن میں یسعیاہ کی مندرجہ ذیل آیات ۲۰-۱۹:۶۰ ملاحظہ فرمایئے۔

The sun will no more be your light by day, nor will the brightness of the moon shine on you, for the LORD will be your everlasting light, and your God will be your glory. Your sun will never set again, and your moon will wane no more; the LORD will be your everlasting light, and your days of sorrow will end. (Isaiah 60:19-20)

اس دن سورج کی روشنی تم پر ماند پڑ جائے گی، چاند تم پر بے نور ہو جائے گا، ہمیشہ رہنے والی روشنی تمہارے رب کی ہی ہوگی اور تمہارے خدا کا جلال باقی رہے گا۔ تمہارا سورج دوبارہ قائم نہیں ہوگا اور تمہارے اندر چاند کے اتار چڑھاؤ کا احساس جاتا رہے گا، اور تمہارے غم کے دن ختم ہو جائیں گے۔ (یسعیاہ ۲۰-۱۹:۶۰)

قارئینِ کرام جیسا اوپر بتایا جا چکا ہے کہ لفظ قیامت کسی چیز کے قائم ہونے کا نام ہے جس میں رونما ہونے والے واقعات کا سلسلہ موت سے شروع ہو کر حساب کتاب اور اس کے مطابق اسی روح کو نئے جسم کے ساتھ دوبارہ زندگی ملنے تک چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کو یوم المبعوث یعنی دوبارہ پیدا ہونے کا دن بھی کہا گیا ہے۔ مگر قرآنی یوم المبعوث کو عیسائیوں کی نقل میں ہمارے مترجمین نے بھی انگریزی تراجم میں ریسرکشن (Resurrection) ہی کہا ہے جسے عیسائیوں کے نظریئے کی رو سے دیکھیں گے تو ہمارے علماِ کرام کے علم کی بھی قلعی کھل جائے گی اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ریسریکشن اصل میں ہے کیا؟ مگر افسوس بھی ہوگا کہ ہم قرآن کے تراجم میں یہ لفظ استعمال کر کے نا سمجھی میں شرک جیسا گناہِ عظیم کیوں کرتے رہے؟ ہمارے علما لاکھ صفائی دیں کہ اس لفظ سے ہم وہ مراد نہیں لیتے جو عیسائی لیتے ہیں۔ یہ بات ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی یہ کہے کہ شرک ہم بھی کرتے ہیں مگر ایسا نہیں کرتے جیسا ہندو کرتے ہیں۔ کیونکہ شرک بذاتِ خود اپنی تعریف میں اپنے خاص معانی رکھتا ہے جو کسی کے کہنے سے بدلا نہیں کرتے۔ اسی طرح ریسرکشن (Resurrection) کی بھی مخصوص تعریف ہے جو ہندو، مسلمان، عیسائی اور یہودی سب کے لئے ایک جیسی ہے۔ اسی تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر ریسرکشن (Resurrection) کی بجائے قرآن کے ترجمے میں کوئی دوسرا لفظ لگتا تو وہ ''ری انکارنیشن'' (Reincarnation) یعنی پیدائشِ نو یا ''ری برتھ'' (Rebirth) یعنی دوسرا جنم ہوتا۔ جو ہمارے علما کے زرتشی اور پالی (Pauli) نظریات کے خلاف ہوتا۔ اس صورتِ حال میں ان کی ملائیت اور ان کے غیر قرآنی عقائد کا کیا ہوتا؟

ریسرکشن (Resurrection) کے لفظ کا مطلب، تعریف اور عقیدہ ہزاروں سال سے

عیسائیوں کا ایمان بالآخرۃ چلا آ رہا ہے جس کے مطابق جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کے مردہ جسم کے ساتھ اس کی روح بھی قبر میں قیامت تک کے لئے سو جاتی ہے۔ عیسائیوں نے ریسرکشن کی تعریف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فرشتوں کے ساتھ آسمان سے مبینہ واپسی کے من گھڑت تصور سے لی ہے جس میں "حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اترنے کے بعد قبروں میں سوئے ہوئے مردوں کو جگا کے پہلے ہمیشہ کے لئے زندہ کریں گے پھر ان کی بخشش کرائیں گے"۔ اور لاشیں قبروں سے نکل کر بالکل ویسے ہی رینگنے لگیں گی جیسے ہالی وڈ والوں نے عیسائیت کے ایمان بالآخرۃ پر مبنی فلم 'زندہ مردوں کی رات(Night of the Living Dead) میں منظر کشی کی ہے۔ موجودہ عیسائی نظریئے کی رو سے اس واقعہ کو قیامت کہا جاتا ہے۔ یہ غلط فہمی عہدِ اول کے کلیسا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ان اعلیٰ تعلیمات کو پس پشت ڈال کر پیدا کی تھی جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیدائشِ نو یا سوئے ہوئے مردے کو جگانے (awakening or reincarnation) کی تعریف ایسے کی ہے کہ ''کسی نئے جسم میں روح کی دوبارہ پیدائش پہلے سے موجود کسی زندہ جسم کے اندر ہی ہوتی ہے'' یعنی کسی ماں کے پیٹ میں۔ نہ کہ صرف روایتی قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو بخشوانے کے لئے آسمانوں سے اتریں گے۔

ایوب ۱:۲۱ کا مندرجہ ذیل حوالہ اس ضمن میں دلیل ہے۔ جس میں حضرت ایوب علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے پیدائشِ نو(Reincarnation) کی وضاحت ماں کے پیٹ سے دوبارہ پیدا ہونے کے عمل سے فرمائی ہے۔ یہاں ایوب علیہ السلام توقع کر رہے ہیں کہ وہ دوبارہ پیدا ہونے کے لئے ماں کے پیٹ میں جائیں گے۔

"Naked I came from my mothers womb, and naked I shall return there. The Lord gave and the Lord has taken away. Blessed be the name of the Lord.(Job 1: 21)

میں اپنی ماں کے پیٹ سے ننگا آیا تھا، اور ننگا وہیں واپس جاؤں گا۔ رب نے دیا اور رب نے ہی لے لیا۔ مبارک ہو رب کا نام۔(ایوب ۱:۲۱)

اس کے علاوہ ایوب کی آیات ۱۹:۲۵، ۲۶، ۲۷ میں حضرت ایوب علیہ السلام نے نہائت سادہ الفاظ میں پیدائشِ نو کا سائیکل ایسے بیان کیا ہے کہ مرنے کے بعد جب ان کا جسم ختم ہو جائے گا تو ایک بار پھر سے انہیں نئے گوشت کا جسم عطا کر دیا جائے گا۔ پھر وہ، کوئی دوسرا نہیں یعنی وہی روح نئے جسم کے ساتھ اپنے رب کو دیکھے گی۔ رب کو دیکھنے کا مطلب اس کی کاریگری اور اس کی بنائی ہوئی دنیا دیکھنے سے ہے جس سے یقیناً رب کا وجود دکھائی دیتا ہے۔

Job 19:25 I know that my Redeemer lives, and that in the end he will stand upon the earth. 19:26 And after my skin has been destroyed, yet in my flesh I will see God; 19:27 I myself will see him with my own eyes-I, and not another. How my heart yearns within me!

میں اپنی زندگیوں کے نجات دہندہ کو پہچانتا ہوں، اور یہ کہ دنیا میں آخر تک وہی قائم رہے گا۔(ایوب ۱۹:۲۵)

اور اپنا جسم ختم ہو جانے کے بعد، بھی میں اپنے گوشت والے جسم کے ساتھ خدا کو دیکھوں گا۔(ایوب ۱۹:۲۶)

میں بذاتِ خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔ میں خود، مجھ میں کوئی دوسرا نہیں۔ میرا دل اندر سے کتنا بے تاب ہو رہا ہے!(ایوب ۱۹:۲۷)

ایوب ۳۰:۲۳ میں حضرت ایوب علیہ السلام موت کے بعد زندہ ہو کر دنیا میں واپس آنے کا تائیدی بیان ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

(Job 30:23). "For I know that You will bring me to death And to the house of meeting for all living.

میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے موت دیں گے اور زندہ لوگوں کی دنیا میں واپس لے آئیں گے۔(ایوب ۳۰:۲۳)

The house of meeting for all living زندہ لوگوں سے ملاقات کا گھر یعنی زمین میں بسنے والے زندہ لوگ در اصل دنیا میں واپس بھیجنے کا حوالہ ہے۔ قرآن بھی اس کی جا بجا تائید کرنے کے ساتھ ساتھ سائنسی انداز میں برزخ کی بھی تعریف کرتا ہے جس میں موت کے بعد اچھی اور بری دونوں ارواح مقیم ہوں گی۔ برزخ اپنی قرآنی تعریف کے مطابق وہ جھلی ہے جو دو مادی اجسام کو ساتھ لے کر بھی چلتی ہے اور انہیں جدا جدا بھی رکھتی ہے۔ ماں کی کوکھ یا بچہ دانی کی

جھلی یا پردہ بھی ماں اور بچے کی دو زندگیوں کو بچے کی پیدائش تک الگ الگ بھی رکھتا ہے اور ساتھ ساتھ بھی لے کر چلتا ہے۔ عالمِ برزخ کی اس سائنسی تعریف کے علاوہ ہمارے تراجم اور تفسیروں میں کی ہوئیں اٹکل پچو تعریفوں کا اطلاق عملی طور پر کہیں نہیں ہوتا۔

کتبِ متفقہ (synoptic gospels) یعنی متی، مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں دوبارہ پیدائش (Reincarnation) کا ایک اور مستند حوالہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کا ساتھ دینے والوں کو اگلی زندگی میں موجودہ زندگی سے سو گنا زیادہ گھر، ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے اور زمین ملنے کی نوید سنائی۔

"No one who has left home or brothers or sisters or mother or father or wife or children or land for me and the gospel will fail to receive a hundred times as much in this present age - homes, brothers, sisters, mothers, children and fields ... and in the age to come, eternal life." (Mark 10:29-30)

جس کسی نے بھی میرے لئے اور انجیل کے لئے اپنا گھر یا بھائی یا بہنیں یا ماں یا باپ یا بیوی یا بچے یا زمین کو چھوڑا وہ آنے والی ہمیشہ کی زندگی میں اپنی موجودہ زندگی سے سو بار زیادہ اپنے گھر، بھائی، بہنیں، مائیں، بچے اور زمین حاصل کرنے میں ناکام نہیں ہوگا۔ (مرقس ۳۰-۲۹:۱۰ اردواں ترجمہ)

غور فرمایئے کہ اللہ کے نبی کے ذریعے کیا ہوا اللہ تعالیٰ کا یہ بالواسطہ وعدہ دوبارہ پیدائش (Reincarnation) کے بغیر کیسے پورہ ہوا ہوگا؟ کسی انسان کی زندگی کے ایک دور میں ماں باپ کا صرف ایک ہی مجموعہ (Set) ہوسکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ستر شاگرد جنہوں نے اپنے گھر اور خانوادے رضائے الٰہی کے لئے چھوڑے انہیں ان کی اسی زندگی میں ہر ایک کو سو سو بیویاں، سو سو گھر اور اتنے ہی خانوادے کیسے ملے ہوں گے؟ اس کا جواب تو ان کی کم از کم سو بار پیدائش (Reincarnation) سے ہی ممکن ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صرف سو سو بہن بھائیوں کا ہی وعدہ کیا ہوتا تو بات الگ تھی مگر دوبارہ پیدائش کو نہ ماننے والے کلیسا کے پاس سو سو بیویوں، سو سو گھروں اور سو سو ماؤں کے ملنے کے بارے میں کوئی جواب نہیں۔ کیا ان لوگوں سے جھوٹا وعدہ کیا گیا تھا جنہوں نے خدا کے راستے میں قربانیاں دیں؟

عبرانیو کی مندرجہ ذیل آیات ۹:۲۷ اور ۹:۲۸ کے غلط تراجم کر کے صرف ایک بار موت کے بعد قیامت کے دن سب کا اکٹھا حساب کتاب ہونے کا عقیدہ گھڑا گیا۔ جو ہمارے علما کے توسط سے اسلام میں بھی داخل ہوگیا۔ ان آیات کے رائج اور مصدقہ انگریزی ترجمے کی ہو بہو نقل اور اس کا اردو ترجمہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

27 Just as people are destined to die once, and after that to face judgment,28 so Christ was sacrificed once to take away the sins of many; and he will appear a second time, not to bear sin, but to bring salvation to those who are waiting for him. Hebrews 9:27-28New International Version (NIV)

لوگوں کو ایک بار مرنے کے بعد فیصلے کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے مسیح نے سب کے گناہ لینے کے لئے ایک بار قربانی دی۔ اور وہ دوسری بار آئیں گے، گناہوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے نہیں بلکہ بخشش لے کر ان لوگوں کی جو ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ (عبرانیو ۲۸-۹:۲۷)

بائبل کے تمام تسلیم شدہ نسخہ جات میں آپ کو ان آیات کا ترجمہ ماسوائے ایک آدھ لفظ کے ہیر پھیر کے قریباً ایک جیسا ہی ملتا ہے۔ آیت ۹:۲۷ کا اندازِ بیان بالکل ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ ''بندوق کا گھوڑا ایک بار دباتے ہی گولی چل جاتی ہے'' انگریزی میں اسے اس طرح کہیں گے (Once the trigger is pulled the bullet is fired)، ''آگ کو ایک بار چھولیا تو جل جائیں گے (Once you touch the fire it will burn) یا قانون توڑا تو سزا ہو جائے گی (Once you break the law you will be sentenced) صرف و نحو کے قواعد کی رو سے ایسے شرطیہ جملے ہر زبان میں ملتے ہیں جن میں ''ایک بار'' (once) گنتی یا شمار کے حساب سے ایک بار نہیں بلکہ محاورتاً ''جونہی'' (As soon as) کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ جس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ کسی کام کے عمل پذیر ہوتے ہی اس سے مشروط کوئی اور عمل بھی اس کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے بندوق کا گھوڑا ہمیشہ کے لئے ایک ہی بار تو نہیں دبایا جاتا بلکہ جب جب گھوڑا دبایا جائے گا گولی چلے گی، ایسے ہی جتنی بار بھی آگ کو چھوئیں گے ہاتھ جلے گا اور اگر بار بار قانون شکنی کریں گے تو بار بار سزا ملے گی۔ اس نظر سے عبرانیو کی بالائی آیت: کو دیکھیں گے تو مطلب صاف سمجھ میں آ جائے کہ ''جتنی بار بھی موت واقع ہو گی ہر موت کے بعد حساب کتاب ہوگا'' یا جونہی موت آئے گی حساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ وحی (المکا

شفقة)٦:٢٠ اور ١١:٢ میں ہم تفصیلا مطالعہ کر چکے ہیں کہ موت صرف ایک بار نہیں بلکہ ایک سے زیادہ بار آتی ہے۔ یوحنا ١٦-١١:١١ میں ایک جذامی (Lazarus) اور کئی اور لوگوں کے موت کے بعد زندہ ہونے اور دوبارہ مرنے کا بیان تفصیل سے ملتا ہے۔ کرنتھیوں اول ٢٠:١٥ میں بھی دوبارہ زندہ ہونے کا بیان ہے۔ ان تمام حوالوں سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ عبرانیو کی زیر نظر آیت ٩:٢٧ کا مطلب وہ نہیں جو کلیسا نے صرف ایک بار آنے والی موت کے ضمن میں لیا ہے۔ اب ہم عبرانیو کی مذکورہ آیات ٩:٢٧ اور ٩:٢٨ کا صحیح ترجمہ منظرِ عام پر لانے کیلیئے ان آیات کا اصل متن آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

Hebrews9:27

καθ' ὅσονἀπόκειταιτοῖςἀνθρώποιςἅπαξἀποθανεῖν, μετὰδὲτοῦτοκρίσις•

ایسا نظام تشکیل دیا گیا ہے کہ انسان کے ایک بار مرتے ہی اس پر فیصلے کی گھڑی آ پہنچتی ہے۔(عبرانیوں ٩:٢٧)

Hebrews9:28

οὕτωςκαὶὁχριστός, ἅπαξπροσενεχθεὶςεἰςτὸπολλῶνἀνενεγκεῖνἁμαρτίας, ἐκδευτέρουχωρὶςἁμαρτίαςὀφθήσεταιτοῖςαὐτὸνἀπεκδεχομένοις, εἰςσωτηρίαν.

انجیل کے باب نہم کی اٹھائیسویں آیت کی وحی کے الفاظ یونانی لفظ ''اوٹوز'''' Χριστὸς '' سے شروع ہوتے ہیں جو ''ہوٹوس'' Hotos مصدر کا مخرج ہے جس کا مطلب ''اس طرح، اس طریقے سے، اس کے بعد'' (in this manner, thus or after that) ہے۔ اگلا لفظ ''کاہی'''' καὶ '' حرفِ ربط (conjunction) ہے جس کا مطلب 'پھر، اور، بھی، یہاں تک کہ'' (and, also, even, so then) ہوتا ہے۔ پھر اسمِ ضمیر (Pronoun) ''ھوٗ'' آتا ہے جو واحد مذکر ہے اور یکساں طور پر عورت، مرد اور کسی اکیلی چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے (he, she , it, that)۔ اس کے بعد کا لفظ'' Χριστὸς '' کھرستوز ہے۔ جس کا مطلب انگریزی لغات میں ''انوئنٹڈ'' (Anointed) ہے۔ یعنی عورت کے رحم کی رطوبت (Smear)، گند مند میل کچیل، داغ دھبوں اور آلائش سے لت پت۔ کچھ فاضل حضرات اس لفظ کو تیل یا گریس کے کوٹ

اور عورت کی بچہ دانی کی رطوبت (smear) کے معنی میں لے کر گناہوں کا استعارہ (Metaphor of sins) بھی لیتے ہیں۔ مگر مذہبی نظریات سے متاثر مسلمان ، یہودی یا عیسائی علما کی لغات اور گوگل ٹرانسلیٹر (Google Translator) میں اس لفظ کا ترجمہ ''مسیح'' کیا گیا ہے جو وحی کے اصل متن کے لحاظ سے بالکل غلط اور گمراہ کن ہے۔ اگر آپ کسی بھی معیاری غیر جانبدار لغت (dictionary) میں اس کے معانی دیکھیں گے تو آپ کو وہی معانی ملیں گے جو بالائی سطور میں راقم الحروف نے درج کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ انجیل کا باب نہم عبرانیوں ''عہد'' (Covenant)، ''تجدیدِ عہد'' اور پیدائشِ نو کے عنوانات پر مشتمل ہے۔ عہد کے اس پس منظر میں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا سے لوگ عہد کریں اور ان کی بدعہدی کا بوجھ خدا کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے سر پر اٹھائے پھریں اور بالآخر روزِ قیامت اپنے سب امتیوں کے گناہ معاف کرا کے انہیں جہنم کے عذاب سے نجات دلا دیں۔ اس کے بعد اگلا لفظ ''ہپیکس'' ἅπαξ '' آتا ہے جس کا مطلب ''باری'' (turn) ہے کئی لغات اس کا ترجمہ ''ایک بار'' (once) بھی کرتی ہیں۔ پھر لفظ ''پروس فیرو'' '' προσενεχθεὶς '' ہے جس کا مطلب 'لانا، ساتھ لے جانا، دیا جانا اور سلوک (Deal) کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد حرفِ جر 'آئس' '' εις '' آتا ہے جس کا مطلب نتیجتاً وقت کے لحاظ سے کسی جگہ یا کسی مقام پر پہنچنا ہوتا ہے۔ پھر ''ھوٗ'' آتا ہے جو کسی خاص چیز، اکیلی عورت اور اکیلے مرد کی ضمیر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پھر اگلا لفظ ''پولوس'' '' πολλῶν '' ہے جس کا مطلب بہت سا، کثیر، لمبا، لمبا عرصہ اور اکٹھا (many, much, abundant, long , long time or altogether) ہوتا ہے۔ اس کے بعد فعل ''انا فیرو'''' ἀνενεγκεῖν '' آتا ہے جس کا مطلب اٹھانا، قبول کرنا اور آگے لے کر جانا ہے۔ اس کے بعد کا لفظ ''ہمرتیہ'''' ἁμαρτίας '' ہے جس کا مطلب منزل سے بھٹک جانا، غلطی اور گناہ کا سرزد ہونا ہے۔ پھر حرفِ جر ''ایک'''' ἐκ '' آتا ہے جس کا مطلب کسی عمل یا تحریک کا نقطِ آغاز یا ابتدا ہے۔ جو براہِ راست یا بالواسطہ کسی عمل کی وجوہات، جگہ اور وقت کے ساتھ مشروط ہے۔ پھر ڈیوٹرس'' δευτέρου '' کا لفظ دوبارہ، دوسری جگہ اور دوسری مرتبہ کے تواتر اور بار بار کے معانی میں آتا ہے۔ اس کے بعد لفظ ''خوریس'''' χωρὶς '' آتا ہے جو اگر اسم ہو تو ''ایک جگہ پر مگر علیحدہ علیحدہ'' کا مطلب دیتا ہے۔ لیکن یہ لفظ اکثر حرفِ جر کے طور پر استعمال ہوا

ہے جو" کی طرف سے، کے علاوہ، خود کی طرف سے، کے بغیر" کے معانی میں آتا ہے۔ اس کے بعد "'ہمارتیہ"" ἁμαρτίας " کا لفظ آتا ہے جو کسی گناہ یا جرم کے مناسب خلاصے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پھر زمانہِ مستقبل میں تیسرے واحد (third person singular) شخص کے لئے فعل "اوپتِن اوماہی"" οφθησεται " آتا ہے جس کا مطلب ظاہر، خود ظاہر ہونا اور دیکھنا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ فعل مفعولی (passive) حالت میں ہے اسلئے دکھایا جانا اور ظاہر کیا جانا کے معانی میں آئے گا۔ اس کے ساتھ اسمِ ضمیر "ھو"" τοις " اس عورت، اس آدمی یا اس چیز کیلئے آیا ہے۔ اس کے بعد واحد مذکر کی ذاتی ضمیر "اوتوز"" αυτον " ہے جو "خود" کے معانی میں معکوس ضمیر بن کے تیسرے شخص یا دیگر افراد کو مخاطب کرتی ہے۔ پھر "اپیک دیکھاوماہی"" απεκδεχομενοις " وہ فعل ہے جو کسی بات کی مکمل توقع رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر حرفِ جر "آئس"" εις. " دوبارہ آتا ہے جو کسی عمل کے نتیجے میں کسی گھڑی یا مقام پر پہنچنے یا مقصد کی نشاندہی کرتا ہے۔ آخری لفظ "سوتیریا"" σωτηριαν " آتا ہے جو اسم ہے اور یہ جسمانی یا اخلاقی طور پر بچانے (Rescue) یا امن، سلامتی اور حفاظت کی فراہمی، صحت یا مصیبت سے نجات پانے (Salvation) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

قارئین کرام عبرانیو کی اس آیت ۹:۲۷ کے اصل متن کے الفاظ سے کیا ہوا صحیح ترجمہ مندرجہ ذیل ہے جو کلیسا والوں نے صرف اپنے نظریات کی بقا کے لئے آج تک لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔

اس طرح ایک بار پھر وہ گناہوں میں لت پت شخص اپنے تمام گناہوں کا بوجھ اٹھائے اپنے اسی مقام پر واپس جاتا ہے (عورت کے رحم کی رطوبت میں) جہاں سے وہ گناہوں کے بغیر شروع میں چلا تھا۔ وہ اور دیگر افراد جو نجات کی امید لگائے بیٹھے ہیں اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ خود دیکھ لیں گے۔ (عبرانیو ۹:۲۷ کے اصل متن سے کیا ہوا صحیح ترجمہ)

اس کو ایسے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ عورت کے رحم سے ایک بار نکلا ہوا شخص جب موت کے بعد واپس آتا ہے تو وہ اپنے تمام گناہوں سمیت دوبارہ وہیں بھیج دیا جاتا ہے جہاں سے وہ نکلا تھا۔ پھر جو لوگ اپنی غلط کاریوں کے نتائج سے بچ نکلنے کی توقع رکھتے ہیں وہ اپنے ساتھ ہونے والا سلوک خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ (عبرانیو ۹:۲۷ کے اصل متن سے کیا ہوا رواں ترجمہ)

قارئینِ کرام فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں کہ وحی کا اصل متن کیا بیان کر رہا ہے اور عیسائیوں کے بھٹکے ہوئے علما اس کا ترجمہ اور تشریح کیا کر رہے ہیں؟ ۔عبرانیو ۹:۲۸ کے اصل متن کے الفاظ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہلی بار سب کے گناہوں کا بوجھ اٹھا کے اس دنیا سے رخصت ہوئے اور دوسری بار قیامت کے دن ایک ہی بار سب سوتے ہوئے مردوں کو قبروں سے نکال کر زندہ کر کے نجات دلانے آئیں گے" بلکہ یہاں تو موت کے بعد دوبارہ زندگی اسی طرح ماں کے پیٹ سے شروع ہونے کا بیان ہے جیسے پہلے ہوئی تھی۔

کلیسا والے ہی کیوں مسجد والے بھی کم نہیں وہ بھی اپنی آخرت کلیسا والوں کے دیئے ہوئے آئینے میں ہی دیکھتے ہیں۔ وہ بھی اس بات سے نہیں ڈرتے کہ مرتے ہی حساب کتاب شروع ہو جائے گا اور باوجود قرآن کی اس تنبیہ کے کہ ستر گز کی رسی (اگلی زندگی کی عمر) مجرموں کے گلے میں باندھ کے انہیں واپسی ڈاک سے سیدھا جہنم رسید کیا جائے گا۔ ہم ابھی تک اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ موت کے بعد بغیر حساب کتاب دیئے غیر مخل نیند کے مزے لوٹیں گے جس میں وقت کا احساس ہی باقی نہیں رہے گا۔ پھر قیامت کے دن زندہ ہو کے سیدھے جنت الفردوس میں قیام فرمائیں گے۔ اچھا افسانہ (Fiction) ہے مگر اس تراشیدہ فسانے نے امتِ مسلمہ کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ عمل کی جدوجہد ناپید ہوگئی۔ مستقبل (آخرت) بنانے کی اولوالعزمی جو قرآن دیتا ہے وہ ختم ہوگئی۔ خوفِ خدا اور آخرت کا ڈر جاتا رہا کیونکہ آخرت کو ہم نے اپنے ایمان سے نکال کے باہر پھینک دیا جس کی وجہ سے ہم سب قوموں سے پیچھے اور دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو کے رہ گئے۔ لفظ ایمان پر بہت زور دیا جاتا ہے اس کا ماخذ بھی امن سے لیا جاتا ہے مگر امن پھر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ کسی میں اتنی جرات ہی نہیں کہ ادھر ادھر کی باتوں کی بجائے قرآن کھول کے لوگوں کو یہ بتا دے کہ اصل ایمان ہے کیا؟ کیونکہ آخرت کے قرآنی نظریئے پر ایمان لائے بغیر لنگڑے لولے ایمان کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر اس بات پر یقینِ کامل ہو جائے کہ جو آج کرو گے وہ کئی صدیوں بعد نہیں بلکہ کل ہی آنے والی اگلی زندگی میں بھرنا پڑے گا تو ہمارا ایمان بھی کامل ہو جائے گا اور بہت سی برائیوں کا خود بخود خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ اگر یہ سب نہیں کیا جاتا تو صرف وقت ضا

ئع کرنے والی بات ہے خواہ وہ کتابیں لکھ کر کیا جائے یا مرشدوں کے خیالات کے پرچار والا درسِ قرآن دے کر کیا جائے۔ ان کاموں سے کوئی تبدیلی نہیں آنے والی بلکہ اس کام کو نیک کام سمجھ کر کرنے والے لوگ **عذاب مھین** کے مستحق بھی ہوں گیا ور اللہ تعالیٰ کے حضور ضرور جواب دہ ہوں گے کہ انہوں نے لوگوں کو مزید گمراہ کیوں کیا؟ کیوں سچائی پر پردہ ڈالا؟ کیوں لوگوں کو نہیں بتایا کہ قرآن کیا کہتا ہے؟

پیدائشِ نو(reincarnation) وہ حقیقت ہے جسے ہم سمجھ نہیں سکے کیونکہ ہم قرآن کی بجائے پال اور پوپ کے گھڑے ہوئے تصورِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ تو پوری خلقت کے حساب کتاب، فیصلے اور قبروں سے نکل کر دوبارہ زندہ ہونے کے ایک ہی دن پر اس لئے ایمان رکھتے ہیں کہ انہیں آسمان سے یسوع مسیح کے اترنے کا انتظار ہے۔ تاکہ جب وہ واپس آئیں تو ایک ہی دن میں عیسائیوں کے قبروں میں سوئے ہوئے مردوں کو موت سے جگا کے انہیں نجات دلا دیں۔ مگر ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں؟۔ ہمیں تو قرآن کہتا ہے کہ تم جیسے اکیلے اکیلے پیدا کئے گئے ہو ویسے ہی اکیلے اکیلے واپس جاؤ گے۔ ذرے ذرے کا حساب ہوگا اور کوئی شفاعت بھی نہیں کرے گا!

قرآنِ کریم کی روشنی میں یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ قرآن سے پہلے نازل کی ہوئیں کتابوں کو بالکل بھی رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کے اصل متن کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کے اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ کلام تو بے شک اللہ تعالیٰ کا ہی ہے جس کا انکار کسی طور پر بھی درست نہیں۔ یہود و نصاریٰ کے موجودہ عقائد اور نظریات کچھ بھی ہوں مگر اللہ کا قانون اور وحی ان کی کتابوں میں بھی وہی ہے جو قرآنِ کریم میں ہے جس کا ہم سیر حاصل مطالعہ کر چکے ہیں۔ مزید مطالعہ کے لئے ان کتابوں سے چند ایک حوالہ جات آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

(۱) تثلیث(Trinity) کی بجائے خدائے واحد پر ایمان:

Hear O Israel: the Lord our God is one Lord, and the Lord your God is to be loved with all your heart and with all your soul and with all your strength.(Deuteronomy 6:4-5)

"اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے، اور رب تمہارا خدا اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت کے ساتھ محبت کرنے کے لئے ہے۔ (استثنا ۶:۴-۵)

Which law is the first of all?Jesus said in answer, The first is, Give ear, O Israel:The Lord our God is one Lord; and you are to have love for the Lord your God with all your heart, and with all your soul, and with all your mind, and with all your strength.(Mark 12:28-30)

’’کونسا قانون سب سے پہلا ہے؟‘‘ عیسیٰ علیہ السلام نے جواب میں کہا، سب سے پہلے ہے، غور سے سنو، اے اسرائیل خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے، اور تم اپنے پورے دل سے رب اپنے خدا کے لئے محبت رکھو، اور تم اپنی پوری روح کے ساتھ، اور اپنے پورے ذہن کے ساتھ، اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ۔ (مرقس ۱۲:۲۸-۳۰)

And your God is One God. There is no God but He, Most Gracious, Most Merciful.(Quran 2:163)

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْم.

اور تمہارا معبود خدائے واحد ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں (وہ) نہایت مہربان بہت رحم فرمانے والا ہے۔ (مروجہ ترجمہ قرآن ۲:۱۶۳)

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں بلکہ خدا کے بھیجے ہوئے انسان اور نبی ہیں:

I (Jesus)by myself can do nothing as I hear I judge, and my judgment is just, because I seek not my will, but the will of thy who has sent me.(John 5:30)

میں (عیسیٰ) خود اپنے طور پر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو میں سنتا ہوں، سمجھتا ہوں اور فیصلہ کرتا ہوں وہ اپنی مرضی سے نہیں کرتا بلکہ یہ اس کی مرضی سے ہوتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ (یوحنا ۵:۳۰)

This is eternal life, so that you may know there is one true God, and Jesus Christ, who Thou has sent.(John 17:3)

یہ بات ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گی تاکہ تم جان سکو کہ ایک ہی حقیقی خدا ہے اور عیسیٰ مسیح کو اسی نے بھیجا ہے۔ (یوحنا ۱۷:۳)

One of the persons approaches Jesus, and says Good Master, what good things shall I do, that I shall attain eternal life. And Jesus said unto him, Why do you call me good? For there is none good, except One, that is God And if you want to enter life, keep the commandments(Mathew 19:16-17)

ایک شخص عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر کہتا ہے، ''اچھے مالک میں کیا اچھے کام کروں جن سے مجھے ہمیشہ کی زندگی مل جائے۔'' اور عیسیٰ علیہ السلام نے اسے کہا، تم نے مجھے اچھا کیوں کہا؟ اس لئے کہ یہاں کچھ اچھا نہیں صرف ایک کے، جو ہے خدا۔ اور اگر تم ہمیشہ کی زندگی چاہتے ہو تو خدا کے احکامات کو تھام لو۔ (متی ۱۷-۱۶-:۱۹)

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ.

بیشک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔ (۵۹ :۳)

(۳) خدا کے حضور سجدہ ریز ہونا:

Then Moses quickly went down on his face in worship.(Exodus 34:8)

پھر موسیٰ علیہ السلام اطاعتِ الٰہی میں فوراً منہ کے بل جھک گئے۔ (خروج ۳۴:۸)

Then Joshua, falling down with his face to the earth in worship(Joshua 5:14)

پھر یشوع اطاعتِ الٰہی میں اپنے منہ کے بل زمین میں سجدہ ریز ہو گئے۔ (یشوع ۵:۱۴)

And he (Jesus)went forward a little and falling down on his face in prayer(Matthew 26:39)

اور وہ (عیسیٰ) تھوڑا آگے بڑھے اور اپنے رب کی بندگی میں سربسجود ہو گئے۔ (متی ۲۶:۳۹)

O you who believe! Bow down, prostrate yourselves, and adore your Lord; and do good; that you may prosper(Quran 22:77)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.

اے ایمان والو رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلائی کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ (مروجہ ترجمے کی نقل قرآن ۲۲:۷۷)

(۴) حجاب:

For if a woman is not veiled, let her hair be cut off; but if it is a shame to a woman to have her hair cut off, let her be veiled.(1 Corinthians 11:6-10)

اگر کوئی عورت بے پردگی اختیار کرے تو اس کے بال کاٹ دیئے جائیں، لیکن اگر بال کاٹنے سے عورت شرم کرے تو وہ پردہ لے۔ (کرنتھیوں ۱۰-۱۱:۶)

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا.

اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں، یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تا کہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں۔ اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ (مروجہ ترجمے کی نقل قرآن ۳۳:۵۹)

(۵) خنزیر کا گوشت کھانے کی ممانعت:

And the pig is unclean to you, because though it has a division in the horn of its foot, its food does not come back; their flesh may not be used for food or their dead bodies touched by you.(Deuteronomy 14:8)

خنزیر آپ کے لئے ناپاک ہے، اگرچہ اس کے پاؤں کے کھر دو حصوں میں تقسیم ہیں، کیونکہ اس کی (نیم ہضم شدہ) خوراک (معدہِ اول) میں سے (دوبارہ چبانے کے لئے) واپس (منہ میں) نہیں آتی، اس کا گوشت کھانے کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا اور ان کے مردہ جسم کو چھونا بھی منع ہے۔ (استثنا ۱۴:۸)

استثنا کی مندرجہ بالا آیت میں خنزیر کا گوشت حرام کرنے کی جو وجوہات بیان کی گئی ہیں وہ علمی

اعتبار سے اتنی بلند ہیں کہ انہیں اللہ کی سچی وحی قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جس زمانے میں یہ وحی نازل کی گئی تھی اس وقت ممالیہ جانوروں کے نظامِ انہضام کا وہ سائنسی علم انسان کو نہیں تھا جو آج کے ماہرینِ طب وحیاتیات رکھتے ہیں۔ جس کے مطابق سوائے خنزیر کے تمام ممالیہ جانوروں کی نیم ہضم شدہ غذا ان کے معدہِ اول سے ہوتی ہوئی واپس منہ میں آتی ہے جسے Cud کہا جاتا ہے۔ ممالیہ جانور اسے چباتے ہیں اور پودوں اور درختوں کے اجزا سے غذائیت حاصل کر کے اپنی خوراک ہضم کرتے ہیں۔ اس عمل کو سائنسی اصطلاح میں Ruminant کہا جاتا ہے۔ مگر خنزیر کے معدہِ اول سے خوراک اس کے منہ میں واپس نہیں آتی جسے وہ چبا نہیں سکتا اور نہ ہی یہ دیگر ممالیہ کی طرح Ruminant کے عمل کے ذریعے اپنی خوراک ہضم کر سکتا ہے۔ لہٰذا دیگر ممالیہ جانوروں کے برعکس خنزیر بکٹیریا (Bacteria) کے ذریعے اپنی خوراک ہضم کرتا ہے جو اس کے گوشت، خون اور کھال میں پوری طرح پائے جاتے ہیں۔ خنزیر کے گوشت میں پائے جانے والے بکٹیریا انسانی صحت کے لئے مضر ہوتے ہیں جن سے انسان کی قوتِ مدافعت کمزور ہو جاتی ہے اور انسان کو کئی قسم کی مہلک بیماریاں لگ سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ انسان کی بہتری چاہتے ہیں اس لئے انسان کو بیما ریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ نے خنزیر کا گوشت کھانے اور اسے ہاتھ لگانے تک سے منع فرمایا۔ اگر انسان اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے پھر بھی خنزیر کا گوشت کھاتا ہے تو اپنے نفع و نقصان کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ جیسے خنزیر کا گوشت عیسائیوں کی کتاب میں بھی حرام ہے مگر یہ ان کے عقیدے میں شامل نہیں بالکل اسی طرح مرنے کے بعد دوبارہ پیدائش کے حوالے بھی ان کی کتابوں میں موجود ہیں مگر ان کے موجودہ عقیدے میں یہ بات بھی شامل نہیں۔

شاہ جیمز کے نسخہِ اعمال (Acts) اور استثنا میں بھی یہی کہا گیا ہے۔

And the swine, though he divide the hoof, and be clovenfooted, yet he cheweth not the cud; he is unclean to you. Of their flesh shall ye not eat, and their carcase shall ye not touch; they are unclean to you. (Deuteronomy 14:7; Acts 10:9-16)King James Bible

یسعیاہ کے مندرجہ ذیل حوالے میں بھی خنزیر کے گوشت کو برا کہا گیا ہے۔

Who sit among graves and spend the night in secret places; Who eat swine's flesh, And the broth of unclean meat is in their pots. Isaiah 65:4

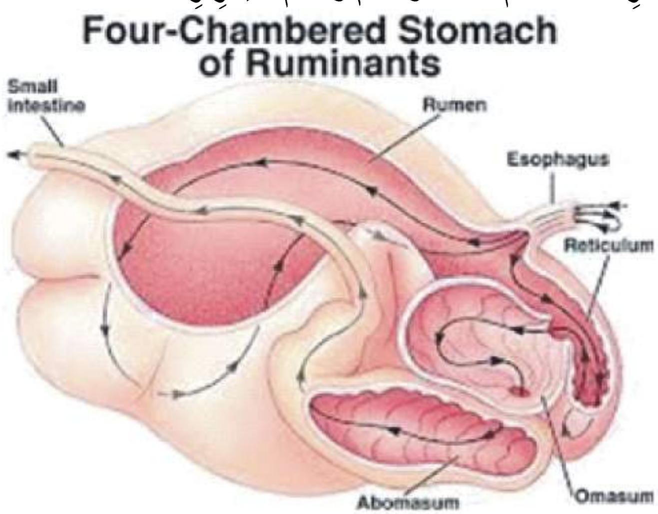
احبار میں بھی خنزیر کا گوشت ممنوع قرار دیا گیا۔

And the pig, for though it divides the hoof, thus making a split hoof, it does not chew cud, it is unclean to you -. Leviticus 11:7

متی کی انجیل ۶:۷، لوقا کی انجیل ۸:۳۳ اور ۱۵:۱۵ میں بھی خنزیر کو ناپاک اور شہوت پرست کہا گیا ہے۔

قرآن کی سورہ المائدہ بھی خنزیر کو حرام قرار دے کر مندرجہ بالا وحی کی تصدیق کر رہی ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ (۵:۳)



معدے کے چار خانوں پر مشتمل نظامِ انہضام

قارئین کرام آپ قرآن سے پہلے اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئیں کتابوں کے حوالوں میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کتابوں میں کی ہوئی وحی قرآن سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔ بیشک قرآن اللہ تعالیٰ کی مکمل اور مفصل کتاب ہے مگر اس میں کہیں کہیں اختصار سے بھی کام لیا گیا ہے جس کی تفصیل

اس سے پہلی کتابوں میں وحی کر دی گئی ہے۔ مثلاً خنزیر کے گوشت کو ممنوع قرار دینے کی تفصیل اور اس کے نضامِ انہضام کا سائنسی بیان قرآن میں موجود نہیں۔ قرآن نے خنزیر کو حرام قرار دینے پر اکتفا کیا اور پچھلی کتابوں کی تصدیق بھی کر دی تا کہ ان کو بھی پڑھا جائے۔ اسی طرح قرآن نے طوفانِ نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی کے تاریخی واقعہ کی تصدیق کرتے ہوئے اس کی مختصر تفصیل بھی دے دی جو معلومات، واعظ و نصیحت اور اس واقعہ سے سبق حاصل کرنے پر مشتمل ہے مگر قرآن سے پہلی کتابوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی بناوٹ کی مکمل تفصیل فنی اور تکنیکی (Atchetectural and Technical Details) اعتبار سے دی گئی ہے جس میں اس کی پیمائش، ڈیزائن اور اس میں استعمال ہونے والے ساز و سامان (Material) کے بارے میں دی گئیں ہدایات بھی درج ہیں۔ کتابِ پیدائش (Genesis) کی آیات ۱۶:۱۵،۱۴:۶ ملاحظہ فرمائیے۔

"Make for yourself an ark of gopher wood; you shall make the ark with rooms, and shall cover it inside and out with pitch."This is how you shall make it: the length of the ark three hundred cubits, its breadth fifty cubits, and its height thirty cubits. "You shall make a window for the ark, and finish it to a cubit from the top; and set the door of the ark in the side of it; you shall make it with lower, second, and third decks.Genesis6:14,15,16)

اپنے لئے غوفر کی لکڑی سے ایک کشتی بناؤ، اس میں کمرے بناؤ، اس پر اندر اور باہر سے دافع آب ملمع چڑھاؤ۔ اس کو ایسے بناؤ کہ کشتی کی لمبائی ۲۰۰ کیوبٹ، چوڑائی ۵۰ کیوبٹ اور اس کی اونچائی ۳۰ کیوبٹ ہو۔ اس کے اوپر کی جانب ایک کیوبٹ اونچی کھڑکی (Skylight Window) لگاؤ اور کشتی کے ایک طرف دروازہ لگاؤ۔ اس کی بالترتیب تین منزلیں بناؤ اوپر والا عرشہ، درمیانی منزل اور نیچے والی منزل۔ (پیدائش ۱۶،۱۵،۱۴:۶)

اوپر کی جانب ایک کیوبٹ اونچی کھڑکی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ آج کی کے دور کی Skylight Window یعنی آسمان سے روشنی لانے والی کھڑکی سے مشابہ ہے۔ کیوبٹ کسی چیز کو ناپنے کا قدیم پیمانہ ہے مگر وہ نہیں جسے ہمارے علما ایک ہاتھ کے برابر شمار کرتے ہیں۔ اس زمانے کا ایک کیوبٹ تقریبا ۴۵۷.۲ ملی میٹر یعنی ۱۸ انچ بنتا ہے۔ مگر قدیم مصر کا شاہی کیوبٹ (Egyptian Royal Cubit) ۵۲۹ ملی میٹر لمبا ہوتا ہے۔ جس کے حساب سے سفینۂ نوح کی لمبائی تقریباً ۱۵۷.۷ میٹر (۲۵۰ فٹ ۱۸ انچ) چوڑائی ۲۶.۴۵ میٹر (۸۶ فٹ ۹.۳ انچ) اور اونچائی ۱۵.۸۷ میٹر (۵۲ فٹ ۱۰.۸ انچ) بنتی ہے۔

یہاں قرآن کے حوالے سے سمجھنے والا نکتہ یہ ہے کہ کتابِ پیدائش کی مندرجہ بالا آیات میں کشتی بنانے کی ہدایات کو قرآن نے دہرایا نہیں بلکہ اس حکم کی تصدیق کرتے ہوئے قرآن کا بیان سیلاب آنے کے عمل اور کشتی میں سوار کئے جانے والوں کے بارے میں دی گئیں ہدایات کی طرف بڑھ گیا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ. (۲۷:۲۳)

ہم نے اس پر وحی کی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کر۔ پھر جب ہمارا حکم آ جائے اور تنور ابل پڑے تو ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا لے کر اس میں سوار ہو جا، اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے سوائے ان کے جن کے خلاف پہلے ہی فرمان صادر ہو چکا ہے، اور مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں کچھ عرض بھی نہ کرنا جنہوں نے ظلم کیا ہے، وہ ڈبو دیئے جائیں گے۔ (۲۷:۲۳)

قارئینِ کرام غور فرمائیے اپنے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کشتی بنانے کے لئے فرمایا مگر کشتی بنانے کے حکم کی تفصیل یعنی کشتی بنانے کی ہدایات والا وحی کا حصہ قرآن میں موجود نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدانخواستہ قرآن مکمل نہیں بلکہ یہاں اللہ تعالیٰ صرف یہ بات ہمارے علم میں لا رہے ہیں کہ انہوں نے کشتی بنانے کی ہدایات حضرت نوح علیہ السلام کو وحی کر دیں تھیں کہ ان کی سر پرستی میں کشتی ایسے بناؤ جس کی مکمل تفصیل قرآن سے پہلی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ قرآن میں اس کو دہرانے کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی گئی کہ قرآن سے پہلے نازل کی ہوئیں کتابیں بھی پڑھی جائیں اور جسے کشتی بنانے کی تفصیل درکار ہو وہ ان کتابوں میں دیکھ لے۔ مگر پھر بھی ہم

نے اپنے اس عظیم ورثے کو نہ صرف چھوڑ دیا بلکہ ''صرف قرآن'' کی آڑ میں ان کتابوں میں نازل کی ہوئی وحی کو بھی یکسر رد کر دیا اور جو کچھ قرآن میں کہا گیا اس کو بھی بھول گئے۔ یاددہانی کے لئے قرآنِ کریم کی چند ایک آیات حاضرِ خدمت ہیں:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ(۴۲ : ۱۳)

تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور اسی راستہ کی ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین پر قائم رہو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا جس چیز کی طرف آپ مشرکوں کو بلاتے ہیں وہ ان پر گراں گزرتی ہے اللہ جسے چاہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے راہ دکھاتا ہے۔(۴۲ : ۱۳)

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ(۳:۳)

اس نے تجھ پر یہ سچی کتاب نازل فرمائی جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اسی نے اس کتاب سے پہلے تورات اور انجیل نازل فرمائی۔(۳:۳)

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ(۳:۸۴)

آپ فرمائیں: ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا ہے اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اتارا گیا ہے اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور جملہ انبیا کو ان کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا ہے، ہم ان میں سے کسی پر بھی ایمان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے تابع فرمان ہیں۔(۳:۸۴)

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ(۳:۴)

وہ کتابیں لوگوں کے لیے راہ نما ہیں اور اسی نے فیصلہ کن چیزیں نازل فرمائیں بے شک جو لوگ اللہ کی آیتوں سے منکر ہوئے ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست بدلہ دینے والا ہے۔(۳:۴)

پیدائش ۶ کی آیات ۲۲-۹، پیدائش ۷ کی آیات ۲۴-۱، پیدائش ۸ کی آیات ۲۲-۱۱ اور پیدائش ۹ کی آیات ۲۸-۱ میں اس واقعہ کی مکمل تفصیل دی گئی ہے جس میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی نافرمانی سے لے کر طوفان سے پہلے اور بعد کے حالات کے ساتھ ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ ان آیات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ طوفانِ نوح کے وقت حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ۶۰۰ سال تھی اور طوفان کے بعد وہ مزید ۳۵۰ سال تک زندہ رہے اور انہوں نے ۹۵۰ سال عمر پائی۔ کشتی سے اترنے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی دعا اور زمین کو ایسے ہی قائم رکھنے کا اللہ تبارک تعالیٰ کا وعدہ بھی پیدائش کی مندرجہ بالا آیات میں درج ہے۔ جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس گراں قدر وحی کو کسی بھی مکتبۂ فکر کے نظریات کی بنیاد پر ہم کیسے رد کر سکتے ہیں؟۔ جبکہ اس وحی کے سچی ہونے کے ثبوت بھی دریافت ہو چکے ہیں۔

"Then the ark rested ... on the mountains of Ararat."(Genesis 8:4)

پھر کشتی ٹھہر گئی ارارات کے پہاڑوں پر۔(پیدائش ۸:۴)

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ(۱۱:۴۴)

اور حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا۔ تو پانی خشک ہو گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر جا ٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم۔(۱۱:۴۴)

پیدائش کی آیت ۸:۴ کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ارارات کے پہاڑی سلسلے پر ٹھہری اور قرآن کریم کی آیت ۱۱:۴۴ میں کہا گیا ہے کہ کشتی ''جودی'' پر ٹھہری۔ اللہ تعالیٰ کی وحی میں تو صرف ''جودی'' کہا گیا تھا مگر ہمارے نا اہل مترجمین نے حسبِ عادت ''جودی'' کے ساتھ ''پہاڑ'' کا اضافہ کر کے لوگوں کو بھٹکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جس سے قرآن اور پچھلی

کتابوں میں اختلاف پیدا ہو گیا کیونکہ مسلم علما نے ''جودی'' کے طویل پہاڑی سلسلے کو ایک پہاڑ بنا کر کشتی کے ٹھہرنے کے ایک خاص مقام کی خودساختہ نشان دہی فرمادی۔ جس سے دونوں تو میں ایک دوسرے کی کتابوں کو جھوٹا کہنے لگیں۔ جودی بلندی کو بھی کہا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں جودی اورارارات ایسے ہی ایک پہاڑی سلسلے کے دونام ہیں جیسے ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ ہے۔۱۷۳۴ء میں جارج سیل(George Sale) نے قرآنِ کریم کا جو ترجمہ کیا تھا اس کے حاشیئے میں انہوں نے اپنی تحقیق کی رو سے یہ بھی لکھا تھا کہ جودی دراصل ارارات کے ہی پہاڑی سلسلے کا نام ہے اور یہ کوئی اکیلا پہاڑ نہیں۔ ارارات بھی ''اراتو'' سے ماخوذ ہے۔ زمانۂ قدیم میں جب اسور (Assyria) آرمینیا(Armenian) کے سطحِ مرتفع کا حصہ تھا تو اس علاقے کو ''اراتو'' کہا جاتا تھا۔ نوویں صدی کے عرب جغرافیہ دان ابن خردادبہی نے بھی الجودی کا پہاڑی سلسلہ الاکرد کے نام سے دریافت کیا تھا جو سرزمینِ اسور(Assyria) میں ہی واقع ہے۔ عباسی دور کے مورخ ابوالحسن المسعودی نے بھی ارارات کے اسی پہاڑی سلسلے کو الجودی کہا ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہری تھی۔ چودھویں صدی عیسوی میں ابن بطوطہ بھی اس علاقے سے گزرا تھا۔ مختصراً یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے یہ پہاڑی سلسلہ آرمینیا، ترکی اور کردش بارڈر سے ملحق ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی بھی ۲۰۰۸ء میں یہیں سے دریافت ہوئی جو سطحِ سمندر سے ۱۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ارارات کے پہاڑی سلسلے کی چوٹی کے نیچے ترکی کے علاقے میں دفن تھی۔ ۲۰۰۹ء میں امریکہ سے آئے ہوئے فلم کے عملے نے اس کی فلم بنائی اور کشتی کے اجزا تجزیئے کے لئے امریکہ لے گئے۔ دنیا بھر سے ماہرین آثارِ قدیمہ اور سائنسدانوں کی جماعتیں اپنے سازوسامان کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی تک پہنچیں اور اس کے ملبے کے ٹیسٹ ہونے لگے۔ الٹراساؤنڈ کے ذریعے سطحِ زمین کے اندر دبے ہوئے ملبے کی جانچ کرنے کے لئے امریکہ سے کئی طرح کی فوق الصوت(Ultrasonic) مشینیں لائی گئیں جن کے ذریعے کشتی میں استعمال ہونے والے سامان(material) کی شناخت کے ساتھ ساتھ اس کی ۴۸۰۰ سال عمر بھی دریافت کی گئی۔ جدید سازوسامان کے ساتھ اتنی گہرائی میں تحقیق کی گئی کہ اس کشتی میں استعمال ہونے والی میخوں تک کی پیمائش ہو گئی۔ جس طرح حاملہ عورت کے پیٹ کا اسکین کر کے بچے کی بالکل درست پیمائش کی جاتی ہے اسی طرح الٹراسونک مشینوں سے نا صرف اس کشتی کی مکمل پیمائش کی گئی بلکہ ان مشینوں نے کشتی کا خاکہ (image) بھی دے دیا کہ یہ کشتی جب تیار کی گئی تو کیسی لگتی ہوگی؟۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی مردے کے ڈھانچے پر کمپیوٹر اس کی شکل کا خاکہ بناتا ہے۔۲۰۱۳ء میں خوب جانچ پڑتال کے بعد مسلمہ طور پر اس بات کی تصدیق کر دی گئی کہ یہ کشتی حضرت نوح علیہ السلام کی ہی ہے جو طوفانِ نوح کے بعد اس مقام پر ٹھہر گئی تھی۔ کشتی کی پیمائش بھی بائبل میں دی گئی پیمائش کے مطابق تھی درست پائی گئی اور کتابِ پیدائش (Genesis) میں کی گئی وحی لفظ بلفظ سچ ثابت ہوئی۔ اگر یہ سائنسی حقائق اللہ کی پہلی کتابوں کی وحی کے الفاظ کی تصدیق کرتے ہیں تو اللہ کی ان کتابوں کو ہمیں ماننے میں کیا اعتراض ہے؟۔

قارئین کرام قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیاتِ مبارکہ کا صحیح مفہوم عملی طور پر یہاں کھل کر سامنے آتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۲:۳)

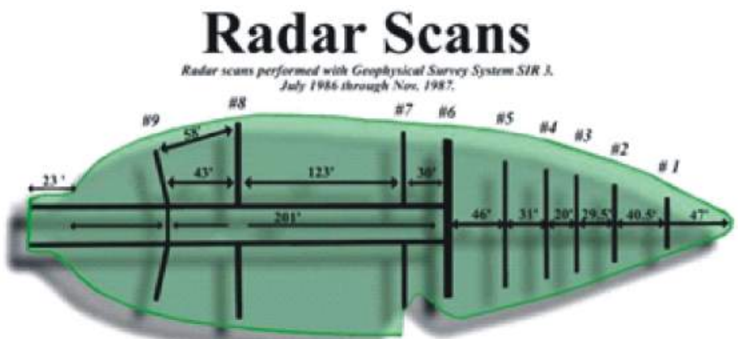
اسی طرح وحی بھیجتا ہے تیری طرف اور جو تجھ سے پہلے تھے اللہ زبردست حکمتوں والا ہے۔ (۴۲:۳)

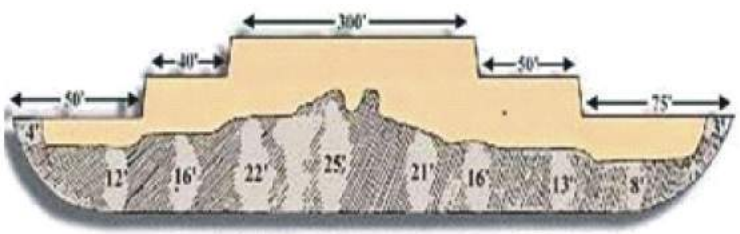
تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۱۱:۴۹)

یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں اس سے پہلے نہ تو آپ ہی جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی پس صبر کر کیونکہ بہتر انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔(۱۱:۴۹)

قارئین کرام غور فرمایئے قرآن سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئیں کتابوں میں موجود وحی کی سچائی کس طرح ثابت ہو رہی ہے۔ جسے ہر کوئی ماننے پر مجبور ہے خواہ وہ اہلِ کتاب ہو، ہندو ہو، بدھ مت سے تعلق رکھتا ہو یا مسلمان ہو کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی دریافت نے دنیا جہان کے میڈیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے جس کا ملاحظہ انٹرنیٹ پر جا کر آپ بھی کر سکتے ہیں۔ ہالی وڈ کی جس فلمی کمپنی نے کشتی کی دریافت کے سارے عمل کے حقیقی مناظر کو فلمایا تھا وہ ان تمام مناظر کو جوڑ کر نوح(Noha) نامی فلم کی نمائش کی تیاری بھی پورے زور شور سے کر رہی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا ایک اور منظر جوارارات یا جودی کے پہاڑی سلسلے میں دریافت کی گئی









حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جوارارات یا جودی کے پہاڑی سلسلے میں دریافت کی گئی





اللہ تبارک تعالیٰ کی اِنہیں کتابوں میں موجود آپ ان آیات کا بھی تفصیلا مطالعہ کر چکے ہیں جن میں موت کے بعد دوبارہ زندگی ملنے کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔بعض آیات موت کے بعد ملنے والی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالتی ہیں اور بعض آیات میں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیا علیہا السلام بھی پیدائشِ نو کے ذریعے دنیا میں دوبارہ تشریف لا چکے ہیں۔ یہ بات عقلی طور پر بھی درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ زندگی کے ایک مختصر سے دور میں اپنے ہی جیسے لوگوں کے درمیان کھڑا ہوکر کوئی بالکل الگ سی بات کیسے کہہ سکتا ہے؟ ایک بت تراش کا بیٹا باپ کے بنائے ہوئے بتوں کی مخالفت مول لیتے ہوئے انہیں توڑ دے ! شاہی محل میں پلا ہوا شہزادہ خدائی دعوی کرنے والے باپ سے جنگ کرے! کوئی جلتی آگ میں بھسم ہوجانے کے ڈر سے بھی پیچھے نہ ہٹے اور نمرود کے سا منے سینہ تان کے کھڑا ہوجائے!۔ یا پھر کوئی مشرکانہ عقائد کے خلاف کلمۂ توحید بلند کرتے ہوئے لات ومنات اورعزہ جیسے نامی بتوں کو چکنا چور کردے اور ظلم کی چکی میں پستی ہوئی انسانیت کو ان کے حقوق دلوانے کے لئے اکیلا ہی اٹھ کھڑا ہو۔اتنی باکمال، عظیم الشان اور جلیل القدر شخصیات کیا زندگی کے ایک مختصر سے دور میں ہی اپنی ذہنی ارتقاء کے تمام مدارج یک لخت طے کر کے نبوت کے منصبِ اعلی پر فائز ہوگئیں؟۔

یہ سب سوچنے اور غوروفکر کرنے کی باتیں ہیں !۔ایک لائف ٹائم یعنی ایک زندگی کے مختصر دورانیے میں کسی کے شعور کی اتنی نشونما نہیں ہوسکتی کہ وہ جس ماحول میں پلا بڑھا ہو اس ماحول سے نکل کر بالکل ہی کسی اور دنیا کی باتیں کرنے لگے۔پہلی زندگی میں تو شعور کی ارتقاء کا بمشکل آغاز ہی ہوتا ہے۔اس کے بعد بار بار موت وحیات کے عوامل سے گزر کے عقل وشعور اور ذہنی پختگی حا صل ہوتی ہے۔ جہاں سارا معاشرہ ہی جھوٹ بولتا ہو وہاں جھوٹ کو کوئی کیسے برا سمجھے گا؟ چا جا ئیکہ بہت سی زندگیوں اور بہت سے معاشروں میں رہ کر شعور کی مکمل ارتقاء نہ ہوگئی ہو۔اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے بھی انبیا علیہ السلام کو لوگوں میں سے چننے کا کوئی معیار تو ضرور مقرر کیا ہوگا۔جس کی روح میں اتنی بالیدگی ہو کہ وہ وحی کو قبول کرلے۔جس کا ذہن اتنا پختہ (Mature) ہو چکا ہو کہ وہ اچھے برے، صحیح اور غلط میں قطعی تمیز کر سکے۔ جو اتنا مضبوط ہو کہ طاغوت کے سامنے سر نہ جھکائے اور بڑے سے بڑے مشکل حالات میں بھی خندہ پیشانی سے سرخرو ہو سکے۔پہلی زندگی کا دور تو وہ ہو تا ہے جس میں انسان اپنے پیچھے سے آنے والی آہٹ سے بھی ڈر کے بھاگ جاتا ہے وہ کسی شیطان کا مقابلہ کیا کرے گا؟۔اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو بعض ایسے لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں جن میں سوجھ بوجھ اپنے ہم عصر لوگوں سے کم دکھائی دیتی ہے۔وہ ایک ہی بات کو بار بار سمجھانے پر بھی ٹھیک سے نہیں سمجھ پاتے۔انہیں عرفِ عام میں لوگ بے وقوف کہتے ہیں۔درحقیقت یہ لوگ بے وقوف نہیں ہوتے بلکہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہونے کی وجہ سے ابھی اپنے شعور کی نشونما ہونے کے ارتقائی مراحل طے کر رہے ہوتے ہیں مگر صلاحیت ان میں بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی دوسرے لوگوں میں۔ جو لوگ جھٹ سے بات سمجھ جاتے ہیں اور ہر چیز میں آگے آگے دکھائی دیتے ہیں یعنی پڑھنے لکھنے میں اول، اپنے پیشے میں اول، ذہانت اور سمجھ بوجھ میں اول وہ لوگ یقیناً اپنی موجودہ زندگی سے پہلے بھی کئی زندگیاں گزار چکے ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ انصاف نہیں کہ ایک کو تو اللہ نے ذہین وفطین بنا دیا اور دوسرے کو پرلے درجے کا بے وقوف۔اسی طرح کئی لوگوں میں کوئی خاص ہنر یعنی ٹیلنٹ (Talent) پایا جاتا ہے جسے ہم بلا سوچے سمجھے خداداد صلاحیت کا نام دے دیتے ہیں۔ یہ خداداد صلاحیت اسی شخص میں کیوں پیدا ہوگئی اس کے ساتھ کے سبھی لوگوں میں کیوں نہیں آئی ؟۔انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی صلاحیت خداداد ہے یعنی خدا کی طرف سے ہے تو وہ سب میں ہونی چاہئے۔کیا یہ ٹیلنٹ یا خداداد صلاحیت گزشتہ زندگی میں حاصل کئے جانے والے کسی خاص علم اور اس کے استعمال کی وجہ سے ہونے والی شعوری نشونما کی نئے جسم میں منتقلی کے باعث تو نہیں؟۔ہیومن سائیکالوجی اور نفسیاتی سائنس کی اصطلاح میں اس عمل کو Transfer

of skill یعنی ہنر کی منتقلی کہا جاتا ہے۔ یہ تو آپ نے اکثر ہی دیکھا ہوگا کہ بعض نسبتاً کم پڑھے لکھے لوگوں کی لکھائی اتنی، پختہ، صاف شفاف اور موتیوں ایسی ہوتی ہے کہ دل کرتا ہے اسے دیکھتے ہی رہیں۔ یہ لوگ حقیقت میں میٹرک فیل کہلاتے ہیں اور کچھ تو اس سے بھی کم ہوتے ہیں جبکہ بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی لکھائی اتنی عمدہ نہیں ہوتی۔ اسی طرح بہت سے لوگوں کی ڈرائنگ بہت اچھی ہوتی ہے مگر وہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ فلموں کے بورڈ لکھنے والے بالکل ان پڑھ ہوتے ہیں مگر وہ ایسی کمال مہارت سے اداکاروں کی فوٹو اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں کہ اصل اور نقل میں تل برابر بھی فرق نہیں چھوڑتے۔ یہ سب اس کسب کا ہنر ہے جو گزشتہ زندگی سے ان کی موجودہ زندگی میں منتقل ہوا۔ بہت سے لوگ جب سیڑھیاں چڑھتے ہیں تو وہ بے خیالی میں اپنی پتلون یا پاجامہ دونوں ہاتھوں سے قدرے اوپر کو کر لیتے ہیں۔ خواہ ان سیڑھیوں پر قالین ہی پڑا ہو مگر کچھ لوگ پھر بھی یہ حرکت کرتے ہیں۔ یہ پچھلی زندگی میں پہنے جانے والے کھلے اور لمبے لمبے کپڑوں کو گندگی اور گیلی جگہ سے بچا کر چلنے کی وہ پختہ عادت ہے جو حال کی زندگی میں بھی منتقل ہوگئی۔ بہت سے لوگ بے دھیانی میں ایسی کئی حرکتیں کرتے ہیں جو آج کے دور کی نہیں ہوتیں۔ بعض کے منہ سے غیر ما نوس الفاظ اور ایسے جملے تک نکل جاتے ہیں جو ان کی زبان کے بھی نہیں ہوتے اور نہ ہی انھوں نے اپنی موجودہ زندگی میں انہیں کہیں سنا ہوتا ہے۔ کسی نئی جگہہ سے گزر ہو تو ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ وہاں کی ہر چیز جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ کچھ لوگوں سے مل کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ انہیں پہلے سے جانتے ہیں۔ کوئی پہلی ہی نظر میں دل میں سما جاتا ہے اور کوئی زہر دکھائی دیتا ہے حالانکہ آپ انہیں جانتے تک نہیں۔ یہ سب گزشتہ زندگی سے جڑی ہوئی باتیں ہیں جو پیدائشِ نو کے ذریعے انسانی یادداشت (memory) میں بیرونی جین (muted genes) کی منتقلی کی وجہ سے ایک دور کے جسم سے دوسرے دور کے جسم تک پہنچتی ہیں۔ مذکورہ بالا تجربات ان لوگوں کو بھی ہوتے ہیں جو اگلی زندگی پر یقین نہیں رکھتے مگر اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ اس حقیقت کو قبول نہیں کرتے۔

ہم قرآن سے پہلی کتابوں میں حضرت الیاس علیہ السلام کے ایک سے زیادہ جنم پڑھ چکے ہیں وہ کئی بار دنیا میں تشریف لائے مگر ان کی حیثیت ہر دور میں اللہ کے نبی علیہ السلام کی ہی رہی۔ قرآن بھی ان کو رسول تسلیم کرتے ہوئے ان کے ایک سے زیادہ جنموں کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ **سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ** (۳۷:۱۳۰)

معزز قارئین کرام اس ضمن میں سب سے پہلے سورہ الصافات کی آیت: ملاحظہ فرمائیے جس میں حضرت الیاس علیہ السلام کو رسولوں میں شمار کیا گیا۔

وَ اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ.

''اور بے شک الیاس رسولوں میں سے تھے۔'' (۳۷:۱۲۳)

اس کے بعد آنے والی آیات ۳۷:۱۲۴ سے لے کر ۳۷:۱۲۸ تک حضرت الیاس علیہ السلام اور ان کی قوم کے بارے میں تسلسل سے بیان چلنے کے بعد آیت ۳۷:۱۲۹ میں حضرت الیاس علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا: **وَتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ** (۳۷:۱۲۹) جس کا احمد علی صاحب نے ترجمہ کیا ہے: ''اور ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں چھوڑا'' شبیر احمد صاحب کا ترجمہ ہے: ''اور باقی رکھا ہم نے اس کے لیے پچھلی نسلوں میں'' محمود الحسان صاحب ترجمہ کرتے ہیں: ''اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں'' فتح محمد جالندھری صاحب کا ترجمہ ہے: ''اور ان کا ذکر (خیر) پچھلوں میں (باقی) چھوڑ دیا'' احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں: ''اور ہم نے پچھلوں میں اس کی ثنا باقی رکھی'' مودودی صاحب کا ترجمہ ہے: ''اور الیاس کا ذکر خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا'' دیگر مترجمین نے بھی اس آیت کا ترجمہ کچھ اسی انداز میں کیا ہے اور انگریزی ترجمہ بھی قریب قریب انہیں الفاظ میں ملتا ہے جیسے کہ And We left on him in the others یعنی ان کو ہم نے دوسروں میں چھوڑ دیا۔ **وَتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ** کا مطلب اور مفہوم ان تراجم سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ یہ تراجم خود بھی سمجھ نہیں آتے کہ ان میں کیا کہا جا رہا ہے؟ کسی نے کہا ''باقی رکھا'' کسی نے کہا ''چھوڑ دیا'' باقی رکھنا اور چھوڑ دینا یہ دونوں لفظ تو ایک دوسرے کی ضد (Antonym) ہیں اس کے علاوہ ثنا اور ذکرِ خیر کے الفاظ کہاں سے آ گئے؟ یہ تو قرآن کے عربی متن کا حصہ ہی نہیں ہیں! بچارے مترجمین بھی کیا کریں جب یہ بات ہی سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت الیاس علیہ السلام کو چھوڑا یا رکھا تو اس صورت میں ترجمہ مکمل کرنے کے لئے دو ایک اضا فی الفاظ اِدھر اُدھر سے پکڑ کے کام چلانے میں کیا حرج ہے؟۔

سورۃ الصافات (۳۷) کی زیرِ مطالعہ آیت (۱۲۹) میں لفظ ''**تَرَکْنَا**'' فعال فعل الماضی

”تَـــرَکْ“ (Active past verb) اور فاعل اللہ کی ضمیر المتکلم (Subject Pronoun) ”نَا“ کی ترکیبِ مجموعی سے بنا ہے۔ قرآن کی اس آیت کا اصل مطلب اور مفہوم سمجھنے کے لئے ہم سب سے پہلے بنیادی حروف ت ر ک کے مصدر ”تَرَکْ“ پر غور کرتے ہیں۔ مستند عربی لغات، کیمبرج کی لغت اور آکسفورڈ یونیورسٹی پرنٹنگ پریس کی لغت (Oxford Dictionary) میں ”تَـرَکْ“ کسی چیز کو ختم کرنے (end)، چھوڑنے (give up) مسترد کرنے (Rejection)، سلب کرنے (Disclaimer) اور کسی شے کو معینہ مدت تک روکے رکھنے یعنی قدرے توقف کے بعد باہر نکالنے (Drop Out) کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی لغت المعانی کے علاوہ کیمبرج اور آکسفورڈ کی مسلمہ لغات میں ”تَـــرَکْ“، کا تفصیلی مطلب کسی شے کو روکنا یا ٹھہرانا (stop over) اور اس کے بعد چھوڑ دینا (Let go, Drop out, left) بھی بتایا گیا ہے۔ ”تَرَكْ“ کے معانی میں کسی شے کو روکے رکھنے یا ٹھہرانے کا عمل مستقل طور پر یا ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا بلکہ عارضی یا کسی مقررہ مدت (appointed time) تک ہی ہوتا ہے۔ جیسے کسی شخص نے اپنی زندگی میں جو مال واسباب روک کے رکھا تھا وہ اس کے مرتے ہی اس کی گرفت سے چھوٹ کر آزاد ہو گیا

اس لحاظ سے اس کو ترکہ بھی کہتے ہیں جو مصدر ”تَرَكْ“ سے ماخوذ اسم ہے مگر ہمارے زیرِ مطالعہ آیت میں ”تَـــرَکْ“ کے فعل (verb) کی بات ہو رہی ہے جو اسی پس منظر میں رہ کر قدرے مختلف مطلب دیتا ہے۔ ہمارے یہاں ایک بھیڑ چال یہ بھی ہے کہ ہم ترجمہ کرتے ہوئے کسی لفظ کا مطلب اسلاف کے مقرر کردہ مروجہ بنیادی لفظ (root word) سے بعینہٖ اٹھا لیتے ہیں اور اس بات کو جاننا بھی گوارہ نہیں کرتے کہ ترجمہ کئے جانے والے قرآن کے لفظ کے اصل بنیادی حروف کس ماخذ سے نکل کر قرآن تک پہنچے ہیں اور ان کے مخرج سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ (Derivative Form) اپنی ہیت تبدیل ہوتے ہی تکوین (Form) کے قائدے کے مطابق اپنے معانی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مترجمین نے بھی ایک دوسرے کی نقل کرتے ہوئے بلا سوچے سمجھے اس آیت کے ترجمے میں ”تَـرَکْ“ سے ”ترکہ“ اٹھایا اور حضرت الیاس علیہ السلام کو متوفی بنا کر ان کے ترکہ میں آنے والے ذکرِ خیر اور ثنا کو دوسروں میں تقسیم کر دیا۔

بیشک ثنا اور ذکر تو صرف اللہ تبارک تعالیٰ کی ذاتِ گرامی کے لئے ہی مخصوص ہیں مگر چونکہ مترجمین کی رسائی متوفی حضرت الیاس علیہ السلام کے چھوڑے ہوئے مادی یا ظاہری ترکہ کی تفصیل تک نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا مادی ترکہ کے مدِ مقابل باطنی ترکہ کی اصطلاح گھڑ کے اس میں ثنا اور ذکر کو جڑ دیا گیا۔ تعریف کے اعتبار سے ”ترکہ“ متوفی کی زندگی میں باہر نکلنے (drop out) سے رکا رہتا ہے اور اس کی موت کے بعد منظرِ عام پر آتا ہے۔ اس لحاظ سے مترجمین کا کیا ہوا ترجمہ ”ہم نے اس کی ثنا اور ذکر دوسروں میں چھوڑا“ اگر ایسے ہی رہنے دیا جائے تو ایک نیا مسئلہ یہ کھڑا ہو جائے گا کہ کیا حضرت الیاس علیہ السلام کے جیتے جی مذکورہ ثنا اور ذکر کو روک کے رکھا گیا تھا اور جیسے ہی ان کی وفات ہوئی یہ رکاوٹ ختم ہو گئی؟۔ اگر کوئی پھر بھی اس پر بضد ہے کہ ”تَرَکْ“ سے جاری رکھنے، قائم رکھنے اور ٹھہرانے کی مراد لے کر مذکورہ ثنا اور ذکر کو آنے والی نسلوں میں ہمیشہ کے لئے دوام بخشا گیا تو بھی یہ شخص غلطی پر ہے کیونکہ مصدر ”تَـــرَکْ“ کے اطلاق سے کسی شے کا ”قائم رکھنا“، ٹھہرانا، اور جاری رکھنا“ بھی دراصل کسی عمل یا کسی شے کو اس کی کسی حالت میں ایک مدت تک روکنا ہی کہلاتا ہے جو تصریف آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ جو تیسری صورت بچتی ہے اس سے مراد ثنا اور ذکر کا اختتام (The End) کر دینا، اس پر ہاتھ کھڑے کر دینا (Give Up)، اسے مسترد (Reject) کرنا اور اسے مکمل طور پر سلب کر لینا (Disclaimer) شامل ہیں۔ لہٰذا لغات میں دیئے ہوئے معانی کی رو سے اس آیت کے سبھی تراجم سو فیصد غلط ثابت ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کی جن آیات میں مصدر ترک سے ماخوذ الفاظ ملتے ہیں ان تمام آیات پر غور و فکر سے تحقیق کے بعد تصریفِ آیات کی رو سے بھی یہ تراجم درست نہیں نکلے۔ قرآن کریم کی چند آیات آپ بھی ملاحظہ فرمایئے جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَ ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۶:۹۴)

”اور البتہ تم ہمارے پاس ایک ایک ہو کر آ گئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا وہ اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے ہو اور تمہارے ساتھ ان کی سفارش کرنے

والوں کو نہیں دیکھتے جنہیں تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے معاملے میں شریک ہیں تمہارا آپس میں قطع تعلق ہو گیا ہے اور جو تم خیال کرتے تھے وہ سب جاتا رہا۔" (۶:۹۴)

لَعَلِّیٓ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَکۡتُ کَلَّا اِنَّھَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَآئِلُھَا وَمِنۡ وَّرَآئِھِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ(۲۳:۱۰۰)

"امید ہے کہ میں کروں گا نیک عمل اپنی چھوڑی ہوئی دنیا میں، ہرگز نہیں! یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے۔ اب تو ان کے پیچھے برزخ ہے دوبارہ اٹھائے جانے کے دن تک۔" (۲۳:۱۰۰)

اَتُتۡرَکُوۡنَ فِیۡ مَا ھٰھُنَآ اٰمِنِیۡنَ(۲۶:۱۴۶)

"کیا تم یہاں کی نعمتوں میں چین سے توقف کئے ہوئے ہو؟" (۲۶:۱۴۶)

وَ لَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰہُ بِھَا وَ لٰکِنَّہٗۤ اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰہُ فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الۡکَلۡبِ اِنۡ تَحۡمِلۡ عَلَیۡہِ یَلۡھَثۡ اَوۡ تَتۡرُکۡہُ یَلۡھَثۡ ذٰلِکَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّھُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ.(۷:۱۷۶)

"اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آیتوں کے سبب اس کا رتبہ بلند کرتے لیکن وہ دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی خواہش کے تابع ہو گیا اس کا تو ایسا حال ہے جیسے کتا اس پر تو سختی کرے تو بھی ہانپے اور اگر چھوڑ دے تو بھی ہانپے یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا سو یہ حالات بیان کر دے شاید کہ وہ فکر کریں۔" (۷:۱۷۶)

قَالُوۡا یٰۤاَبَانَآ اِنَّا ذَھَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَ تَرَکۡنَا یُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَکَلَہُ الذِّئۡبُ وَمَآ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ کُنَّا صٰدِقِیۡنَ(۱۲:۱۷)

"کہا اے ہمارے باپ ہم تو آپس میں دوڑنے میں مصروف ہوئے اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس ٹھہرا گئے تھے تب اسے بھیڑیا کھا گیا اور تجھے ہمارے کہنے پر یقین نہیں اگرچہ ہم سچے ہی ہوں۔" (۱۲:۱۷)

وَلَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلۡمِھِمۡ مَّا تَرَکَ عَلَیۡھَا مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّلٰکِنۡ یُّؤَخِّرُھُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ(۱۶:۶۱)

"اور اگر اللہ لوگوں کو ان کی بے انصافی پر پکڑتا تو زمین پر کسی جاندار کو ٹھہرنے نہ دیتا لیکن ایک مدت مقرر تک انہیں مہلت دیتا ہے پھر جب ان کا وقت آتا ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔" (۱۶:۶۱)

وَتَرَکۡنَا بَعۡضَھُمۡ یَوۡمَئِذٍ یَّمُوۡجُ فِیۡ بَعۡضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَجَمَعۡنٰھُمۡ جَمۡعًا.(۱۸:۹۹)

"اور چھوڑ دیا ہم نے ان میں سے بعض کو اس دن سے کہ وہ گتھم گتھا ہوتے رہیں بعض کے ساتھ۔ پھر پھونکا جاتا ہے صور سو اکٹھا کریں گے ہم ان کو ایک ساتھ۔" (۱۸:۹۹)

وَلَقَدۡ تَرَکۡنَا مِنۡھَآ اٰیَۃًۢ بَیِّنَۃً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ(۲۹:۳۵)

"اور بیشک ہم نے اس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔" (۲۹:۳۵)

وَاتۡرُکِ الۡبَحۡرَ رَھۡوًا اِنَّھُمۡ جُنۡدٌ مُّغۡرَقُوۡنَ(۴۴:۲۴)

"اور سمندر کو ٹھہرا ہوا چھوڑ دے بے شک وہ لشکر ڈوبنے والے ہیں۔" (۴۴:۲۴)

وَتَرَکۡنَا فِیۡھَآ اٰیَۃً لِّلَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ(۵۱:۳۷)

"اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی ان لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں۔" (۵۱:۳۷)

وَلَقَدۡ تَّرَکۡنٰھَآ اٰیَۃً فَھَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ(۵۴:۱۵)

"اور ہم نے اس کو ایک نشان بنا کر چھوڑ دیا پس کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے۔" (۵۴:۱۵)

مَا قَطَعۡتُمۡ مِّنۡ لِّیۡنَۃٍ اَوۡ تَرَکۡتُمُوۡھَا قَآئِمَۃً عَلٰۤی اُصُوۡلِھَا فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ وَلِیُخۡزِیَ الۡفٰسِقِیۡنَ(۵۹:۵)

"جو کاٹ ڈالا تم نے کھجور کا درخت یا رہنے دیا کھڑا اپنی جڑ پر سو اللہ کے حکم سے اور تاکہ رسوا کرے نافرمانوں کو۔" (۵۹:۵)

وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَۃً اَوۡ لَھۡوَا ۨانۡفَضُّوۡۤا اِلَیۡھَا وَ تَرَکُوۡکَ قَآئِمًا قُلۡ

مَاعِنْدَاللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ(۶۲:۱۱)

''اور جب انہوں نے تجارت اور کھیل تماشا ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپک گئے اور تمہیں کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے۔ اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔''(۶۲:۱۱)

وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ(۳۷:۳۶)

''اور کہتے تھے کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟''(۳۷:۳۶)

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ(۱۱:۵۳)

''انہوں نے جواب دیا اے ہود، تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے، اور تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے، اور تجھ پر ہم ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''(۱۱:۵۳)

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ(۱۲:۳۷)

''یوسف نے کہا جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے وہ تمہارے پاس نہ آنے پائے گا کہ میں اس کی تعبیر اس کے آنے سے پہلے تمہیں بتادوں گا یہ ان علموں میں سے ہے جو مجھے میرے رب نے سکھایا ہے، بیشک میں نے ان لوگوں کا دین نہ مانا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت سے منکر ہیں۔''(۱۲:۳۷)

مندرجہ بالا آیات کا اگر مختصر جائزہ لیں تو آیت ۶:۹۴ میں ''تَـــرَكْتُمْ'' یہ واضح کر رہا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا مرنے والے نے سب کچھ یہیں چھوڑ دیا۔ غور کر کیا جائے تو یہ وہی اشیا ہیں جن کو متوفی نے اپنی زندگی میں روک کے رکھا ہوا تھا۔ اسی طرح آیت ۲۳:۱۰۰ میں چھوڑی ہوئی دنیا یعنی اس کے مال و متاع پر متوفی کا اس کی زندگی میں قبضہ تھا جو اس کی موت کے بعد چھوٹ گیا۔ یہ بھی ایک معینہ مدّت تک املاک کو روک کے رکھنے کے زمرے میں آ تا ہے۔ آیت ۲۶:۱۴۶ کا بیان ہمارے موقف کی تشریح خود کرتا ہے کہ دنیا میں لوگ ہمیشہ نہیں رہتے بلکہ تھوڑے سے توقف کے بعد دنیا چھوڑ جاتے ہیں۔ آیت ۷:۱۷۶ میں ''تـــــــــرکْ'' کتے پر تھوڑی دیر تک روکنے کے لئے آیا ہے۔ اسی طرح آیت ۱۲:۱۷ میں ''ترک'' حضرت یوسف علیہ السلام کو تھوڑی سی دیر کے لئے اسباب کے پاس روکنے کے معانی میں آیا ہے۔ آیت ۱۶:۶۱ میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پکڑ کرنے میں ایک مقررہ مدت تک رکے رہتے ہیں اور جب وہ گھڑی آ جاتی ہے تو اللہ کی پکڑ بلا تاخیر شروع ہو جاتی ہے۔ آیت ۱۸:۹۹ میں بھی روکنے کے کچھ مدت بعد جانے دینا واضح ہوتا ہے۔ آیت ۲۹:۳۵ میں بستی کی تباہی کے بعد اس کی نشانی کو تباہ ہونے سے کچھ عرصے کے لئے روک لیا گیا تھا جو بعد میں ختم ہوگئی اور اب موجود نہیں۔ آیت ۴۴:۲۴ میں کہا گیا کہ سمندر کو ٹھہرائے رکھیں۔ مگر سمندر ہمیشہ کے لئے نہیں روکا گیا۔ آیات ۵۱:۳۷ اور ۵۴:۱۵ کے بیان میں ترک کی ہوئیں نشانیاں آج باقی نہیں رہیں۔ آیت ۵۹:۵ میں جو کھجور کا جو دخت کاٹنے سے روک دیا گیا تھا وہ بھی آج وہاں نہیں رہا۔ آیت ۶۲:۱۱ میں جب لوگ نبیؐ کریم کو کھڑا چھوڑ کر کھیل تماشے کی طرف لپکے تو نبیؐ کریم بھی وہاں مستقل طور پر نہیں رکے رہے۔ اسی طرح آیات ۱۱:۵۳، ۳۷:۳۶ اور ۱۲:۳۷ میں ''تَرَكَ'' مسترد (Reject) کرنے کے معانی بیان کرتا ہے جو درحقیقت زندگی کی معینہ مدت تک ہی اثر پزیر رہتے ہیں اور موت کے بعد ان کا جواز بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اب ہم زیر بحث تراجم والی اس آیت کو تصریف آیات کے نتائج، مستند لغات میں دیئے ہوئے معانی اور صرف و نحو کے قواعد کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ(۳۷:۱۲۹)

قواعد کی رو سے ''وَ'' حرفِ ربط (Conjunction) یا باہم ملانے والا حرف ہے جو عموماً اور (And) کے معانی میں لیا جاتا ہے۔

تَـــرَكَ صیغہ ماضی کا فعال فعل (Active past verb) ہے جو ضمیر جمع المتکلم (Subject Pronoun) ''نَا'' کے ساتھ مل کر ''تَرَكْنَا'' بناتا ہے۔ تصریف آیات اور لغات کی رو سے اس کا مطلب ان الفاظ میں سمجھا جاسکتا ہے:

ہم نے ایک مدت تک روکے رکھا۔

ہم نے ایک مدت تک ٹھہرایا۔

ہم نے کسی قدر توقف کے بعد باہر نکالا۔

عَـلَيْـهِ: میں ”عَـلَـیٰ“حرفِ جر(Preposition) ہے جوواحد غائب کی مذکرضمیر (3rd person singular masculine pronoun)الـمتـصـلـه ”هِ“ سے مل کر سابقہ جملے میں بیان کئے گئےشخص کی ذات پر رجعت کرتا ہےیعنی کہی جانے والی بات براہ راست حضرت الیاس علیہ السلام کی ذات کی طرف جارہی ہے نہ کہ ان کے کسی مادی یا تراشیدہ روحانی ترکہ میں آنے والے ذکروثنا کی طرف۔اس کا ترجمہ بالکل ایسے ہی کیا جائے گا جیسے کسی کے نام کی بجائے اس کی ضمیر کا ترجمہ کرتے ہیں مثلاً:اسے،اس کووغیرہ۔

فِي: حرف جر(preposition) ہے جو”میں“(in) کے معانی دیتا ہے۔جیسےفـي الـمـنـزل یعنی خاص گھر میں(In the House),فيــجــد یعنی جدہ میں(In Jeddah)۔قائدے کے لحاظ سے کسی خاص یاعام”میں“(in) ہوتا ہے۔

ال: اسمِ خاص کا مادہ التعریف(Definite Article) ہے جو اسم ’آخرین‘ سے پہلے لگا ہوا ہے۔قاموس(thesaurus) میں ”ال“کی تعریف ذیل کے الفاظ میں کی گئی ہے جس کی ہو بہو نقل آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

One or more people or things already mentioned or assumed to be common knowledge۔

یعنی ایک یا ایک سے زیادہ لوگ اوراشیا جو پہلے بیان کی گئیں ہوں یا ان کے بارے میں عام علم رکھا جاتا ہو۔دوسری تعریف میں ”ال“کا استعمال بھی ذیل میں نقل کیا جارہا ہے۔

”ال“Used to mark a noun as indicating the best-known, most approved, most important, most qualifying and most satisfying

یعنی ”ال“،وہ اسم بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جومشہورومعروف ہو،سب سے زیادہ تائید شدہ یعنی وافق معظم ہو،سب سے زیادہ اہم ہو،سب سے زیادہ قابلیت اوراہلیت رکھتا ہواور سب سے زیادہ اطمنان بخش ہو۔

چونکہ”ال“ کے بعد آنے والے لفظ ”آخِـرِين“،میں شامل لوگوں کی الگ سے وضاحت نہیں کی گئی اور نہ ہی انہیں کوئی جانتا ہے کہ یہ بعد میں آنے والے دوسرے لوگ کون ہوں گے؟ لہٰذا ”آخِـرِيـن“ کے ”ال“ سےصرف وہی لوگ منسوب کئے جائیں گےجن کا حوالہ اورتعریف اس سے پہلے کی آیات میں واضح طور پر ملتے ہیں۔گزشتہ آیات میں مجموعی طور پر پانچ انبیا علیہ السلام کی بات ہورہی ہےاورخصوصی طور پرحضرت الیاس علیہ السلام کے بارے میں بیان جاری ہے۔

اس کے علاوہ ”ال“ضمیر برہانی(demonstrative pronoun)یعنی اسمِ اشارہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے جو پہلے جملوں میں مزکورشخصیات کی ضمیرنمائشی ہونے کی وجہ سے انہیں شخصیات کو پھر سے رجوع کرنے پر معروف اورمعتبر دلیل ہے۔لہٰذا”ال“ پچھلی آیات کے متن میں دی ہوئیں جانی پہچانی شخصیات کی طرف اشارہ کر کے اس کے بعد آنے والے اسم ”آخِرین“ کوانہیں شخصیات کی دوبارہ آمد پر دلیل پیش کرتا ہے۔

ہمارے زیرِمطالعہ آیت میں”ال“صیغۂ جمع کے اسم ”آخِـرِين“ یعنی”آئندہ آنے والوں“ سے پہلے آیا ہے جو ”آخِـرِين“ میں امتیاز کرتے ہوئے انہیں عام لوگوں سے الگ کر کے خاص الخاص لوگوں کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔لہٰذا قواعد کی رو سے ”آخِـرِين“ مشہورومعروف،معظم، اہم،اہل،قابل اوراطمینان بخش ہوں گے۔یہ سب گن ہم جیسے عام لوگوں میں تو نہیں ملیں گے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان میں سے ہم میں ایک بھی گن موجود نہیں۔اس لئے جن ”آخِـرِين“ کی بات یہاں قرآن کررہا ہے وہ یقیناً انبیا علیہ السلام سے کم حیثیت کے بالکل نہیں ہوسکتے کیونکہ مذکورہ خصوصیات انبیا علیہ السلام کی ذات گرامی میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔

مزید یہ کہ ہمارے زیرِمطالعہ آیت ”وَتَـرَكْـنَـا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ“(۱۲۹:۳۷) سے پہلی آیت ”اِلَّا عِبَـادَ اللّٰهِ الْـمُخْلَصِيْنَ“(۱۲۸:۳۷) میں”مگر جواللہ کے خالص بندے ہیں“ کہہ کر اس بات کو بخوبی واضح کردیا گیا کہ ”وَتَـرَكْـنَـا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ“میں آئندہ آنے والے خاص لوگ کون ہوں گے؟۔اسی سورہ کی مندرجہ ذیل آیات میں ”الْـمُـخْـلَـصِيْـنَ“ کی تعریف بھی ایسے کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ذکر(کتاب) دیا گیا تھا۔ ”لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ“(۱۶۸:۳۷) کاش!ہوتا ہمارے پاس بھی کوئی ذکر (کتابِ نصیحت) جوملا تھا پہلے لوگوں کو(۱۶۸:۳۷)”لَـكُـنَّـا عِبَـادَ اللّٰهِ

الْمُخْلَصِيْنَ"(۱۶۹:۳۷) تو ہم اللہ کے خالص بندے ہوتے۔(۱۶۹:۳۷)

لہٰذا قرآن کریم نے خود ثابت کردیا کہ "**الْمُخْلَصِيْنَ**" وہ ہیں جنہیں اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنا ذکر عطا فرمایا یعنی انبیا علیہ السلام اور "**الْاٰخِرِيْنَ**" بھی اللہ کے انہیں برگزیدہ انبیا علیہ السلام پر رجعت کررہا ہے کیونکہ "**الْاٰخِرِيْنَ**" والی آیت سے پہلی آیت میں بھی انہیں "**مُخْلَصِيْنَ**" کا حوالہ ملتا ہے۔

اب آپ تمام تراجم سے بے نیاز ہوکر زیر مطالعہ آیت کا ترجمہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کرسکتے ہیں۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ(۱۲۹:۳۷)

"ہم نے ٹھہرایا اسے اگلی بار آنے والے خاص لوگوں میں۔"(۱۲۹:۳۷ صحیح ترجمہ)

ہم ایوب ۲۱:۱ میں مطالعہ کرچکے ہیں کہ انبیا علیہ السلام بھی ماں کے پیٹ میں ٹھہر کے دوبارہ پیدا ہونے کی توقع کرتے ہیں۔ (**ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ** یہ وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔"(۲:۲) کے اسلوب پر سورۃ الحج کی آیت ۲۲:۵ میں اللہ تبارک تعالیٰ اسی انداز سے ان لوگوں سے مخاطب ہیں جو موت کے بعد دوبارہ پیدا ہونے پر یقین نہیں رکھتے۔(**يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ** "اے لوگو اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے۔"(۲۲:۵) تو اپنی پیدائش کے تمام پیچیدہ مراحل کو سامنے رکھو یعنی ماں کے پیٹ سے انسان کی پیدائش کے ایک ایک مرحلے کو نہایت علمی اور سائنسی انداز میں گنوانے کے بعد پیدائش نو کے منکرین کے تابوت میں آخری میخ ان الفاظ میں گاڑ دی گئی۔ (**وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا** "اور ہم جسے چاہتے ہیں رحموں میں مقررہ مدت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر ہم تمہیں بچہ بنا کر باہر نکالتے ہیں۔"(۲۲:۵) (**ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا**) پرغور کرنے سے یہ بات مزید واضح ہوجاتی ہے کہ جب انسان کو ماں کے پیٹ میں ڈالا گیا تو اس کی حالت کچھ اور تھی اور جب اسے ایک بچے کی شکل میں باہر نکالا گیا تو اس کی حالت اور ہوگئی یعنی اصل میں چیز وہی رہی صرف اسے بازیافت (Recycle) کیا گیا۔ سائنس کے الفاظ میں بھی کسی چیز کو فنا نہیں مگر وہ اپنا وجود قائم رکھنے کے لئے ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ کارخانہ قدرت میں ہر طرف یہی عمل کارفرماں ہے۔ ہم "واعظ ۱:۴۹" میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی اس وحی کا مطالعہ بھی کرچکے ہیں جس میں انسان کو کھلے لفظوں میں یہ معلومات فراہم کی جاچکی ہیں کہ "سورج تلے کچھ بھی نیا نہیں۔"

قرآن کی آیت ۶:۹۴ میں "**كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ**" کے مبارک الفاظ "جس طرح ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا" بھی انسان کی پیدائش کی بات اسی طرح کررہے ہیں جیسے لوگ ماں کے پیٹ سے پہلی بار پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ "**خَلَقْنَا**" کے ساتھ "**اَوَّلَ مَرَّةٍ**" کے الفاظ انسان کے ایک سے زیادہ بار پیدا ہونے کو بھی ظاہر کرتے ہیں ورنہ تعداد (Turn) کے لحاظ سے "پہلی بار" بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یعنی اگر پہلی بار کہا گیا تو یقیناً دوسری، تیسری، چوتھی اور کئی بار اسی طرح پیدائش کا سلسلہ ہوگا۔ ورنہ "**اَوَّلَ مَرَّةٍ**" کے اضافی الفاظ کو استعمال کرنے کی کوئی اور وجہ دکھائی نہیں دیتی "**خَلَقْنَا**" اکیلا وہی مطلب دے سکتا ہے جو ہمارے نظریاتی تراجم اور تفسیروں میں ملتا ہے یعنی "جس طرح ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا۔" **كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ** والی مکمل آیت ۶:۹۴ ان علماء کو بھی غور سے پڑھنی چاہئے جو پیدائش نو کے خلاف دلیل گھڑنے میں عقل کی پٹڑی سے اتر کر پیدل دوڑ لگاتے ہوئے "**اَوَّلَ مَرَّةٍ**" کو قبل از وجود کی مردہ (Dead) حالت سے وجود میں آنے کی حالت قرار دیتے ہیں۔ جبکہ یہاں قرآن کے بیان میں "**اَوَّلَ مَرَّةٍ**" پیدائش بھی اسی طرح ماں کے پیٹ سے ہی بتائی جارہی ہے جیسے بعد والی پیدائش۔ اس تحقیق میں جہاں بہت سے اور حقائق معلوم ہوئے وہاں اس راز سے بھی پردہ اٹھا کہ موت کے بعد جسمانی وجود سے الگ کرنے کے بعد حضرتِ انسان کو جہاں ٹھہرایا جاتا ہے وہ برزخ دراصل آنے والی یا اگلی ماں کا رحم ہی ہے۔ برزخ کے افسانوی طرز بیان والے دو مشہور و معروف مقامات علیین اور سجین جن میں نیک و بد الگ الگ رکھے جاتے ہیں وہ درحقیقت اچھے اور برے دو رحم ہیں۔ علیین یعنی صالح رحم سے نکلنے والے راستباز خوش وخرم اور شادمان زندگی میں فلاح پاتے ہیں اور اہل سجین یعنی جیل (prison) کے قیدی اپنی سابقہ زندگی میں کیئے ہوئے اعمال کی پاداش میں دکھ، درد، پریشانیوں اور مصیبتوں میں تاحیات گرفتار رہتے ہیں۔ یہ عمر قید کی سزا اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کے قائم کردہ قانونِ مکافاتِ عمل کی وجہ سے ان کی اپنی کرنی کی بھرنی ہوتی ہے یعنی

اپنی گزشتہ زندگی میں جو کسی نے بویا وہ اپنی آنے والی زندگی میں کاٹے گا۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ جو لوگ خوش وخرم ہیں وہ جنت میں رہ رہے ہیں اور جو ہر آن ذہنی کرب ہیں مبتلا ہیں، الجھنوں، پریشانیوں اور بیماریوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ غربت، تنگی اور طرح طرح کے مصائب کا شکار ہیں وہ سجین کے قیدی ہیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس انہیں بھی نہیں ہونا چاہئیے کیونکہ کتابِ مبارک یعنی قرآن کریم میں اللہ تبارک تعالی نے ان کی تربیت اور اس پر عمل پیرا ہو کر فلاح حاصل کرنے کا جامع پروگرام مرتب کر کے بھیج دیا ہے۔ اب یہ صرف انسان پر منحصر ہے کہ اگر وہ اللہ کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کو قبول کر کے اعمالِ صالح کے ذریعے اپنی فلاح و بہبود کے لئے عملی اقدام کرتا ہے تو آنے والا وقت اسے بھی خوشیوں اور شادمانیوں سے سرفراز کر سکتا ہے۔ اگر ابھی بھی عقل نہیں آئی اور گھمنڈ نہیں ٹوٹا تو آیندہ کی زندگی بھی سجین کے قیدی کی حیثیت سے اس سے بھی بدتر جہنم میں گزرے گی۔ قرآن کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

فَـاُمُّــهٗ هَاوِیَةٌ (۱۰۱:۹) مترجمین حضرات نے اس آیت کے تراجم بلا تحقیق کئے اپنے اپنے نظریات کی رو سے مندرجہ ذیل الفاظ میں کئے ہیں۔

وہ نیچا دکھانے والی گود میں ہے (احمد رضا خان)، اس کا مرجع ہاویہ ہے (فتح محمد جالندھری)، تو ہوگا اس کا ٹھکانا گہرا گڑھا (شبیر احمد)، اس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی (ابوالاعلی مودودی)، تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا۔ (احمد علی ۱۰۱:۹)

فَـاُمُّــهٗ قواعد کے لحاظ سے تین صرفی حصوں پر مشتمل ہے جن میں پہلا حصہ ''ف'' صدر بادئۃ عین (Designated Prefix) ہے جو سابقہ بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ بیان میں کہی جانے والی بات پر انتہائی زور دے کر کسی بات کا تقرر (Designate) کرتا ہے۔ کسی بات کا تعین (Determine) کرتا ہے، کسی بات کا اطلاق (Apply) کرتا ہے اور کسی بات کو انتہائی سچا اور تصدیق شدہ بنانے کے لئے بھی اس کے شروع میں ''ف'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ ''**اُمُّ**'' اسم ہے جس کے معنی ''ماں'' (Mother) ہیں جس کے آخر میں ''ہٗ'' واحد غائب کی اسمِ ضمیر (Pronoun-3rd person singular) ہے۔ یعنی ''اس شخص کی۔'' لہٰذا جس کے بارے میں بات چل رہی ہے ''اس کی ماں مقرر کی جاتی ہے'' (**هَاوِیَةٌ**) کے لفظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے

کیونکہ مروجہ تراجم وتفسیر میں دیئے ہوئے ''گڑھے، کھائی اور گود'' کی نامکمل معلومات سے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ اللہ تبارک تعالیٰ یہاں پر کیا فرما رہے ہیں۔

هَـاوِیَةٌ کو قدیم اور جدید روایات میں بھی جہنم کے گڑھوں میں سب سے گہرے اور چنگھاڑتی ہوئی ہولناک آگ کے گڑھے سے زیادہ کچھ نہیں کہا گیا۔ تعجب کی بات ہے کہ لوگ پھر بھی نہیں ڈرتے اور نا ہی اپنے اعمال درست کرتے ہیں بلکہ بہت سے لوگ تو اس بیان والے غیر قرآنی درس کے دوران باقاعدہ نیند کا مزہ بھی لیتے ہیں۔ کیونکہ اس بات میں وزن نہ ہونے کی وجہ سے واعظ اور سامعین دونوں ہی اس پر یقین نہیں رکھتے اور نا ہی کسی میں اللہ کا خوف وڈر پیدا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ درس سن کے بھی وہی کام کر رہے ہیں جو پہلے کرتے تھے کردار میں کوئی فرق نہیں پڑا بے ایمانی، بددیانتی، دھوکہ دہی، ناجائز منافع خوری اور ہر طرح کی بداعمالی اسی طرح چل رہی ہے۔ دوسروں کو کیا سمجھائیں گے جب درس دینے والوں کو خود بھی معلوم نہیں کہ ''**هَاوِیَةٌ**'' کیا ہے؟ اس کے باوجود اپنے آپ کو قرآن کا عالم کہتے ہیں اور لوگوں کو اکٹھا کر کے درسِ قرآن بھی دیتے ہیں!۔ ان کے پاس اپنی نااہلی چھپانے کے لئے جواز بھی قرآن سے موجود ہے کہ جس چیز کے بارے میں اللہ تعالی نے خود فرمایا ہو کہ اس کا ادراک تمہیں نہیں دیا گیا اس کا ادراک ہمیں کیونکر ہو سکتا ہے؟۔ اس مضمون کی تحقیق کے دوران بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ بہت سے پڑھے لکھے اور قرآن کا روایتی علم رکھنے والے دوستوں نے بار ہا یہی دلیل پیش کی جس کی وجہ سے تحقیقی کام کچھ دیر کے لئے تعطل کا شکار رہنے کے بعد دوبارہ اس وقت شروع ہوا جب یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ ''**وَمَآ اَدۡرٰکَ مَـاهِیَـهۡ**'' کا اصل مفہوم کیا ہے اور اس میں اللہ تعالی کیا فرما رہے ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالی کسی کو علم حاصل کرنے سے روک دیں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ علم کا خزانہ قرآن کی صورت میں ہمیں نہایت فراخ دلی سے عطا کر کے ایک طرف تو یہ فرمایا جائے کہ اس میں ہم نے ہر چیز کھول کھول کر وضاحت سے بیان کر دی اور دوسری طرف ''**مَـــــآ اَدۡرٰکَ مَـاهِیَـهۡ**'' میں فرما دیا جائے کہ ہم نے تمہیں اس کا علم نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے قرآن کی آیت ۱۷:۸۵ کے لفظ ''روح'' کو بعض علما نے قرآن تو کہہ دیا مگر ''اس کا بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے'' والا ترجمہ نہیں بدل سکے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے انسان کو قرآن کا بھی بہت تھوڑا سا علم دیا ہے۔

"ھَاوِیَۃٌ" کا انتہائی علمی، ادبی اور سائنٹفک لفظ استعمال کر کے اللہ تبارک تعالیٰ نے اس میں کیا کچھ سمو دیا ہمیں اس بات کا بالکل بھی ادراک نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا ادراک نہیں دیا بلکہ ہم نے نہ کبھی تحقیق کی اور نہ ہی غور و فکر کیا۔ بس جو کچھ بھی روایات سے چلا آ رہا تھا اس پر اپنے نام کا لیبل لگا کے آگے چلتا کیا۔ تحقیق ثابت کرتی ہے کہ بیشک یہ کلام خالقِ کائنات کا ہی ہو سکتا ہے جس نے صرف ایک ہی لفظ میں مکمل احتسابی اور تربیتی نظام سمجھا دیا گیا۔ جی ہاں احتساب کے ساتھ ساتھ تربیت بھی تا کہ انسان راہِ راست پر رہ کر کم از کم اس سے اگلی زندگی میں ہی کامیاب ہو سکے۔ "ھَاوِیَۃٌ" صرف گڑھا ہی نہیں بلکہ یہ ایک مکمل تربیت گاہ بھی کہلاتی ہے کیونکہ اس کو ماں کہا گیا اور تربیت بھی ماں سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معانی میں ہدایت (urge)، احساس، الفت، خواہش، ضرورت، طلب، بھوک، پیاس، بے چینی، اضطراب، غضب، غصہ، محنت، مشقت سختی، تنگی، کشیدگی، غیر آسودگی، بے سکونی، حقارت، شرمندگی، بے عزتی اور محاذ آرائی کے خواص بھی پائے جاتے ہیں جو زندگی میں سبق حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی لغت میں "ھَاوِیَۃٌ" کو خلیج، اندھیری سرنگ (dark tunnel)، زمین سے پانی نکالنے کے لئے کیا جانے والا سوراخ (deep passage drilled in the earth, wall or any thick body or the passage through a pipe or tube) کسی پائپ یا ٹیوب کی شکل کا نالی دار راستہ، اندھی کان اور اندھا گڑھا (Abyss) کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "ھَاوِیَۃٌ" کے لفظ میں پنہاں اس کے حقیقی خواص پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کولین کی لغت (Collins Dictionary)، ورلڈ کی لغت (world dictionary) اور قاموس میں بھی ملتے جلتے معانی دیئے گئے ہیں جو منجملہ طور پر ذیل میں نقل کئے جا رہے ہیں۔

Whim ھویٰ: یعنی جھکاؤ (inclination)، خواہش (wish)، جذبہ (passion)، پیار (love)، تمنا (desire)، لذت (pleasure)، لطف اندوزی (enjoyment)، لگاؤ (fondness)، چاہت، (longing)، پسند (liking)، ستائش (adoration)، فریاد (invocation)، تعریف (praise)، ہدایت و نصیحت (urge)، تعظیم (bow)، سجدہ بجا لانا (obeisance)، احترام (honor, respect)، تواضع (courtesy)، ادب (complaisance)، پرستار (fan)، حوصلہ افزائی (encouragement)، شمولیت (involvement)، حصہ لینا (participation)، حامی (supporter)، معاونت (aid, help)، طرف دار (advocate)، حامی (sponsor)، واپسی، پیچھے کی طرف لوٹنا (return, revert)، یقین کرنا (believe)، قبول کرنا (accept)، ماننا، تسلیم کرنا (acknowledge)، دوبارہ رابطہ (retouch)، رحم (womb)، پیٹ (matrix)۔

"ھَاوِیَۃٌ" میں واقع ہونے والی سرگرمیاں:

ہدایت و نصیحت (urge) اصرار اور تقاضہ (insist)، بیداری (arouse)، جذبات (sentiments)، ہلچل (bustle)، سرگرمی (activity)، تحریک (movement)، جوش و خروش (enthusiasm)، تصور (visualisation)، عمل (action)، ردِ عمل (reaction)، عزیزی (beloved)، نظرِ ثانی (revision)، تراش خراش (touch-up)، سکڑنا (shrink)، عہد (covenant)، معاہدہ (agreement)، گود لینا (adoption)، داخلہ (admission)، التفات (convolution)، تفصیلات (elaboration)، پیچیدگی (complication)، انحراف (detour)، حرکتِ موجی (sinuosity)، ترنگ (undulation)، ارتعاش (vibration)، عدم تحفظ (insecurity)، تزلزل (shake)، پریشانی (disturbance)، بگاڑ (distort)، موڑ (twist)، تحمل، رواداری، برداشت (tolerance)، صبر (patience)، گھما (swing)، لولک (pendulum)، اتار چڑھا (fluctuation)، طوفان (storm)، پھونکنا (blow) سانس (breathe)، عملِ تنفس کے ذریعے حلول (inhale)، الہام (inspiration)، القا (induction)، بیندھا ہوا سوراخ، چھید (piercing)، ثقب (puncture)، تحقیق (investigation)، تفتیش (interrogation)، اعادہ (retouch)، پوچھ گچھ (investigation)، روشنی (illumination)، مرطوب (wet)، رطوبت (moisture)، نمی (humidity)، ترمادہ (wetness)، آبِ دہن (saliva)، جنسی اختلاط (mixed sex)، عضوِ تناسل (phallus)، راستہ (entrance)، اچھل کر نکلنا (bounce)، صحت مندی لوٹانے کی جگہ (rebound)، براہِ راست (direct)، واپسی، رجع (return)، عمل

درآمد (implementation)، محنت(labour)، سخت گیری(hardship)، اشتعال، غصہ (anger, furious)، اضطراب(anxiety)، تشویش(concern)، کشیدگی(Strain)، فکر (worry)، تکلیف(discomfort)، پھٹکار(curse)، طاعون(plague)، اضافہ (rise) الأصل، یعنی نکلنے کا مقام (Origin)، مان الوصول یعنی منزل (Destination)، پیداوار (growth)، منبع(source)، دیکھ بھال(care)، عارضی پڑا(transitory)، وقتی(Momentary)، تنگ عرصۂ حیات(short-lived)، مختصر(brief)، گزرگاہ (passing)، عارضی (temporary)، ہیجان(excitement)، مسقط الرس یعنی جائے پیدائش، گھر، آبائی زمین اور جنم بھومی (Birthplace, Home , Native Land)، رحم مادر(womb) اور پیٹ(matrix)۔

"هَاوِيَةٌ" کا استعمال اور اس کی ساخت (Use and Mechanism):

"آلة رافعة"(Windlass) "مرفاع" بھی اسی سے بنا ہے۔ اور "هَاوِيَةٌ" سے ماخوذ فعل کسی بالواسطہ عمل کے معانی میں بھی آتا ہے۔ قاموس اور مصدقہ لغات کی تحریری نقل ترجمے کے ساتھ حاضرِ خدمت ہے۔

"هَاوِيَةٌ" A windlass for raising ore or water from a mine. Toraise,haul,ormovealoadbymeansofawindlass.(Oxford Dictionary)

"هَاوِيَةٌ آلة رافعة(Windlass) ہے کسی کان سے خام (کچ) یا پانی اٹھانے کے لئے۔ ایک بوجھ کو اٹھانا، گھسیٹنا یا حرکت میں رکھنا بذریعہ هاوِی ہوتا ہے۔ (لغتِ آکسفورڈ)

"هَاوِيَةٌ" A horse-drawn winch formerly used in mining to lift ore or water (Oxford Dictionary)

"هَاوِيَةٌ" گھوڑوں سے کھینچے جانے والا وہ چرخہ ہے جو پہلے کان کنی میں خام اشیا اور پانی کو اوپر کھینچنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ (آکسفورڈ لغت)

"هَاوِيَةٌ"Adevice for raising or hauling objects,usually consistingofahorizontalcylinderorbarrelturned by a crank, lever, motor, orthelike, upon which a cable, rope, or chain winds,the outerend of the cable being attached directly orindirectly to the weight to be raised or the thing to be haule dorpulled; winch. Its verb form (هوی) is used with objects. (Collins Dictionary).

"هَاوِيَةٌ ایک ایسا نظام ہے جو اشیا کو اٹھاتا یا کھینچتا ہے۔ یہ عام طور پر افقی سلنڈر یا برمیل (ڈرم) کی شکل کا ہوتا ہے جو دستے یا موٹر ایسی چیزوں سے گھمایا جائے تو اس کے ساتھ بندھی ہوئی کیبل، رسی یا زنجیر اس کے سلنڈر پر چڑھ کر لپٹنے لگتی ہے جس کا دوسرا سرا اٹھائے جانے والے وزن سے یا اس چیز کے ساتھ براہِ راست یا بالواسطہ باندھا جاتا ہے جسے گھسیٹا جانا، اٹھایا جانا یا اوپر نکالنا ہو۔ جیسے کنویں سے پانی نکالنے کی رسے والی چرخی۔ اس کا مصدر ("هَوِیَ") اشیا کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ (کولین لغت)

"هَاوِيَةٌ" A machine for raising weights by winding a rope or chain upon a barrel or drum driven by a crank, motor, etc (World Dictionary)

دستے یا موٹر وغیرہ سے گھمائے جانے والے برمیل یا ڈرم پر زنجیر یا رسی لپیٹ کر وزن اٹھانے والی مشین۔ (ورلڈ لغت)

بالائی سطور کے مطالعے سے "هَاوِيَةٌ" کے بارے میں چار نکات سامنے آتے ہیں۔

(۱) یہ ایک گڑھے نما جگہ (pit) یا ہلاکت کے بعد بننے والی قبر ہے۔ (۲) اس کی شکل بیضہ نما یا لبوتری، اندر سے کھوکھلی اور اندھیری ہے۔ (۳) اس اندھیری کان میں کسی چیز کی نقل وحمل کے لئے رسے یا زنجیروں والا نظام استعمال کیا جاتا ہے۔ (۴) یہاں خاموشی نہیں بلکہ زندگی کی تمام سرگرمیاں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔

ان چاروں نکات کی تفصیل میں جانے سے پہلے "هَاوِيَةٌ" تک پہنچانے والے سلسلے کو قرآن کی نظر سے دیکھتے ہیں:

لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (۲۳:۱۰۰)

"امید ہے کہ میں اپنی چھوڑی ہوئی دنیا میں نیک عمل کروں گا۔" قرآنِ کریم کی آیت (۲۳:۱۰۰) کے پہلے حصے میں دیا گیا بیان اس شخص کا ہے جو اب دنیا میں نہیں رہا یعنی یہ بیان موت

کے بعد دیا گیا ہے جس سے پہلی بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ یہ شخص ظاہری موت کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں زندہ ہے۔ یعنی سائنس کی رو سے مادہ فنا نہیں ہوا بلکہ اس نے صرف اپنی شکل بدلی ہے۔ دوسرے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی بھی عدالت، کچہری، حوالات جرگہ یا صاحبِ اختیار کے سامنے کسی سوئے ہوئے شخص کا بیان نہیں لیا جاتا اور غشی کی حالت میں یا بگڑے ہوئے ذہنی توازن کے ساتھ دیئے گئے بیان کی بھی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا، اللہ تبارک تعالیٰ بھی اس آیت میں کسی سوئے ہوئے شخص کے بیان کی مثال نہیں دے سکتے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بیان ہمارے روایتی عقیدے کے مطابق ''قبروں میں سوئے ہوئے مردوں'' نے نہیں دیا بلکہ یہ بیان باہوش وحواس اس قبر میں دیا گیا ہے جہاں زندگی اتنی سوچ سمجھ اور عقل کے ساتھ پوری طرح موجود تھی کہ بیان دینے والے کو اپنی چھوڑی ہوئی دنیا اور اس میں جو کچھ بھی اس نے کیا تھا وہ سب اسے یاد تھا۔ اسی آیت میں دوسرا بیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے ''ہرگز نہیں! یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے۔ اب تو ان کے پیچھے برزخ ہے اس دن تک کہ اکٹھا کر کے دوبارہ اٹھائے جائیں'' (۲۳:۱۰۰) یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے بیان میں دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ اول یہ کہ بیان دینے والے شخص کی کہی ہوئی بات ناقابلِ یقین ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ اسی پرانی زندگی میں زندہ ہونے کے بعد یہ شخص سدھرنے والا نہیں۔ یہ دنیا میں جا کے پھر وہی کچھ کرے گا جس کے لئے آج اسے جھوٹا پچھتاوا ہو رہا ہے۔ اس بات کو ایسے بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ شخص کسی شکل میں دنیا میں واپس ضرور جائے گا ورنہ اس بیان کا کوئی مطلب نہیں۔ دوسری بات یہ فرمائی جا رہی ہے کہ ان کی موجودہ حالت اور دوبارہ زندہ کئے جانے کے دن تک ایک روک حائل رہے گی جس کا نام برزخ ہے پھر ان کی روح اور جسم کو اکٹھا کر کے یعنی ایک ساتھ ملا کے دوبارہ اٹھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ موت کے بعد انسان کا قیام برزخ میں ہوتا ہے لہٰذا مذکورہ شخص کا بیان بھی برزخ میں لیا گیا ہے کیونکہ اس آیت کے مطابق ابھی اس کے دوبارہ پیدا ہونے کا دن یعنی یوم المبعوث نہیں آیا۔

اب برزخ کی قرآنی تعریف ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن میں برزخ کا لفظ فقط چار آیات میں آیا ہے جن میں سے ایک آیت ۲۳:۱۰۰ کا حوالہ بالائی سطور میں موت اور دوبارہ زندہ ہونے کے درمیان کے (Intermediate Realam) مقام کو ظاہر کرتا ہے جہاں ایک معینہ مدت تک انسان کا قیام ہوگا۔ باقی کی تین آیات میں برزخ کی تعریف اور تفصیل قرآن نے نہایت سائنسی انداز میں بیان کی ہے جو آپ کے مطالعہ کے لئے حاضرِ خدمت ہے۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ

''دو سمندر مل کر چلنے والے۔'' (۵۵:۱۹)

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ

''ان دونوں میں پردہ حائل ہے کہ وہ حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔'' (۵۵:۲۰)

وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا

''وروہی ہے جو دو سمندروں کو ملا کر چلاتا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ وشور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جو انہیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔'' (۲۵:۵۳)

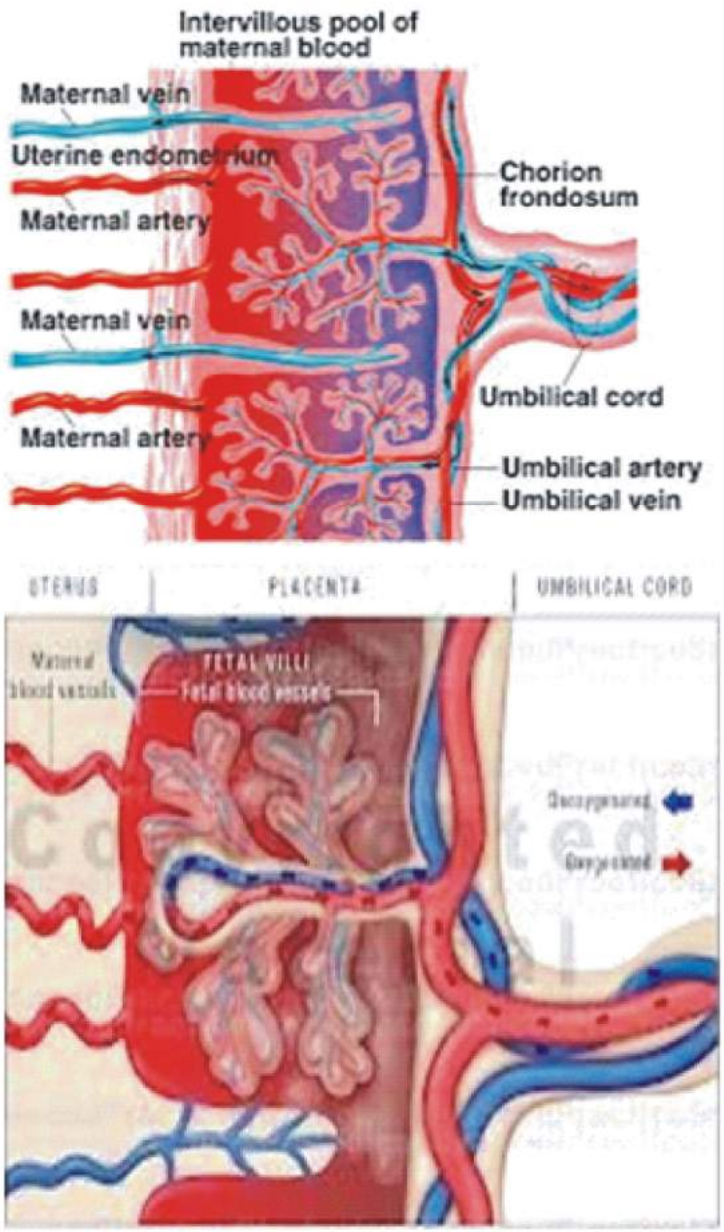
ہمارے علما کی تفسیروں میں عالمِ برزخ کا بیان مہابھارت کی من گھڑت کہانیوں سے بالکل بھی مختلف نہیں جن میں یہ لوگ بنا سوچے سمجھے زمین و آسمان کے قلابے ملاتے نہیں تھکتے۔ ہم نے بھی قرآن پڑھنا چھوڑ رکھا ہے۔ ہمارے مکتبہِ فکر کے بانی جو کچھ کہہ گئے ہمارا قرآن تو وہی ہے کیونکہ ہماری ہر دلیل اور ہر بحث کا انت انہیں کے الفاظ میں ہوتا ہے۔

لہٰذا، برزخ کی من گھڑت تفسیروں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی صحت کا کوئی مصدقہ حوالہ یا ٹھوس ثبوت موجود نہیں جس کی تصدیق سائنسی بنیادوں اور ان دریافت شدہ شواہد سے کی جا سکے جو قرآن میں بیان کی گئی برزخ کی تعریف پر پورے اترتے ہوں۔ لیکن ہماری تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ قرآن نے برزخ کی جو تعریف کی ہے وہ رحمِ مادر (womb) کے اس حصے پر بالکل پوری اترتی ہے جسے طبی سائنس میں ISTHMUS کہا جاتا ہے یعنی رحم کا وہ نظام جہاں جنین پرورش پاتا ہے۔ رحمِ مادر کے اس حصے میں ماں اور بچے کا گلوکوز والا میٹھا صاف خون اور مہلک فضلے سے آلودہ نمکین اور کسیلا خون ساتھ ساتھ بہتے ہیں مگر ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔ ISTHMUS کا عربی، اردو اور فارسی ترجمہ آپ کو ہر جگہ برزخ ہی ملے گا۔ ISTHMUS کے لفظ کو انٹرنیٹ

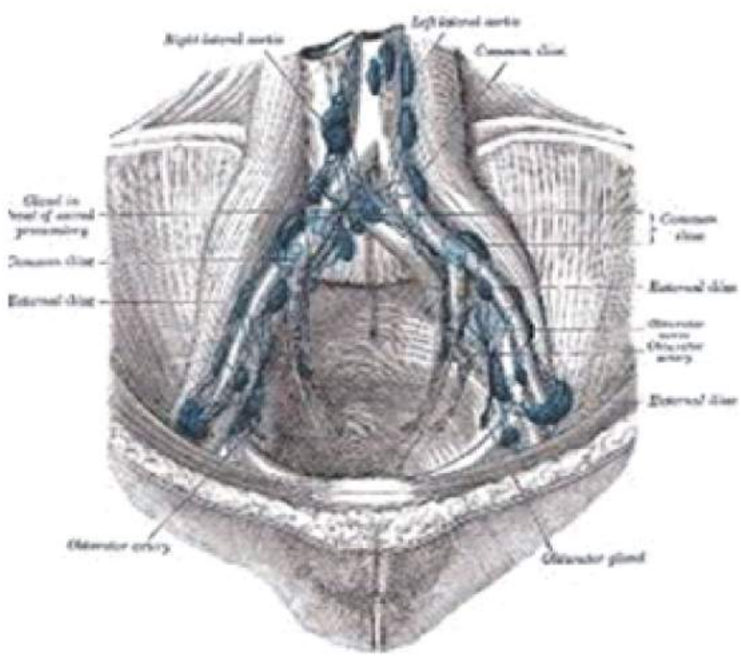
کے کسی مترجم یعنی google translate وغیرہ پر لکھ کر اس لفظ کا عربی، اردو اور فاسی ترجمہ دیکھ لیجئے یا اس لفظ کو کسی لغت یا قاموس میں دیکھیں گے تو آپ کو ISTHMUS کے معنی برزخ ملیں گے۔

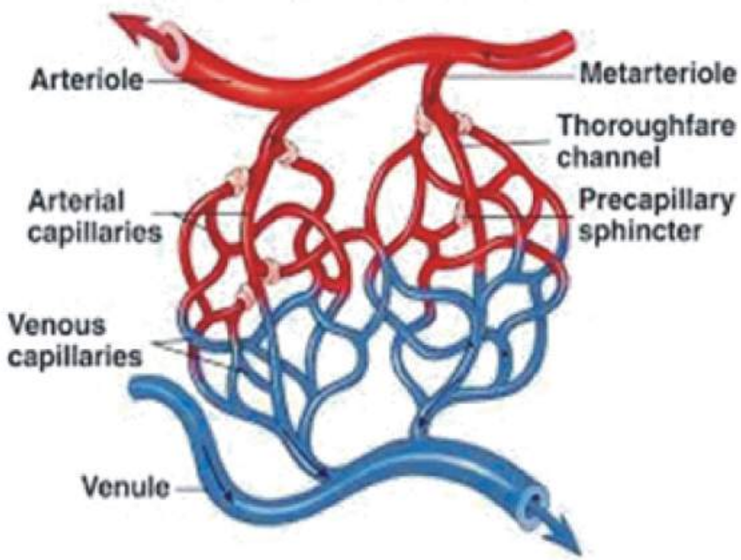
ماں کے رحم میں موجود ''برزخ'' سے خون کے بہاپر روشنی ڈالتے ہوئے سینٹ جسٹین اسپتال (St Justine Hospital) اور مونٹریال یونیورسٹی کے ماہر اطفال اور ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر جے۔سی۔فورون (J.C.Fouron) ناشر جان ویلی اینڈ سنز (John Wiley & Sons, Ltd) کی شائع کی ہوئی تحقیق ''برزخ میں خون کے بہاؤ کے نظام کے عمومی طریقے'' (Normal Isthmic Flow patterns) میں لکھتے ہیں کہ نوعیت کے اعتبار سے برزخ میں دورانِ خون کے نظام کی بڑی شریان کے اطراف میں شریانوں کے دوراستے بننے کی وجہ سے دل کے بائیں اور دائیں خانوں کا مسترد کیا ہوا ناکارہ مہلک خون برزخ میں خون کے بہاؤ کی سمت کے مخالف رہتا ہے۔یعنی دل کا بایاں خانہ خون کے حجم پر آگے کی طرف دباؤ ڈالتا ہے جبکہ دایاں خانہ اسے دھکہ دے کر پیچھے کی طرف کرتا رہتا ہے۔اور نتیجتاً برزخ میں بہنے والے خون کا راستہ دل کے دائیں اور بائیں خانوں کے دباؤ کے اشتراک کے تناسب اور جسم کے اوپر اور نیچے والے حصوں کے درمیان متوازن شریانی رکاوٹوں کی وجہ سے متعین ہوتا چلا جاتا ہے۔

جب دل کے دونوں نیم ہلالی والو بند ہوتے ہیں تو دل کے اعصاب کے تناؤ میں کمی واقع ہوتے ہی جسم کے نچلے حصے کی دونوں شریانی رکاوٹیں برزخ میں خون کے بہاؤ کی سمت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔خاص کر جسم کے بالائی حصے میں برزخ سے دماغ کی طرف بہنے والے خون اور نال کے حجاب (برزخی پردوں کی تہہ) میں بہنے والے خون سے بہاؤ کی سمت بدل جاتی ہے۔یعنی خون کا بہاؤ آگے کی طرف کم ہو جاتا ہے اور الٹی جانب خون کا بہاؤ اس وقت تک بڑھتا رہتا ہے جبتک برزخ میں پورے خون کا الٹا بہاؤ شروع نہ ہو جائے۔



(برزخ میں خون کے بہاؤ کے راستے)





(برزخ میں صاف اور آلودہ خون کے ساتھ ساتھ بہنے کے راستے)

ڈاکٹر جے۔سی۔فورون(J.C.Fouron) کی تحقیق ثابت کرتی ہے کہ برزخ رحم کا وہ حصہ ہے جس میں دوطرح کے خون یعنی آکسیجن اور گلوکوز والا میٹھا شفاف خون اور زہریلے مواد جذب کر کے واپس آنے والا نمکین اور کسیلا مہلک خون قرآن کی تعریف کے مطابق دودریاں کی طرح ساتھ ساتھ بہتے ہیں مگر ایک دوسرے سے الگ بھی رہتے ہیں۔

Normal isthmic flow patterns

Due to the disposition of the two arterial circuits oneach side of the aortic isthmus, blood ejected by the fetalLV and RV has opposite effects on the direction of flowthrough the isthmus. Left ventricular stroke volume willcause forward flow while right ventricular ejection willhave the opposite effect. The final systolicpattern of isthmic flow will be determined by the relativecontributions of left and right ventricular stroke volumes as well as the balance between vascular impedances of the upper and lower body.

In diastole, when the two semilunar valvesare closed, the direction of isthmic blood flow willbe influenced only by the two downstream vascularimpedances, especially in the brain for the upper body,and in the placenta for the subdiaphragmatic vascularsystem, meaning that forward flow is decreasedand retrograde flow increased to the point that net flowto the isthmus is retrograde.

J.-C. FOURON

The Fetal Cardiology Unit, Pediatric Cardiology Division,

Department of Pediatrics, St Justine Hospital, Universite de

Montreal, 3175 Cote Ste-Catherine, Montreal, Quebec H3T 1C5,

Canada (e-mail: fouron@sympatico.ca)Published by John Wiley & Sons, Ltd.

مک گل یونیورسٹی(McGill University) کیوبک کینیڈا کے پیشہ ورانہ صحت (Occupational Health)،**علم الإحصا الحیوی**(Biostatistics)اور **علم الأوبئة** (epidemiology) کی محقق، استاد، ماہر جینیات (Genetic Eoidemiology) بچوں میں خون کے سرطان (Leukemia)، دورانِ حمل رحم اور جنین میں ہونے والی پیچیدگیوں کی معالجِ خاص اور کینیڈا کے تحقیقاتی ادارے (Canada Research) کی رئیس ڈاکٹر کلیئر ان فینٹی ریوارڈ Dr.Claire Infante-Rivard) اور مشہور ماہرینِ اطفال اور اساتذہِ طب ڈاکٹر جے۔ رسکمپ (J.Ruskamp)، ڈاکٹر جے۔ گوسیلین (J.Gosselin)، ڈاکٹر ایف۔ پرولکس (Dr F.Prolux)اور ڈاکٹر ایم۔ جے۔ رابوئیسن (M.J.Raboisson) نے بھی رحم برزخ کی تعریف اور تشریح میں وہی ثابت کیا ہے جو قرآن برزخ کی مثال میں دو دریاؤں کے ساتھ ساتھ بہنے مگر ایک دوسرے سے الگ الگ رہنے کی تعریف میں کہتا ہے۔

وکی پیڈیا کے انسائیکلوپیڈیا میں بتایا گیا ہے کہ بچہ دانی کی برزخ کا نام (Iathmus Uteri) اصل میں لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ رحم کی برزخ (uterine isthmus) رحم کے عقبی حصے کے پست سے شروع ہو کر اس کے دھانے کے آخر تک جاتی ہے جہاں رحم کے عضلات (myometrium) پتلے اور تنگ ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے برزخ رحم کو مکمل کرنے والے حصوں یعنی رحم کے جسم اور اس کی تہوں پر چڑھ کر ان کے اگلی طرف جڑ جاتی ہے۔ رحم کی برزخ دورانِ حمل سکڑ جاتی ہے جسے حاجرہ کا مشہور نشان بھی کہا جاتا ہے۔

The uterine isthmus is the inferior-posterior part of uterus, on its cervical end here the uterine muscle (myometrium)is narrower and thinner. It connects superiorly-anteriorly to the complementary parts of the uterus: the body and the fundus. The uterine isthmus can become more compressibile in pregnancy, which is a finding known as Hegar's sign. http://en.wikipedia.org/wiki/Uterine_isthmus

علمِ طب کی تمام درسی اور مطالعاتی کتب میں حاملہ ماں اور اس کے رحم میں موجود بچے کے دورانِ خون کے نظام کی مکمل تفصیل موجود ہے جس کا مطالعہ کر کے آپ خود قرآن میں وحی کی گئی برزخ کی تعریف کا اطلاق اس پر ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کھلی آنکھوں سے سچائی جاننا چاہیں گے تو سچائی آپ کے سامنے روشن ہو جائے گی۔ نظریاتی عقائد کے اندھیروں میں تو خدا بھی نہیں ملتا برزخ کیا ملے گی؟ آپ کے مطالعے اور تجزیئے کے لئے میڈیکل کی کتابوں اور طب کی لغات سے نقل کی ہوئی تحریریں اور ان کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

Fetus Blood Flow

A fetus (baby)is fed, or nourished, by the mother through the placenta, which is attached to the umbilical cord. In the placenta, the mother's blood and the fetal blood both flow through vessels that are very close together. But the mother's blood does not mix with the fetal blood. When the mother's blood is close to the fetal blood, oxygen and nutrients move from the mother's blood into the fetal blood.

جنین میں خون کا بہاؤ:

جنین (بچے) کو خوراک یا غذا نال کے ساتھ جڑی ہوئی آنول کے ذریعے دی جاتی ہے آنول میں ماں کا خون اور بچے سے آنے والا مہلک خون وریدوں میں ایک دوسرے کے بہت نزدیک اکٹھے بہتے ہیں۔ لیکن ماں کا خون مہلک خون سے نہیں ملتا۔ جب ماں کا خون مہلک خون سے ملنے کے قریب ہوتا ہے تو آکسیجن اور غذائی اجزا ماں کے خون سے نکل کر مہلک خون کی طرف بڑھتے ہیں اور اس کو مہلک خون کے ساتھ ملنے سے روک دیتے ہیں۔

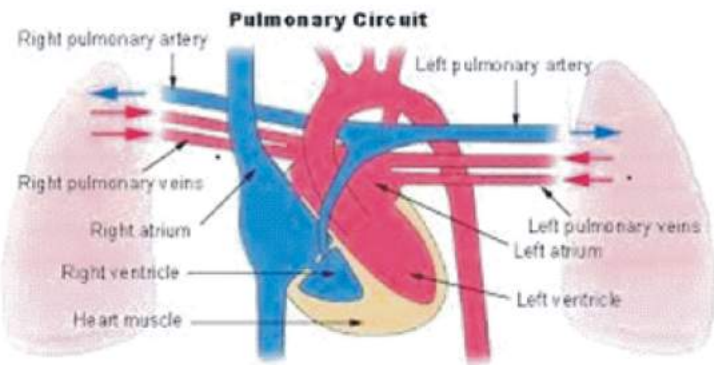
As the blood flows through the fetus, it picks up waste products and returns to the mother through the umbilical cord. The blood (with waste products from the fetus)goes through the mother's lungs and liver, where waste products are removed.

جنین میں سے گزرتے ہوئے خون جنین کا فضلہ اٹھا کر نال کے ذریعے واپس ماں کو منتقل کرتا ہے۔ یہ فضلے والا خون ماں کے پھیپھڑوں اور جگر میں سے گزر کے خون سے فضلے کو الگ کر دیتا ہے۔

Since oxygen is supplied by the mother, the fetus does not use lungs to breathe. Only a small amount of blood flows to the fetuss lungs. After birth, blood must flow to the babys lungs. Before birth, the mothers liver removes waste products for the fetus, so less blood flows through the fetuss liver.

جنین کو چونکہ آکسیجن ماں سے ملتا ہے اس لئے وہ سانس لینے کے لئے اپنے پھیپھڑے استعمال نہیں کرتا۔ بچے کے پھیپھڑوں کو خون کی بہت معمولی مقدار ملتی ہے اور بچے کی پیدائش کے بعد اس کے پھیپھڑوں میں دوران خون شروع ہوتا ہے۔ جنین کا فضلہ اس کے خون میں سے ماں کا جگر الگ کرتا رہتا ہے اس لئے پیدائش سے پہلے بچے کے جگر میں خون کا بہاؤ کم ہوتا ہے۔

Blood flows around the fetuss lungs and liver by going through an opening in the heart and through two extra blood vessels. This opening (called the foramen ovale)and the extra blood vessels (called the ductus arteriosus and the ductus venosus)normally close after birth.

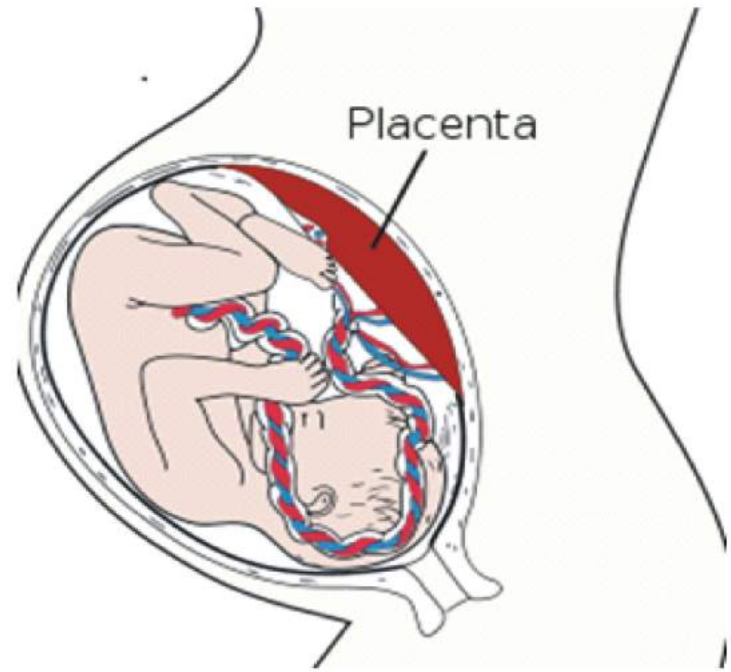


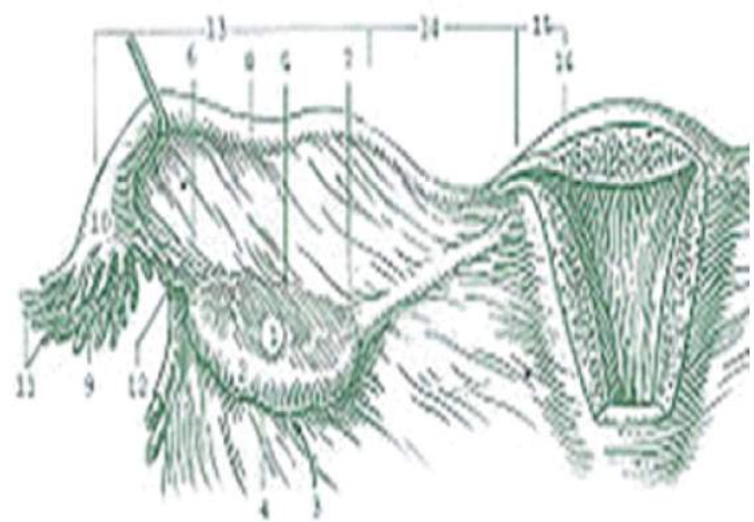
(جنین میں خون ساتھ ساتھ مگر الگ الگ راستوں سے بہتا ہے)

جنین کے پھیپھڑوں اور جگر میں خون دو فالتو وریدوں اور دل میں کھلنے والے ایک الگ راستے سے بہتا ہے۔ خون بہنے کا یہ الگ سے بننے والا راستہ بیضوی پائپ لائن کہلاتا ہے اور خون کی فالتو وریدیں **القناة الشريانية و القناة الوريدية** کہلاتی ہیں جو عام طور پر بچے کی پیدائش کے بعد بند ہو جاتی ہیں۔

برزخِ رحم: (اسم) رحم کے جسم اور دہانے سے متصلہ لمبا اور تنگ حصہ برزخ کہلاتا ہے۔ (امریکن ہیریٹیج میڈیکل ڈکشنری)

ISTHMUS OF UTERUS: (noun)an elongated narrow part of the uterus at the junction of the body of the uterus and the cervix.





برزخ(ISTHMUS)

(The American Heritage Medical Dictionary published by Houghton Mifflin)

برزخِ رحم: رحم کے جسم اور دہانے کے ملاپ کے مقام پر لمبائی میں تعمیر کی گئی ہے۔ (فار لیکس پارٹنر میڈیکل ڈکشنری)

ISTHMUS OF UTERUS is an elongated constriction at the junction of the body and cervix of the uterus. (Farlex Partner Medical Dictionary)

بچہ دانی پٹھوں سے بنا ہوا کھوکھلا عضو ہوتا ہے جو ایک جسم، طبقات، برزخ اور گلے پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مادہ ممالیہ کے حوضی خالی علاقے میں ہوتا ہے جس میں زرخیز بیضہ کی تخم ریزی ہوتی ہے اور وہ ترقی کرتا ہوا جنین بنتا ہے۔ اس کو مترا، رحم بھی کہا جاتا ہے۔ (امریکی موروثی اسٹیڈ مین کی میڈیکل لغت۔ ہاگٹن مفلن کمپنی سے شائع کی گئی۔)

Uterus is a hollow muscular organ consisting of a body, fundus, isthmus, and cervix located in the pelvic cavity of female mammals, in which the fertilized egg implants and develops into the fetus. It is also called metra, womb. (The American Heritage Stedmans Medical Dictionary)

(Published by Houghton Mifflin Company)

قارئینِ کرام علم الطب (Medical Science) کے مندرجہ بالا حوالے یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن میں بتائی جانے والی برزخ کہیں اور نہیں صرف ماں کے پیٹ میں ہے۔ اب ہم ”هَاوِيَةٌ“ کے بارے میں ابتدائی تحقیق کے نتائج سے حاصل کئے ہوئے چار نکات میں سے پہلے مندرجہ ذیل دو نکات پر بحث کرتے ہیں۔

(ا) یہ ایک گڑھے نما جگہ (pit) یا ہلاکت کے بعد بننے والی قبر ہے۔ -اس کی شکل بیضہ نما یا لمبوتری، اندر سے کھوکھلی اور اندھیری ہے۔



قدیم تاریخی گڑھی قبر (PIT)

موجودہ زمانے کی قبر



گڑھی قبر (PIT GRAVE)

انسانی تاریخ میں گڑھی قبروں (Pit Graves) کے شواہد ۴۰۰۰ سال قبل مسیح سے ملتے ہیں مگر حال ہی میں محکمہ آثار قدیمہ نے کانسی کے زمانہ قبل از تاریخ کی گڑھی قبریں بھی دریافت کی ہیں۔گڑھی قبور کی باقاعدہ تہذیب بھی ہے جو تاریخ میں Pit Graves Civilisation کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قبریں اندر سے کھوکھلی اور نالی نما ہوتی ہیں جو مضبوط دیواروں سے بنائی جاتی ہیں۔جن کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ پٹ (pit) یا گڑھا اور قبر ایک ہی چیز ہے اور اس کی شکل وصورت بھی ماں کے رحم سے ملتی جلتی ہے۔یعنی "هَاوِيَةٌ" ہی انسان کی اصل قبر ہے جو اس کی موت کے بعد برزخ میں یعنی ماں کے رحم میں بنتی ہے۔

آئیے علم الطب، سائنس اور میڈیکل لغات کی نظر سے رحم (Womb) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہاں پر ایک اور نکتہ قابل غور ہے کہ رحم اور برزخ ایک ہی چیز کے دو نام نہیں بلکہ میڈیکل سائنس دونوں میں واضح فرق بیان کرتی ہے۔علم طب کے مطابق رحم برزخ کے پردوں کی چار دیواری کے اندر ہوتا ہے۔دوسرے لفظوں میں رحم برزخ کی طبقاتی بافتوں کے حجاب یعنی برزخ کی پردہ دار تہوں کے اندر ہوتا ہے اور برزخ اس پورے نظام کا نام ہے جس میں جنین کو نئی زندگی مہیا کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے یعنی جنین کی پرورش کا مکمل نظام برزخ کہلاتا ہے اور رحم اس برزخ میں ایک خانہ (Housing) یا گھر ہوتا ہے جس میں جنین کو رکھا جاتا ہے۔گویا قرآن میں بیان کی ہوئی برزخ سے مراد اگلی زندگی کو پیدا کرنے والی جگہ ہے۔

Womb: The womb (uterus)of human female and certain higher mammals is the place in which anything is formed or produced. This is a hollow, pear-shaped organ located in a woman's lower abdomen between the bladder and the rectum. The narrow, lower portion of the uterus is the cervix; the broader, upper part is the corpus. The corpus is made up of two layers of tissue.Apart from medical science the word wombis also used in literature as 'the womb of time' and 'the interior of anything'.(World English and Medical Dictionary)

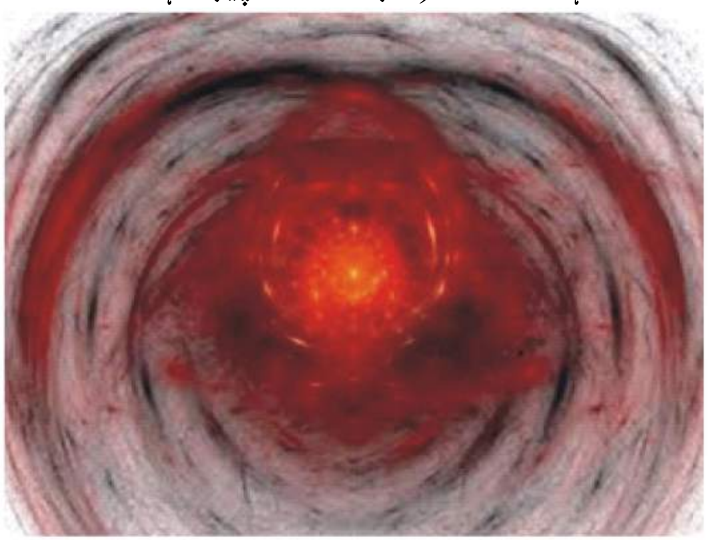
رحم: زنِ انسان اور بعض اعلی درجے کے ممالین میں رحم (بچہ دانی) وہ جگہ ہوتی ہے جہاں ہر ایک چیز کی تشکیل اور پیداوار ہوتی ہے۔ یہ خول جیسا کھوکھلا ناشپاتی کی شکل کا عضو ہوتا ہے جو عورت کے پیٹ کے نچلے حصے میں مثانے اور مقعد کے درمیان پایا جاتا ہے۔اس کا نیچے والا تنگ حصہ گردن اور اوپر والا چوڑا حصہ جسم یا تن کہلاتا ہے جو بافت کے دو طبقات یعنی ٹشو کی دو تہوں سے بنا ہوتا ہے۔رحم طبی سائنس کے علاوہ ادب میں 'وقت کے رحم' اور کسی چیز کے 'داخلی حصے' کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔(ورلڈ انگریزی اور طبی لغت)

Womb (uterus)is hollow space enclosing something esp, when dark, warm, or sheltering.This is a place where something is conceived. Is also called belly. (World Dictionary)

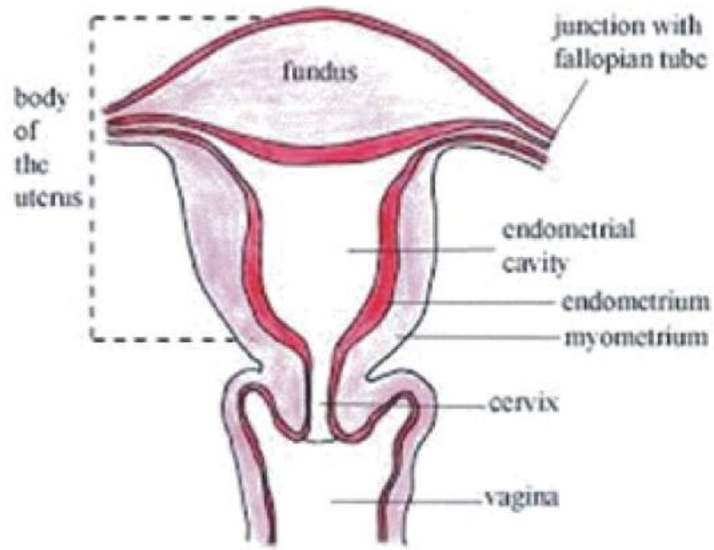
رحم (بچہ دانی) خاص قسم کی گرمائی والی، اندھیرے اور پناہ کی محفوظ کھوکھلی جگہ ہوتی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پر کسی چیز کو سینچا جاتا ہے۔اسے پیٹ بھی کہا جاتا ہے۔(ورلڈ لغت)

Womb is called Uterus in Anatomy which is a hollow muscular organ lying within the pelvic cavity of female mammals. It houses the developing fetus and by contractions aids in its expulsion at parturition.The corresponding organ in other animals. (Medical Dictionary)

رحم کو اناٹومی یعنی علم الاعضا میں بچہ دانی کہا جاتا ہے۔ جو مادہ ممالیہ کے حوضی گودال میں واقع خول نما عضلاتی اندام ہوتا ہے۔اس گھر میں جنین ترقی کرتا ہے۔اور یہ تشنج سے سکڑ کر اخراج کی مدد سے ولادت کرتی ہے۔ایسا ہی عضو دوسرے جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے۔(طبی لغت)



رحم(WOMB)



رحم(WOMB)

If you feel like youre in a pit, relax. Youre not the first person to find yourself looking up from within what feels like a deep, dark hole. .. (Genesis 37:536; 39, 2023; 41:1444.)

اگر تم ایسا محسوس کرتے ہو کہ تم ایک بند گڑھے میں ہو تو اطمنان رکھو تم پہلے انسان نہیں ہو جسے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی گہرے اندھیرے بل سے منہ اٹھا کے اوپر دیکھتا ہے۔

(ابتداء۲۳-۲۰،۳۹،۴۶-۱۵:۳۷)

''عورت کے رحم سے ایک بار نکلا ہوا شخص جب موت کے بعد واپس آتا ہے تو وہ اپنے تمام گناہوں سمیت دوبارہ وہیں بھیج دیا جاتا ہے جہاں سے وہ نکلا تھا۔ پھر جو لوگ اپنی غلط کاریوں کے نتائج سے بچ نکلنے کی توقع رکھتے ہیں وہ اپنے ساتھ ہونے والا سلوک خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔'' (عبرانیو۹:۲۷کے اصل متن کا ترجمہ)

ایوب ۱:۲۱ میں ہم مطالعہ کر چکے ہیں ''میں اپنی ماں کے پیٹ سے ننگا آیا تھا، اور ننگا وہیں واپس جاؤں گا۔''

ہم یہ حوالہ بھی دیکھ چکے ہیں جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیدائشِ نو یا سوئے ہوئے مردے کو جگانے کی تعریف میں فرمایا کہ ''کسی نئے جسم میں روح کی دوبارہ پیدائش پہلے سے موجود کسی زندہ جسم کے اندر یعنی ماں کے پیٹ میں ہی ہوتی ہے۔''

Jeremiah 20:17 (Orininal Hebrew Text)

אֲשֶׁר לֹא־מוֹתְתַנִי מֵרָחֶם וַתְּהִי־לִי אִמִּי קִבְרִי וְרַחְמָה הֲרַת עוֹלָם :(Text)

עוֹלָם (عالم، جہاں، دنیا world)، הֲרַת (موقد۔آگ کا تنور، چولہا Oven, Heater,Stove)، וְרַחְמָה (اور رحم، بچہ دانی And Womb)، קִבְרִי (قبر، مقبرے Tombs, Graves)، אִמִּי (اُم، ماں Mother)، וַתְּהִי־לִי (نہیں تھا میں There was)، מֵרָחֶם (افسوس Pity, feel sorry for)، מוֹתְתַנִי (مات، مرنا Muth,Mottni, to die)، לֹא־ (لا نہیں No)، אֲשֶׁר (کیوں، کونسا why ,which, who)

عبرانی متن کے مطابق ترجمہ: میں اپنی ماں کے رحم کی قبر میں ہی کیوں نہیں مر گیا تھا کیونکہ دنیا تو آگ کا تندور ہے۔ (یرمیاہ ۲۰:۱۷)

For he did not kill me in the womb, with my mother as my grave womb pregnantforever. (Jeremiah 20:17-INT)

تو نے مجھے ماں کے رحم میں ہی کیوں نہ مار ڈالا؟ تب ہی میری ماں کی کوکھ میری قبر بن جاتی اور میں کبھی جنم نہیں لیتا۔ (یرمیاہ: انگریزی بین الاقوامی ترجمے کا اردو ترجمہ)

הֲרַת یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا عبرانی میں تلفظ ''تنور'' ہے۔ اردو میں تندور، چولہا اور انگریزی میں Heath یعنی تپتی ہوئی سطح کو کہا جاتا ہے۔ مگر یرمیاہ کی اس آیت کے انگریزی ترجمے میں اس عبرانی لفظ تنور کو ''حاملہ'' (pregnant) سے بدل کے یہودیوں اور عیسائیوں کے تمام تراجم میں ''میری ماں کے رحم کی قبر ہمیشہ حمل سے یعنی ہری بھری رہے'' مندرجہ ذیل انداز سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

קִבְרִי וְרַחְמָה הֲרַת עוֹלָם =my grave womb pregnant ever(INT)

اگرچہ لفظ تنور הֲרַת کا ترجمہ بدل کر حمل یا ہرا بھرا کیا گیا ہے مگر عبرانی کی اصل عبارت میں رحم کو قبر (Grave wimb) کہنے والے الفاظ دنیا کے کسی بھی ترجمے میں نہیں بدلے گئے جس

سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن سے پہلے صحیفوں میں بھی ماں کے رحم کو ہی انسان کی قبر کہا گیا ہے جو موت کے بعد ہر ایک انسان کی قبر بنے گی خواہ کوئی قبر میں دفنایا جاتا ہے نہیں۔

لہٰذا، اس وحی میں رحم کو قبر کہا گیا ہے اور اس کے بعد دنیا کو تنور הַרְת (Hearth) سے تشبیہ دی گئی۔ آیئے تنور הַרְת یعنی Hearth کی تعریف اور معانی کو مصدقہ لغات کی مدد سے سمجھتے ہیں۔ ورلڈ (World)، رینڈم ہاس (The Random House Dictionary)، کولین (Collin)، آکسفورڈ (Oxford Dictionary) اور کیمبرج (Cambridge Dictionary) کی لغات میں اس کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

آگ کا بچھونا یا فرش (The floor of a fireplace)

تندور میں دھکتی ہوئی خوشنما آگ (A Cheerful fire burning in the hearth)

کسی کے گھر کی علامت طور پر (As a symbol of ones home) بھٹی کا پیندا یا نیچے والا حصہ جہاں پگھلی ہوئی دھاتیں جمع ہوتی ہیں (The base or lower part of the furnace , where motten metal collects) انگیٹھی کا اینٹ پتھر وغیرہ سے بنا ہوا فرش جو عام طور پر تھوڑا سا بڑھ کر کمرے کے اندر تک جاتا ہے۔

(The floor of a fireplace, ususlly of stone, brick, etc, often extending a short didtance into a room)

زبور کی مندرجہ ذیل آیات ۳-۲:۱۰۲ میں بھی عبرانی لفظ تنور הַרְת (Hearth) کا ترجمہ آگ ہی کیا گیا ہے۔

Hide not thy face from me in the day when I am in trouble; incline thine ear unto me: in the day when I call answer me speedily. For my days are consumed like smoke, and my bones are burned as an HEARTH. (Psalm 102:2-3)

مصیبت زدہ شخص کی دعا جب وہ افسردہ دِل ہو کر خدا کے حضور اپنا رونا روتا ہے:

میری زندگی ایسی گذر رہی ہے جیسے دھواں۔ میری زندگی ایسی ہے جیسے آہستہ آہستہ بجھتی آگ۔ (زبور 102)

تنور הַרְת (Hearth) مندرجہ بالا معانی میں تورات کے صحیفے ابتداء (Genesis) کی آیت میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔

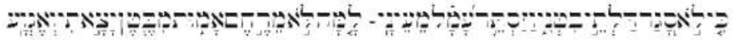
(Genesis 15:17 original Hebrew text):



(There appeared)a smoking oven and flaming-Genesis 15:17

(ایسے لگا) جیسے دھوئیں اور شعلوں والا چولہا۔ ابتداء ۱۵:۱۷

ایوب کی آیات ۱۱-۱۰:۳ میں بھی ماں کے رحم اور پیٹ سے قبر کا مفہوم ہی لیا گیا ہے۔ جس کے دروازے موت کے بعد ہر انسان کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔



(ایوب کی آیات ۱۱-۱۰:۳ کا عبرانی متن)

میری آنکھوں سے مصیبت چھپانے کے لئے مادرِ رحم کے دروازے مجھ پر بند نہیں ہوئے۔ میں پیدا ہوتے ہی ہلاک کیوں نہ ہو گیا اور پیٹ سے نکلتے ہی مر کیوں نہ گیا؟ (ایوب ۱۱-۱۰:۳)

For it did not shut the doors of the womb on me to hide trouble from my eyes.Why did I not perish at birth, and die as I came from the womb?)Job 3:10 New International Version-NIV)

ان کتابوں میں نازل کی ہوئی وحی پر ایمان لانا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا قرآن پر کیونکہ یہ بھی اللہ کی وحی ہے جس کو ساتھ لے کر چلنا ناگزیر ہے۔ خواہ ہم اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہلوائیں یا اہلِ حدیث۔ سنی کہلائیں یا شیعہ لیکن اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمیں قرآن کا اتباع بلا کسی تفریق کے کرنا ہوگا۔

وَالَّذِیٓ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ ہُوَ الۡحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ (۳۵:۳۱)

اور یہ جو وحی کیا ہے ہم نے تمہاری طرف کتاب میں سے یہی حق ہے جو تصدیق کرتا ہوا آیا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے موجود تھیں۔ (۳۵:۳۱)

قرآن اور اللہ تعالیٰ کی پہلے سے نازل شدہ کتابوں کے مابین حوالہ جات کی سچائی متعدد آیات کے ذریعے آپ کے گوش گزار کی جا چکی ہے۔ آپ کے مزید مطالعہ کے لئے ان کتابوں کا ایک

اور حوالہ حاضر ہے۔

צַדִּיקִים יִירְשׁוּ־אָרֶץ וְיִשְׁכְּנוּ לָעַד עָלֶיהָ (زبور۲۹:۳۷عبرانی متن)

صالح لوگ ہی زمین کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ کے لئے مقیم رہیں گے۔(زبور۲۹:۳۷کا اردو ترجمہ)

"The righteous shall inherit the land, and dwell therein for ever," (Psalm 37: 29 King James Version of the Bible)

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (قرآن۲۱:۱۰۵)

''اور بیشک ہم نے زبور میں اپنے ذکر کے بعد لکھ دیا کہ اس زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔''(قرآن۲۱:۱۰۵)

The verse in the Qur'an says "We have written in the Zabur after the reminder thatMy righteous servants shall inherit the earth."

زبور اور قرآن کے ایک جیسے حوالوں نے یہ بات حق ثابت کر دی کہ وقت کے تغیر و تبدل کا اثر اللہ تبارک و تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین پر نہیں پڑتا۔ زمانہ بدلتا ہے، کتابیں بدلتی ہیں اور وہ لوگ بھی بدل جاتے ہیں جن پر وحی کی جاتی ہے مگر اللہ کے قوانین اٹل ہیں جو نہ کبھی بدلے ہیں اور نہ ہی بدلیں گے۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (قرآن ۳۵:۴۳)

''پس تو اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا اور تو اللہ کے قانوں میں کوئی تغیر نہیں پائے گا۔''(قرآن۳۵:۴۳)

ہم اکثر اپنے مکتبۂ فکر کے غیر قرآنی خیالات دوسروں تک پہنچانے کے بعد دیگر آیات کی طرح اس آیت کا سہارہ بھی بلا خوف وخطر لیتے ہیں تا کہ ہمارے مکتبِ فکر کے بانیوں کے تراشیدہ نظریات کو اللہ کا حکم سمجھ کر بعینہٖ تسلیم کر لیا جائے۔ مگر یہ فاضل دوست اس حقیقت کو بالکل بھی جاننا نہیں چاہتے کہ اس آیت کا اطلاق صرف قرآن پر ہی نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہر وحی پر ہوتا ہے۔ لہٰذا، قرآن سے پہلی کتابوں میں جو قوانین وحی کئے گئے ہیں وہ بھی نہیں بدلتے اور ''ذکر'' صرف قرآن ہی کو نہیں بلکہ اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کو بھی کہا گیا ہے۔ بالائی سطور میں نقل کی گئی قرآن کی آیت ۲۱:۱۰۵ کے متن میں اللہ تبارک تعالیٰ نے زبور کو بھی اپنا ''ذکر'' ہی کہا ہے۔ لہٰذا، زبور میں دیئے گئے قوانین بھی نہیں بدلیں گے۔ دیگر آسمانی صحیفوں کو بھی اللہ کا ''ذکر'' کہا گیا اس لئے ان کے متن میں وحی کئے گئے قوانین بھی اٹل ہیں۔ اللہ کے اس ذکر سے انکار کا دوسرا بہانہ ہم یہ بناتے ہیں کہ کونسی ایک انجیل ہے لوقا، متی، مرقس اور یوحنا۔ اتنی ساری انجیلوں میں سے کس انجیل کی صحت کو درست تسلیم کیا جائے؟۔ اس لئے ہم ان کتابوں میں سے کسی کو بھی نہیں مانتے۔ اگر اس نظر سے دیکھیں گے تو قرآن کے بھی کئی نسخہ جات ہیں جن میں ہر ایک کے کئی کئی راوی ہیں یعنی ہم تک پہنچنے والے ہر ایک قرآن کے راویوں اور قاریوں کا ایک باقاعدہ الگ الگ سلسلہ ہے مثلاً امام حفص کا لکھا ہوا قرآن ''حفص'' پاک و ہند، دیگر ایشیائی ممالک اور دنیا میں جہاں جہاں ایشیائی لوگ آباد ہیں وہاں پڑھا جاتا ہے۔ یہ قرآن راوی حفص الاسدی، راوی شکوبا اور کوفی قاری ابوبکر عاصم کے سلسلے سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ امام ورش کا لکھا ہوا قرآن ''ورش'' مغربی افریقہ، سوڈان، تیونس، مراکش اور الجیریہ میں پڑھا جاتا ہے۔ جو مدینہ کے قاری نفی بن عبدالرحمٰن، راوی قالون، راوی ورش عثمان القطبی المارصی اور ابنِ نعیم کے سلسلۂ روایات سے منتقل ہوا ہے۔ اس قرآن کے دو نسخے ہیں جو ''ورش'' اور ''قالون'' کہلاتے ہیں۔ ورش اور حفص دونوں اماموں کے نسخہ جات میں قراءت کے علاوہ کہیں کہیں متن کے الفاظ کا بھی معمولی سا فرق ہے۔ سعودی عرب اور مصر میں دونوں قرآن پڑھے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سعودی حکومت حفص، ورش اور قالون نام کے تینوں قرآن شائع کرتی ہے۔ مشہورِ زمانہ خوش الحان قاری عبدلباسط کی تمام قرآت قرآن کے نسخہ ورش پر مشتمل ہے۔ اسی طرح قرآن الداری مکہ کے ابنِ کثیر، البازی اور قنبل کے روایتی سلسلے سے لوگوں تک پہنچا جس کے پڑھنے والوں کی اکثریت یمن میں ہے۔ جنگِ بدر کے مجاہد، کاتبِ وحی، حافظِ قرآن اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مشیرِ خاص اُبی بن کعب کا قرآن مصاحف کے نام سے ملک شام اور اردگرد کے

علاقوں میں پڑھا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن ''روبع'' کا نسخہ ترکی والوں نے سنبھالا ہوا ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ یہ سب ''ذکر'' تو اللہ تبارک تعالیٰ ہی کا ہے خواہ کسی بھی سلسلے سے ہم تک منتقل ہوا ہو پھر بھی یہ کلامِ حق ہے۔ بعینہٖ بلا کسی تخصیص قرآن سے پہلے نازل کی ہوئی وحی بھی اللہ تبارک تعالیٰ ہی کا ذکرِ مبارک ہے خواہ وہ کسی بھی ذرائع سے منتقل ہوتا ہوا قرآن کی تصدیق کردہ الہامی کتب کے اصل متن میں درج کیا گیا ہو۔ اللہ کے ذکر کو اگر اللہ کا پیغام (Message) مانا جائے تو بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ چونکہ ذکر میں یاددہانی (Reminder) اور دہرانے (Repeat) کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اس لحاظ سے ذکر اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ وحی الاول سے لیکر وحی الآخر تک یعنی قرآن اور اس سے پہلے نازل کی ہوئی تمام کتابوں کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔

قرآن اور اس سے پہلے نازل کی ہوئی وحی، لغات، قاموس، قدیم تاریخ، اساتذہِ طب، معالجین و محققینِ طب کی تحقیق، سائنس اور طب کی کتابوں کے حوالاجات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان تمام علوم کے مابین مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ سائنس کوئی اٹکل پچو یا کسی کے ذاتی خیالات پر مبنی بے بنیاد علم نہیں بلکہ اس کے مصدقہ اصولوں کی دریافت میں بیشمار محققین کی عمریں صرف ہو چکی ہیں اور اس کا ایک ایک بیان برس ہا برس کے مشاہدات اور تجربات کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ضابطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ آج کی ترقی یافتہ میڈیکل سائنس نے ۱۴۰۰ سال پہلے قرآن میں بیان کی ہوئی برزخ کی عملی منظرکشی اور تصدیق جس خوبصورتی سے کی ہے وہ بذاتِ خود کسی عظیم دریافت سے کم نہیں۔ برزخ کی دریافت کے بعد اس کی چاردیواری میں بننے والی قبر کی دریافت بھی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ آج کے قدامت پرست مذہبی علما اور ان کے جیالے پیروکار اس تحقیق اور دریافت کو تسلیم نہ کریں لیکن یہ دریافت دین میں تحقیق کرنے والوں اور مستقبل کے علما کے لئے ضرور مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ دین اور مذہب میں یہی بڑا فرق ہونے کی وجہ سے دونوں کے راستے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ دین بالکل سیدھا (straightforward) راستہ دکھاتا ہے اور بھٹک جانے والوں کو دوبارہ راہِ راست پر لے آتا ہے۔ جبکہ مذہب اپنی تعمیر کی ہوئی خودساختہ بھول بھلیاں میں خود بھی محوِ گردش رہ کر دم توڑ دیتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو بھی اسی بھول بھلیاں میں غرق رکھتا ہے۔ کتنے ہی مذہب آئے اور اپنی بساط لپیٹ کر چلتے بنے لیکن دین لازوال ہے جو روزِ اول سے وہی ہے اور روزِ آخر تک وہی رہے گا۔ یہی مشیتِ الٰہی ہے مگر افسوس کہ مذہب کی بھول بھلیوں میں گم انسان دین کو سمجھ نہیں پایا۔

''ھَـاوِیَۃٌ'' کی تحقیق میں جو چار نکات سامنے آئے تھے ان میں سے پہلے دو نکات پر سیرحاصل بحث کر کے مصدقہ دلائل سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ''ھَاوِیَۃٌ'' اصل میں مجرموں کی وہ قبر ہے جو ان کی ماں کے پیٹ میں بنتی ہے۔ تیسرے نکتے کی تفصیل آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

اس اندھیری کان میں کسی چیز کی نقل و حمل کے لئے رسے یا زنجیروں والا نظام استعمال کیا جاتا ہے۔

''ھَـاوِیَۃٌ'' کی تحقیق کے دوران ہم مصدقہ تحقیقی ذرائع سے یہ معلوم کر چکے ہیں کہ مصدر ''ھوی'' سے ماخوذ اسم ''ھَـاوِیَۃٌ'' بطور آلۃ رافعۃ (Windlass) بھی استعمال ہوتا ہے جو زنجیر نما رسوں کی مدد سے کسی چیز کو اندھیرے تنگ سوراخ یعنی کان (mine)، اندھیرے بندگڑھے (pit) اور اندھیری سرنگ (tunnel) وغیرہ میں اٹھا کے رکھنے اور اس کی نقل و حمل میں کام آتا ہے۔ اگر یہ اندھری سرنگ، اندھیرا بندگڑھا اور اندھیری تنگ جگہ ماں کا رحم لیا جائے تو قرآن کی مندرجہ ذیل آیات کا اطلاق یہاں عملی طور پر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور قرآن ہماری سائنٹفک تحقیق کی توثیق بھی کرتا ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۸۰:۲۱)

''پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔'' (۸۰:۲۱ مروجہ ترجمہ)

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ (۹۵:۵)

''پھر ہم نے اسے پست سے پست تر حالت میں لوٹا دیا۔'' (۹۵:۵)

ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ

''پھر اس کو ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔'' (۶۹:۳۲)

بالائی آیت ۸۰:۲۱ کے مروجہ تراجم میں اگرچہ 'اَمَـاتَهٗ'' کے معانی موت لئے گئے ہیں جو علم الزبان کے اعتبار سے غلط ہیں مگر علماٗ کے غیرقرآنی نظریات پر پورا اترتے ہیں جوانہوں نے

قرآن کے مفہوم میں ہیر پھیر کرنے کے لئے جان بوجھ کر م ۔و۔ت کے بنیادی حروف سے اٹھائے ہیں۔اگر' اَمَاتَهٗ' کے بنیادی لفظ 'مَاتَ' کے معانی موت ہوتے ہیں تو پھر کیا قرآن کی مندرجہ ذیل آیت(۱۹:۶۱) کے الفاظ ''وَعدُهٗ مَاتِیًّا'' کا (نعوذ باللہ) یہ مطلب ہوا کہ اللہ کے وعدے کو موت آ گئی؟۔ جَنّٰتِ عَدنِ الَّتِی وَعَدَ الرَّحمٰنُ عِبَادَهٗ بِالغَیبِ اِنَّهٗ کَانَ وَعدُهٗ مَاتِیًّا(۱۹:۶۱)۔اس آیت میں ''وَعدُهٗ مَاتِیًّا' کے حقیقی معانی ہیں۔ گویا His promise matters to him/His promise dominates.
قرآن میں جہاں بھی '' مات'' یا اس لفظ کے ماخوذات استعمال کئے گئے ہیں ہمارے علمأ نے قرآن کی ان تمام آیات کے غلط تراجم کرکے بہت بے دردی سے قرآن کا مفہوم بگاڑا جس کو درست کرنے کے لئے قرآن کی ان تمام آیات پر مشتمل ایک تفصیلی مضمون لکھا جائے گا جس کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔لہٰذا ہمارے زیر مطالعہ آیت ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقبَرَهٗ (۸۰:۲۱) کے لفظ'' اَمَاتَهٗ' کے صحیح معانی caused it m ،it does matter to Him ، turn to ،inter ،'plugged ، cashed in ''مات'' His domination ، caused/made to go وغیرہ ہیں جو بالائی آیت میں ''داخل کرنے'' کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔اس لفظ پر مزید بحث نہیں کی جائے گی کیونکہ فی الحال یہ ہمارے بیان کا حصہ نہیں۔البتہ ہم اس سے اگلے لفظ ''فَاَقبَرَهٗ' پر تفصیلی بات کرکے یہ ضرور ثابت کریں گے کہ انسان اصل قبر کہاں بنتی ہے؟۔ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقبَرَهٗ (۸۰:۲۱) کا اس کے الفاظ کے مطابق صحیح ترجمہ ہے'' پھر اس (اللہ) نے اس (انسان) کے داخلے کی قبر بنائی ''۔لیکن اگر صحیح ترجمے کو چھوڑ کر اس آیت کا مروجہ ترجمہ یعنی ''پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا'' بھی لیا جائے تو بھی اس میں اللہ کے اس نظام کی بات کی جا رہی ہے جس میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں یعنی موت دینا اور اس کے بعد ہر ایک انسان کو قبر میں پہنچانا خالصتاً اللہ کی طرف سے ہے اور جو سبھی انسانوں کے لئے یکساں ہے۔کیونکہ اس سے پہلی آیات میں انسان کی بات ہو رہی ہے جس کی ضمیر اور اللہ کی ضمیر فاعل دونوں ہی اس آیت میں موجود ہیں جو دنیا کے تمام انسانوں کو ان کے لئے بنائی جانے والی قبر میں ضرور داخل کئے جانے کے امرِ ربی کی وضاحت کر رہی ہیں۔اب

ایک طرف تو اللہ کا یہ بیان رکھئے اور دوسری طرف اس بات پر غور فرمایئے کہ زمین پر مٹی کی جو قبر بنائی جاتی ہے وہ صرف علامتی قبر ہے جو کسی کی بنتی ہے اور بہت سوں کی نہیں بھی بنتی مگر اللہ اپنے نظام کے ذریعے ہر ایک کو قبر میں ضرور پہنچاتا ہے۔لہٰذا قرآن میں بیان کی جانے والی قبر ہماری علا متی قبر سے بالکل الگ ہے۔

آیت ۹۵:۵ میں اللہ تعالیٰ پہاڑ سے رائی کا دانہ بنانے والے عمل کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔اتنے بڑے اور قد آور انسان کی ایک معمولی سے جنین(fetus) میں منتقلی اور اس کے اعمال کے مطابق دیا جانے والا پست سے پست ترین (lowest) ماحول ماں کے پیٹ میں پرورش کے دوران بھی اور پیدائش نو کے بعد اگلی زندگی میں بھی عمل پذیر رہتا ہے۔اس کا دوسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ ان مجرموں کی آنے والی زندگی انسانی زندگی سے کمتر درجے کی زندگی ہوگی مگر وہ بھی کسی ماں کے پیٹ میں ہی ہوگی خواہ وہ کسی مادہ جانور کا ہی پیٹ کیوں نہ ہو۔

ثُمَّ فِی سِلسِلَةٍ ذَرعُهَا سَبعُونَ ذِرَاعًا فَاسلُکُوهُ(۶۹:۳۲) کا تجزیہ بھی کر نے کی ضرورت ہے کیونکہ بٹوارے سے پہلے کے علما کی علمی قابلیت اس قدر تھی کہ انھوں نے لاؤڈ اسپیکر میں سے آنے والی آواز کو شیطان کی آواز قرار دے کر اس کے استعمال پر فتویٰ صادر فرما دیا تھا۔ان کے بعد آنے والے علما میں سے کچھ پر کیمونیزم کی چھاپ تھی اور کچھ نیا مکتبۂ فکر متعارف کرانے کی تگ ودو میں لگے رہے۔پوپ، پال اور کیمونزم سے مرغوب علما نے زندگی کو صرف مادی نظر سے دیکھا اور جن غیر مجسم حقائق کو ان کی عقل نے تسلیم نہیں کیا وہ انہیں بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے مسترد کرتے چلے گئے۔نئے مکتبۂ فکر کی طرح ڈالنے والے علما نے قرآن کے اصل متن کے الفاظ کو اپنی مرضی کے مطابق خوب توڑ مروڑ کے پیش کیا جس سے نا صرف قرآن کی حقیقی روح مجروح ہوئی بلکہ قرآن کی تعلیم میں جمود اور انحطاط بھی آ گیا۔قرآن کو سمجھ کر پڑھنا جاتا رہا اور قرآن کو اس کی حقیقی رو سے پڑھنے کی بجائے لوگ اپنے اپنے مکتبِ فکر کے بانیوں کی شخصیت پرستی میں مبتلا ہو کر قرآن کو انہیں کی نظر سے دیکھنے لگے اور قرآن کے حقیقی پیغام کو نظر انداز کر کے اپنے مسلکی نظر یات کو ذریعۂ آخرت سمجھ کر ان کا پرچار کیا جانے لگا۔

ثُمَّ فِی سِلسِلَةٍ ذَرعُهَا سَبعُونَ ذِرَاعًا فَاسلُکُوهُ(۶۹:۳۲)'' پھر اس کو ستر

ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔" اس آیت کے سبھی تراجم اور تفاسیر میں ذ -ر-ع، کے بنیادی حروف سے بننے والے بنیادی لفظ "ذرع" سے اس آیت کے دونوں الفاظ "**ذَرۡعُهَــــا**" اور "**ذَرَعًــا**" اخذ کئے گئے ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں الفاظ کو ایک ہی مخرج (root word) سے لینا کسی بھی لحاظ سے درست نہیں۔ ہمارے علمائے کرام کی یہ کوئی اتفاقیہ غلطی نہیں بلکہ ترجمے کی روانی برقرار رکھنے اور اس آیت کے اصل مفہوم کو بالائے طاق رکھ کر اپنے غیر قرآنی نظریات کی برتری قائم رکھنے کے لئے جان بوجھ کر ایسا کیا گیا ہے۔ اس آیت کے اصل متن اور تراجم پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں الفاظ یعنی "**ذَرۡعُهَــا**" اور "**ذَرَعًــا**" میں سے کسی ایک کو ترجمے کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ اگر "**ذَرَعًـــــا**" کو ہمارے علما کا تعبیر کردہ قیاس الحدہ (measuring unit) یعنی پیمائش کی اکائی کیوبٹ (cubit) یا "ہاتھ" فرض کر بھی لیا جائے تو پھر "**ذَرۡعُهَــا**" کا مطلب کیا ہوگا؟۔ تراجم میں کی ہوئی اس لفظ کی تعریف "لمبی" تو فقط ترجمے کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے گھڑی گئی ہے ورنہ "**ذرع**" کے ساتھ "**ھا**" کی ضمیر بھی جڑی ہے جسے ہمارے علما نے یکسر نظرانداز کردیا۔

آیئے "**ذَرۡعُهَــا**" اور "**ذَرَعًــا**" کو مسلمان دانشوروں کی کلیدِ معجم، غیر جانبدار لغات، مستند قاموس اور سائنس کی رائج الوقت کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

The stretching forth, or extending, the arm, ذرع (inf. n. of) ذرع or fore leg generally stretched forth. Grievous, or distressing. Area of responsibility, a cubit length, confession and admittance (El-Moheet)

ذرع بطورِ اسم آگے کی طرف بڑھا ہوا، آگے کھینچا ہوا، آگے بڑھا ہوا بازو یا آگے پھیلی ہوئی ٹانگ، پریشانی بڑھنا اور درد بڑھنا، منطق المسولی، لمبائی کیوبٹ میں، کسی چیز کا قبول کرنا اور اعتراف کرنا ہے۔ (**کلید آلالمحیط**)

أَذْرَعَـذِرَاعَيۡـهِ مِـنۡ تَحۡتِ الۡجُبَّةِ (El-Moheet) and **اِذَّرَعَهُـمَا**, He put forth and extended his fore arms from beneath the jubbeh: **أَذْرَعَـذِرَاعَيۡهِ**, and **اِذَّرَعَهُــمَـــا**, he drew forth his fore arms from the sleeves of a narrow-sleeved jubbeh: **اذرع** also signifies He seized with the fore arm. **مَـــاأَذَّرَعَهَـــا** How large, is she in the fore arm!] is [from **الـــذَّرَاعُ**, being] of the. **اذرعقيُئَهُ** He (a man) emitted, or ejected, his vomit.

المحیط عربی جملوں میں ذرع کے استعمال کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

أَذْرَعَـذِرَاعَيۡـهِ مِـنۡ تَـحۡـتِ الۡجُبَّةِ یعنی اس نے جبے کے اندر سے اپنے ہاتھوں کے اگلے حصے آگے کر کے بڑھا دیئے۔ اور اگر اسی جملے میں "**اِذرعهــمـا**" لگایا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس نے اپنے ہاتھوں کے اگلے حصے تنگ بازوں والے جبے کے بازوں میں سے آگے نکالے۔ یہاں پر "اذرع" اس بات کے لئے اہم ہے کہ اس کے ہاتھ کا اگلا حصہ چھن گیا یا ضبط ہو گیا۔ **مَــاأَذَّرَعَهَــا** یعنی اس عورت کے ہاتھ کا اگلا حصہ کتنا بڑھا ہوا ہے؟۔ **الذِّرَاعُ** یعنی کسی شئے سے بڑھا ہوا ہونا۔ "**اذرعــقَيۡـئَـهُ**" اس آدمی کو قے ہوئی یعنی قے معدے سے آگے بڑھتے بڑھتے منہ سے باہر نکل آئی۔

آلالمحیط اپنی کلید میں کسی چیز کے آگے بڑھنے پر زور دیتے ہیں۔ **ذرع** سے پہلے مونث اسم "**سِلۡسِلَةٍ**" آتا ہے اور **ذرع** کے ساتھ "ھا" مونث شئے کی ضمیر بھی آرہی ہے جو "**سِلۡسِلَةٍ**" پر رجعت کرتے ہوئے اس کو آگے بڑھا رہی ہے نہ کہ "**سِــــلۡسِــــلَةٍ**" لمبائی ماپنے کے ضمن میں استعمال ہوئی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے علماء "**ذرع**" سے کسی "**سِــلۡسِــلَةٍ**" کی لمبائی ماپتے ہیں !۔ اور مزید حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ "**سِــلۡسِــلَةٍ**" کوئی رسہ یا زنجیر نہیں بلکہ ایک مقررہ نظام (mechanism) اور طریقہ کار (procedure) ہے جس کو آگے بڑھانے (process) کی بات کی جا رہی ہے۔

ابنِ عباد اپنی کلید میں "**ذرع**" کسی کو موت دینے یا ہاتھ بڑھا کر اس کی سانس بند کرنے کو کہتے ہیں، **ذرّعه**، اسے مارا گیا یا اس کا دم نکالا گیا۔ (کلید ابن عباد)

ذَرَعَ فُلَانًــا (so-and-so) **ذرّعــهُ**، Strangled, or throttled, such a one from behind him with the fore arm signifies, simply, he strangled, or throttled, him، but more properly, he put his neck between his arms, and so strangled, or throttled, him; and **لـــهُ ذرّع** , also, has both of these significations، i.e. Strangled and Throttled. (Ibn-'Abbd, K.)

ابنِ عباد " ذَرَع" اوراس کے ساتھ لگے ہوئے اسم ضمیر کا مطلب واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **ذَرَعَ فُلَانًا** یعنی "ذرع" کے ساتھ کسی اسم یا کسی شے کی ضمیر کا ہونا۔ ذرع فلاں فلاں کو ایسے بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر یا کسی لمبی چیز یا لمبے آلے سے کسی کا گلا گھوٹنا اوراس کی سانسیں بند کرنا۔ مثلا:" **ذرّعــهٗ**" یعنی اس کا گلا گھوٹ دیا۔ اس کی سانس بند کردی۔ خاص طور پر پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر کسی کی گردن کو بازوؤں کے درمیان جکڑ کے اس کا دم نکالنا یا گلا گھوٹ دینا۔ (کلید ابنِ عباد)

دراصل ایک ہی چھڑی سے سب کو ہانکنے والوں نے کہیں سے اتنا سن لیا کہ بنیادی حروف سے بنیادی لفظ بنتا ہے جس سے باقی الفاظ اخذ کئے جاتے ہیں مگر کم علمی کی وجہ سے وہ یہ نہیں جان سکے کہ بنیادی لفظ سے اخذ ہونے والے ہر لفظ کا مطلب اسکی تکوین (formation) کے مطابق الگ ہوتا ہے۔ قرآن بعد میں کھلتا ہے بنیادی حروف کی بات پہلے شروع ہوتی ہے اور پھر کہیں سے بھی الٹا سیدھا لفظ پکڑ کر اپنی مرضی کا ترجمہ کر کے درسِ قرآن شروع کر دیا جاتا ہے۔ خطبات، تقریروں، تحریروں اور تفسیروں میں بھی یہی کام ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئیے کہ قرآن ان لوگوں کے تراشیدہ بنیادی حروف کا محتاج نہیں۔ قرآن اپنے بیانات میں مکمل آزادی کے ساتھ اپنے الفاظ کے بنیادی حروف بھی بتاتا ہے اور اس کے ماخوذات بھی جابجا استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا، "ذَرَعَ" کے معانی میں بازوؤں سے مراد صرف رسّی یا زنجیر ماپنے والے انسانی بازو نہیں بلکہ آرم (arms) سے اوزار، ہتھیار، ساز و سامان یا اسلحہ بھی لیا جاتا ہے۔ اسلحہ بردار کو انگریزی میں آرمڈ (armed) اور اسلحے کو آرمامنٹ (armament) کہا جاتا ہے۔ اسی لفظ آرم (arm) سے آرمی (army) بنا ہے اور "ذرع" آرمی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنیادی حروف کا شور مچانے والے علما اور ان کے جیالے پیروکار ذ-ر-ع کے بنیادی حروف سے بننے والے مخرج 'ذرع" کو گولہ بارود اور اسلحہ کے پس منظر میں دیکھیں تو انہیں بھی 'ذَرَع' کا مطلب "موت" ہی دکھائی دے گا "ہاتھ کی لمبائی" نہیں۔ زنجیروں کو ہاتھوں سے ناپ کر ان سے قرآن کو جکڑنے اور مہجور (obsolete) کرنے والوں کا جب تک مکمل طور پر صفایا نہیں ہو جاتا اس وقت تک قرآنی تعلیمات اور قرآن کے اصل پیغام کا احیا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو بظاہر تو قرآن کا نام لیتے ہیں مگر اندر سے قرآن کے حقیقی پیغام کے ابلاغ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

لہٰذا، ابنِ عباد کے مطابق ذَرَعَ + ضمیر یعنی ذرّع لـهٗ کا درست اطلاق ایسے ہوگا کہ اس کی گردن اپنے ہاتھوں کے درمیان میں رکھ کے اس کا گلا دبا دیا جائے یا سانس بند کر دی جائے۔ **ذرّع لـــــهٗ** دونوں کاموں پر دلالت کرتا ہے یعنی اس کی سانس بند کرنے اور اس کا گلا دبانے پر۔ ہمارے زیرِ مطالعہ آیت میں "**ذَرْعُهَا**" یعنی ذرّع + ھا میں ذرّع کے ساتھ "ھا" کسی واحد شے کی ضمیر (object pronoun) اس سے پہلے آنے والے اسم پر رجعت کرتے ہوئے معانی کے لحاظ سے ابنِ عباد کی بالائی مثال کے عین مطابق ہے۔

۱۸۶۳ء سے لندن میں شائع ہونے والے ایڈ ورڈ ولیم لین (Edward William Lane) اور نورگیٹ (Norgate) کے عربی اور انگریزی کے مستند قاموس (An Arabic-English Lexicon .London. Williams and Norgate.1863) میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ معروف دانشور، مصنف اور عربی کے شاعر ابنِ الخطیم الانصاری نے "تَـذَرَّعَ" کا لفظ اپنی شاعری میں استعمال کیا تھا جس میں اس نے عورتوں کو کھجور کی نرم اور سخت ڈالیاں اپنے ہاتھ کے اگلے حصے پر رکھ کر دوسری ڈالیوں کے برابر ناپ کے کاٹنے کے بعد ان کے جوڑے بنا کر چھری سے چھیل کے پھینکتے ہوئے بتایا ہے تھا۔ **تَرَى قِصَدَ الْمُرَّانِ تُلْقَى كَأَنَّهَا تَذَرُّعُ خُرصَانٍ بِأَيْدِي الشَّوَاطِبِ**

A poet says, (S,)namely Keys Ibn-El-Khateem El-Ansree,signifies تَذَرَّعَ The measuring a thing with the fore arm:

"تَرَى قِصَدَ الْمُرَّانِ تُلْقَى كَأَنَّهَا تَذَرُّعُ خُرصَانٍ بِأَيْدِي الشَّوَاطِبِ"

[Thou seest the fragments of the hard and pliant spears thrown as though they were what is seen in the measuring, with the fore arm, of rods of palm-sticks in the hands of the females who pare them]

تَذَرَّعَ فُلَانًا الْجَرِيْدَ سے مراد وہ شخص ہے جو کھجور کی ڈالیوں کے اپنے ہاتھ کے اگلے حصے پر رکھ کر ان کا جوڑا بنا دے۔ **خِـرْصَـانٌ** کا اصل مطلب کھجور کی ڈالیاں یا ڈنڈیاں ہیں۔ **شَـوَاطِبُ**

came to drink of the rain-water and waded in it with their arms. تَـــذَرَّعَ بِـــذَرِيْـــعَةٍ-He obtained, or sought to obtain, accessor he ingratiated himself, or sought to ingratiate himself; by a means of doing so.You say, also, تَذَرَّعَ إِلَيْهِ-He obtained, or sought to obtain, access to him. (Ibn-'Abbd, K.)ذَرُعَ, in its primary acceptation, has the signification explained in the first sentence of this article. (Ibn-'Abbad, K.)

ابن الختیم نے بھی اپنی کلید میں اذرع کا مطلب ہاتھ کے اگلے حصے سے کسی چیز کو منقطع کرنا بتایا ہے۔اس کے علاوہ اہم بات یہ تھی کہ جو عورتیں کھجور کی ڈالیوں کے جوڑے بناتی تھیں وہ اپنے ہاتھ کے اگلے حصے سے ان ڈنڈیوں اور چھڑیوں کی پیائش بھی کرتی تھیں۔ابن عباد کی کلید کے باب تَـذَرَّعَـــتِ الْـمَـرْأَۃُ بتایا گیا ہے کہ ایسے چوکور ٹکڑوں کی لمبائی کی پیائش کو کیوبٹ(cubit) کہا گیا ہے جنہیں اپنے ہاتھ کے اگلے حصوں پر کھجور کی ڈنڈیاں رکھ کر پیائش کرنے والی عورت کھجور کی اصل ڈالیوں سے چھیل کر اپنے چھری سے چھیلتے چھیلتے اتنا باریک کر دیتی تھی کہ وہ پتلے ہو جائیں۔ابن الختیم اور ابن عباد دونوں ہی اپنی اپنی کلیدوں میں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس قصے میں عورت چٹائی بنانے کے لئے کھجور کے پتوں کو چیرتی اور منقطع کرتی تھی۔

ذرع seen in the keys of Ibn-El-Khateem El Ansaree as Seized with the fore armalso signifies the measuring a thing with the fore arm , of rod of palm or sticks in the hands of females who pare them. - تَـذَرَّعَـتِ الْـمَـرْأَـة seen in the key of Ibn-Abbad as oblong pieces of the measure of the cubit in length.Put the palm-sticks upon his fore arm, and pared themmeaning a woman who peels theoriginally, rods of palm-sticks: andwho removes all that is upon it with her knife until she has left it slender. Ibn-El-Khateem and Ibn-Abbad say that woman split palm-leaves to make of them a mat.

ان لوگوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جنہوں نے ذرع کے معنی اس تخیلاتی شاعری سے مستعار لے کر قرآن کے تراجم اور تفسیروں میں ڈال دیئے جس میں چٹائی بنانے والی عورتیں جمع ہے شَاطِبَةٌ کی یعنی ڈالیاں چھیلنے والی عورتیں۔

ابنِ عباد اپنی کلید میں ابن الختیم کی کہی ہوئی بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تَـــذَرَّعَـــتِ الْـــمَـــرْأَۃُ اصل وہ عورتیں ہیں جو کھجور کے پتوں کو چیر کے ان سے چٹائی بناتی ہیں۔اس کی وضاحت میں ابنِ عباد دو مزید مثالیں دیتے ہیں۔تَـذَرَّعَـتِ الإِبِـلُ الْكَرَعَ یعنی اونٹ بارش کا پانی پینے آئے اور اپنے ہاتھوں سے پانی پر حملہ کر کے یعنی طوفان مچا کے آگے بڑھ گئے۔تَـذَرّع بِـذرِيْعَةٍ یعنی اس نے کسی بھی طریقے سے رسائی حاصل کر لی یا راستہ تلاش کر لیا یا اس نے اپنے آپ کو داخل کر لیا یا داخل کرنے کا راستہ تلاش کر لیا۔ تـذرّع إِلَيْـــهِ یعنی اس نے اس تک رسائی حاصل کر لی۔ابنِ عباد لکھتے ہیں ذرع کے اولین قابل قبول اور اہمیت کے لحاظ سے وہی معانی لئے جاتے ہیں جو وہ پہلے بتائے جا چکے ہیں یعنی ہاتھ بڑھا کے کسی کی گردن پکڑنا اور سانس بند کر کے مار ڈالنا۔

تَـــذْرِيْـــعٌ (مُـــذَرَّعٌ) ہی کے اس بے کار ٹکڑے کو بھی کہا جاتا ہے جس سے (اونٹ کا) بازو باندھا جاتا ہے۔

تَـــذْرِيْـــعٌ (مُـذَرَّعٌ)The redundant part of the cord with which the arm [of a camel] is bound.

اس لحاظ سے ہامرے زیر مطالعہ آیت میں ذَرْعُـهَا سے پہلے آنے والے لفظ "سِلْسِلَةٍ" کو اگر رسی یا زنجیر کہا جائے تو اس کا مطلب بے کار (redundant) رسی یا بے کار زنجیر بنتا ہے جو درست نہیں۔اس مثال میں ذرع کے معانی اگر کسی کو بازو سے باندھنے کے بھی لئے جائیں تو ان میں بھی کسی کی آزادی سلب کرنے اور کسی کو گرفتار کرنے کا عنصر شامل ہے جو دراصل کسی کی نقل و حرکت کو منقطع کرنے پر خود سے دلیل ہے۔اور یہی ذرع کے حقیقی معانی ہیں۔

تَـذَرَّعٌ فُلانٌ الـجَرِيْدَsignifies Such a one put the palm-sticks upon his fore arm, and pared them: and خِـرْصَـانٌmeans, originally, rods of palm-sticks: and شَــوَاطِـبُis pl. ofشَـاطِبَةٌ; meaning a woman who peels (Ibn-'Abbd, K.)- تَـذَرَّعَـتِ الْـمَرْأَةُThe woman split palm-leaves to make of them a mat. Thus some explain the saying of Ibn-El-Khateem, quoted above. تَـــذَرَّعَـــتِ الاِبِلاُلْـگَـــرَعَThe camels

کھجور کے پتوں اور ڈنڈیوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر ایک جیسے ناپ میں کاٹتی ہوئیں بتائی گئیں تھیں۔ جبکہ ابن الختیم اپنی کلید میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ ان کی مذکورہ شاعری میں بیان کردہ عورتیں ایک جیسی پیمائش کی ڈالیاں اور پتے چوکور چٹائی بنانے کے لئے کاٹتی تھیں یعنی اگر کسی ایک آدھ ڈالی یا پتے کی پیمائش میں گڑ بڑ ہوگئی تو ایک جیسی چوکور چٹائی نہیں بنے گی۔ ذراع کو ابن الختیم نے بھی کوئی پیمائش کا معیار نہیں بتایا بلکہ ڈالیوں کو برابر کاٹنے کے مطلب میں لیا ہے۔ کاٹنا اور منقطع کرنا قرآن کی رو سے بھی ذرع کے بالکل درست معانی ہیں۔ قرآن بھی اس آیت میں ایک سلسلے کو کاٹ دینے یعنی زندگی کا ایک دور منقطع کرنے اور زندگی کے سلسلے کو اگلے دور سے جوڑنے کی بات کرتا ہے۔ قرآن اس آیت میں کسی تصوراتی زنجیر کو ماپنے کی بات ہرگز نہیں کرتا جو ہمارے علما نے اس آیت کے تراجم میں اپنے پاس سے گھڑی ہے۔ ایڈورڈ ولیم کے عربی انگریزی قاموس میں روز مرہ کی گفتگو سے دی گئیں ذرع کی مثالوں میں بھی کسی چیز کے سلسلے کو کاٹنے کی دلیل دی جاتی ہے مثلاً: بِعْتُهُ الثَّوْبَ مُذَارَعَةً یعنی میں نے اسے کپڑا کاٹ کے بیچا۔ ذرع کو سمجھنے کے لئے قاموس کا ایک اور حوالہ حاضرِ خدمت ہے۔

أَبْطَرَنِى ذَرْعِ He wasted my body, and cut off my means of subsistence.

بَطَرَنِی ذَرْعِ یعنی اس نے میرے جسم کو تلف کر دیا اور میری بقا کے وسائل منقطع کر دیئے۔

جس طرح سائنسی علوم کے حکمانے ناپ تول کے معیاری پیمانے مقرر کئے ہیں بعینہٖ ہمارے مذہبی علمانے اپنے علم سے کیوبٹ (cubit) میں یا ہاتھ سے پیمائش کرنے والی ذرع کی بہت سی اقسام ایجاد کر رکھی ہیں جو آپ کو ان کی خود ساختہ لغات اور تفسیروں میں سرِفہرست دکھائی دیتی ہیں۔ جن میں سے چند ایک کے بیان کی صحیح نقل حاضرِ خدمت ہے۔ بقیہ تفصیل قرآن کے نام پر شائع ہونے والی لغات اور تفسیروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ذِرَاعٌ مُكَسَّرَة :(cubit which is divided into fractions) اس کو کسری ہاتھ یا کسری کیوبٹ کہتے ہیں جو نہایت چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

ذِرَاعٌ قَبَضَاتٌ : (Fists, catch or contraction , the cubit of the common people, or the common cubit) یہ عام لوگوں کا عام ہاتھ یا عام کیوبٹ ہے جو قبضہ سے ماخوذ مشت یا مٹھی جیسی پکڑ والا یا سکڑا ہوا ہوتا ہے۔

ذِرَاعُ الْمَلِكِ (the cubit of the king, namely one of the Kisrs) یہ بادشاہ کا ہاتھ یا بادشاہ کا کیوبٹ ہے جو کسریٰ کے بادشاہوں میں سے کسی کا ہے۔

"ذَرْعَ" کا استعمال ہمیشہ سے الجھن (confusion) کا شکار رہا ہے۔ بڑے بڑے اساتذۂ فن بھی اس معاملے میں خطا کھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں معاملہ علم کا نہیں بلکہ غیر قرآنی عقیدے اور نظریئے کا ہے جسے کسی بھی طرح قرآن کے مفہوم میں داخل کرنے والی بات کی گئی خواہ وہ قواعد و ضوابط کی رو سے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ ناپ تول کے دیگر نظام مثلاً ایم کے ایس (MKS) یعنی میٹر، کلوگرام اور سیکنڈ یا سی جی ایس (CGS) یعنی سینٹی میٹر، گرام اور سیکنڈ والے سسٹم کی طرح عربی زبان میں کیوبٹ (cubit) نامی پیمائش کی کوئی الگ سے اکائی کبھی بھی نہیں رہی۔ کیونکہ کیوبٹ (cubit) عربوں کے یہاں کوئی معیاری (standard) پیمانہ نہیں ہے۔ کوئی کیوبٹ کو کسری ہاتھ (Arm) سے ناپتا ہے اور کسرۃ والے یعنی چھوٹے چھوٹے جزیات کو کیوبٹ کہتا ہے، کوئی قَبْضَة یعنی مشت والے، گرفت والے اور سکڑنے والے ہاتھ سے پیمائش کرنے کو کیوبٹ کہتا ہے۔ کوئی عام آدمی کے عام ہاتھ سے لئے گئے ماپ کو کیوبٹ کہتا ہے تو کوئی کسریٰ کے کسی نامعلوم بادشاہ کے ہاتھ سے ماپ لینے کو کیوبٹ والا ہاتھ قرار دیتا ہے۔ اللہ اللہ! جس بادشاہ کا نام تک معلوم نہیں ہمارے علماء نے قرآن میں اسی کے ناپید ہاتھ سے زنجیر کی لمبائی ناپ لی !۔ اور یہ جادوئی مشت والا قَبْضَة نما کیوبٹ زنجیر کی لمبائی کیسے ناپتا ہوگا؟۔ یہ بات سوچ سوچ کے دماغ کی دہی بن گئی مگر یہ راز نہیں معلوم ہو سکا کہ مٹھی جیسا ہاتھ جو پکڑ بھی کرتا ہو اور سکڑ بھی جاتا ہو اس نے زنجیر کی لمبائی کی پیمائش کیسے کر دی؟ یہ ہے ہمارے علما کا طرۂ امتیاز کہ انھوں نے ایسی ایسی باتیں ایجاد کر دیں جن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ پکڑنے اور سکڑنے والا قبض نما ہاتھ زنجیر ناپنے کی بجائے گلا دبا کے موت کے گھاٹ اتارنے والا کیوبٹ لگتا ہے!۔ العوفی لکھتے ہیں کہ ابنِ عباس اور ابنِ جریج کے بقول ہر ایک کیوبٹ (cubit) فرشتوں کے اگلے ہاتھ کی لمبائی کے برابر ہوتا ہے۔

Al-`Awfi reported that Ibn `Abbas and Ibn Jurayj both said, Each cubit will be the forearm's length of an angel.

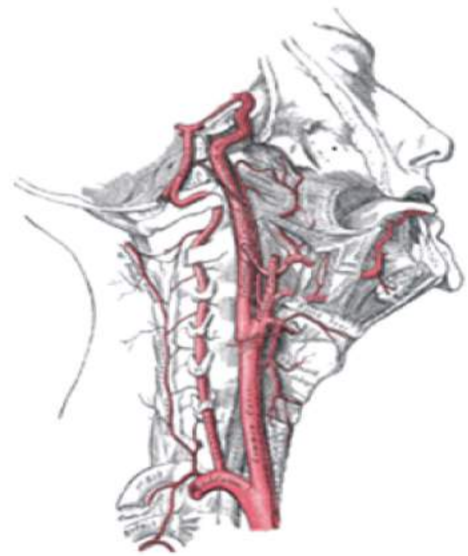
تعجب ہوتا ہے کہ ابنِ عباس اور ابنِ جریج جیسے نامی علماء نے ذراع کوفرشتوں کے ہاتھ کی پیمائش سے کیسے تعبیر کر دیا؟۔قرآن میں تو ایسا کچھ نہیں کہا گیا۔ایسی بے تکی بات کرنے والے علماء ابنِ عباس اور ابنِ جریج کو ہم مفکرینِ قرآن (scholar) کہتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن کی تفسیروں کی نقل ہمارے تمام مکاتبِ فکر کے علما کرتے آئے ہیں۔اگر استاد ہی بھٹکا ہوا ہوگا تو شاگرد کیا کریں گے؟۔کیا ابنِ عباس اور ابنِ جریج کے پاس کوئی فرشتہ اپنے اگلے یا پچھلے ہاتھوں کی پیمائش دینے آیا تھا؟۔اگر ان کے پاس کوئی فرشتہ بھی نہیں آیا اور نہ ہی قرآن نے فرشتوں کے اگلے یا پچھلے ہاتھوں کا ذکر کیا ہے تو یہ لوگ قرآن کے تراجم اور تفسیروں میں فرشتوں کے اگلے ہاتھ کی پیمائش کے الفاظ کہاں سے لے آئے؟۔کسی بھی مکتبۂ فکر کے عالم نے اس غلطی کو اس لئے درست نہیں کیا کہ ان کے اپنے نظریات بھی غیر قرآنی تھے۔

قاموس،لغات،کلید اور تاریخ سے حوالے دینے کا مطلب صرف یہ عرض کرنا تھا کہ قرآن ایسی اہم کتاب کے تراجم میں اہم الفاظ کو چھوڑ کر کیوبٹ جیسے مبہم لفظ کو کیوں جگہ دی گئی؟۔ ضرورت ہے یا نہیں لیکن اردو تراجم میں ''ہاتھ کی لمبائی'' اور انگریزی میں کیوبٹ کا لفظ لگا کر خالی جگہ پر کر دی جاتی ہے۔قرآن سے پہلی کتابوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی پیمائش کے لئے کیوبٹ (cubit) کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کا عربی ترجمہ **ذرع** نہیں بلکہ اس وقت کی رائج پیمائش ہے۔جو اس زمانے کے آلۂ پیمائش سے باقاعدہ ماپی جاتی تھی اور اس آلۂ پیمائش کو بھی کیوبٹ کہا جاتا تھا۔بالکل اسی طرح جیسے آج کل گز یا میٹر لمبائی ماپنے کی ایک مسلمہ پیمائش ہے لیکن دھات یا لکڑی کے بنے ہوئے اس آلے کو بھی گز یا میٹر ہی کہا جاتا ہے جس سے کپڑا یا کسی چیز کی پیمائش کی جاتی ہے۔ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ تعمیراتی اور انجینئرنگ کے منصوبے مکمل کرنے کے لئے ہر ایک چیز کی پیمائش بالکل درست دی جاتی ہے۔ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی منصوبے کے ڈیزائن میں مقرر کی ہوئی پیمائش کو کوئی انچ سمجھے اور کوئی اس کی تعبیر میٹر نکالے۔حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہونے والی تمام جانوں کی سلامتی اور اپنی نوعیت کے شدید ترین طوفان کا مقابلہ کر کے انہیں محفوظ مقام تک پہنچنے والی اس تاریخی کشتی کی تعمیر کیا اسی اٹکل پچو پیمائش کے ذریعے کی گئی تھی جو ہمارے علما بیان کرتے ہیں؟۔ کسی نے ہاتھ کا آگے والا حصہ کہا،کسی نے بازو تک بتایا اور کوئی ذراع کو کندھے تک کھینچ کے لے گیا۔یہ کوئی مزاق نہیں اللہ کا کلام ہے جس کی ہر بات حتمی اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔

اس لحاظ سے **ثُمَّ فِیۡ سِلۡسِلَۃٍ ذَرۡعُہَا سَبۡعُوۡنَ ذِرَاعًا فَاسۡلُکُوۡہُ** (۶۹:۳۲) کے اردو اور انگریزی تراجم میں بہت بڑا جھول دکھائی دیتا ہے جن میں **ذرعھا** اور **ذِراعا** کا حقیقی مطلب واضح نہیں ہوتا۔مگر چونکہ بالائی سطور میں ہم قاموسِ مجم میں ذَرۡعٌ کے تفصیلی اور حقیقی معانی میں دو لفظ Strangled اور Throttled یعنی روح قبض کرنا بھی دیکھ چکے ہیں۔لہٰذا،ذَرۡعٌ سے ماخوذ ذَرۡعُہَا کو سائنسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا بھی ضروری ہے تاکہ اس کے عملی اطلاق کی واضح تصویر سامنے آ سکے۔ستر ہاتھ لمبی زنجیر سے باندھنے والی بات تو ہم پے بالکل بھی اثر نہیں کرتی مگر سائنس نے اس آیت کا جو نقشہ کھینچا ہے اسے محسوس کر کے خوف کے مارے پیشانی سے پسینے چھوٹے نہیں تھکتے۔اس میں در حقیقت جان نکالنے کا وہ منظر دکھائی دیتا ہے جو آج تک ہماری نظروں سے اوجھل رہا۔آپ بھی قرآن کے آئینے میں ''موت کا منظر'' ملاحظہ فرمائیے۔اگر آپ نے کسی کی موت ہوتے ہوئے دیکھی ہو تو اس منظر کو دھیان میں رکھ کے ذَرۡعٌ کی مندرجہ ذیل سائنسی تشریح کا مطالعہ کیجیے۔حقیقت آپ کے سامنے عیاں ہو جائے گی جس میں نہ کسی ثبوت کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی کسی عالم کی تفسیر کی۔



(Hand with low oxygen saturations due to Hypoxia)



(Hypoxiation or Anoxemia)

STRANGLING

Strangling is compression of the neck that may lead to unconsciousness or death by causing an increasingly hypoxic state in the brain.

Hypoxia (also known as **Hypoxiation orAnoxemia**)is a condition in which the body or a region of the body is deprived of adequate oxygen supply. Hypoxia may be classified as either generalized, affecting the whole body, or local, affecting a region of the body. Although hypoxia is often a pathological condition variations in arterial oxygen concentrations can be part of the normal physiology,

Hypoxia occurs in healthy individuals when breathing mixtures of gasses with a low oxygen content, when seen through the skin it has an increased tendency to reflect blue light back to the eye In cases where the oxygen is displaced by another molecule, such as carbon monoxide, the skin may appear 'cherry red'۔

Cyanosis is the appearance of a blue or purple coloration of the skin due to the tissues near the skin surface having low oxygen saturation. It may feel cold and appear pale. Extreme pain may also be felt and tissues may eventually die.

Hypoxia can result from a failure at any stage in the delivery of oxygen to cells. This can include decreased partial pressures of oxygen, problems with diffusion of oxygen in the lungs, insufficient available haemoglobin, problems with blood flow to the end tissue, and problems with breathing rhythm.

This can include an embolic event a heart attack that decreases overall blood flow, or trauma to a tissue that results in damage. Fatal strangling typically occurs in cases of violence, accidents, and as the auxiliary lethal mechanism in hangings in the event the neck does not break. Strangling can be divided into three general types according to the mechanism used:

1- Hanging–Suspension from a cord wound around the neck

2- Ligature strangulation–Strangulation without suspension using some form of cord-like object called a garrotte.

3-Manual strangulation–Strangulation using the fingers or other extremity

Strangling involves one or several mechanisms that interfere with the normal flow of oxygen into the brain:

(a)- Compression of the carotid arteries or jugular veins causing cerebral ischemia.

(b)- Stimulation of the carotid sinus reflexcausing bradycardia hypotension or both.

Depending on the particular method of strangulation, one or several of these typically occur in combination, vascular obstruction is usually the main mechanism. Complete obstruction of blood flow to the brain is associated with irreversible neurological damage and death. The reported time from application to unconsciousness varies from 714 seconds if effectively applied to one minute in other cases, with death occurring minutes after unconsciousness.

Ligature strangulation also known as **"garrotting"** is strangling with some form of cord such as rope or wire either partially or fully circumference the neck. Even though the mechanism of strangulation is similar, it is usually distinguished from hanging by the strangling force being something other than the person's own bodyweight.

Edward William Lane, An Arabic-English Lexicon

http://en.wikipedia.org/wiki/Strangling

http://www.forensicpathologyonline.com/e-book/
asphyxia/ligature-strangulation

قرآن کے آئینے میں ''موت کا منظر''

بالائی سطور کا انگریزی بیان سائنس کی رائج الوقت کتابوں سے ہو بہو نقل کیا گیا ہے جسے ایڈ ورڈ ولیم لین کے عربی انگریزی معجم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور اسی بیان کو ''وکی پیڈیا'' نے بھی انہیں کتابوں سے نقل کیا ہے جو ان کی ویب سائٹ پر جا کر پڑھا جا سکتا ہے۔خون کا تجزیہ کرنے

والا شعبہ علمِ طب میں پیتھالوجی(pathology) کہلاتا ہے۔ یہ وہی محکمہ ہے جو''فارنسک ٹیسٹ'' (forensic test) کر کے موت واقع ہونے کی وجوہات کا پتہ لگاتا ہے۔لہٰذا، فارنسک پیتھالوجی کی تمام کتابوں میں بالائی بیان اسی طرح درج کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ آپ کے ملاحظے اوراس بیان کی صحت وتصدیق کے لئے فارنسک پیتھالوجی کی مسلمہ کتاب انٹرنیٹ پر پڑھنے کاایک لِنک بھی دیا جارہاہے تاکہ آپ اس بیان کوخوداپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔آپ کی سہولت کے لئے اس بالائی بیان کوانگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے ذیل میں پیش کیا جارہاہے،جس میں کہیں کہیں موقع کی مناسبت سے کچھ قرآنی آیات کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جوانگریزی تحریر کا حصہ نہیں ہے بلکہ قرآن کے آئینے میں اس تحریر کا جائزہ لینے اور قرآن فہمی کاتسلسل قائم رکھنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔

''روح قبض کرنا''

دماغ کی طرف جانے والے آکسیجن میں بہت زیادہ کمی واقع ہوجائے تو گردن اینٹھنے کی وجہ سے موت کی غشی پڑنے لگتی ہے اورنتیجتاً موت واقع ہوجاتی ہے۔آکسیجن میں کمی ہونے کی حالت جسم اور دیگر اعضا کو آکسیجن کی فراہمی سے محروم کردیتی ہے۔جس سے پوراجسم یا جسم کے کچھ حصے متاثر ہونے لگتے ہیں۔تاہم خون میں آکسیجن کی مقدار کم ہوجانے سے اکثر دل کی شریانوں میں بہنے والے خون کی حالت میں جوتغیر واقع ہوتا ہے وہ عمل پورے جسم کا حصہ بن جاتا ہے اور سانس کے آمیزے میں آکسیجن کی مقدار کم ہوجانے سے صحت مند انسان بھی دم توڑنے لگتا ہے۔جب کاربن مونوآکسائیڈ اور دیگر عوامل آکسیجن کو پیچھے دھکیلتے ہیں تو آنکھیں نیلی پڑنے لگتی ہیں اور رنگت چیری کی طرح سرخ ہونے لگتی ہے۔جلد کی نزدیکی بافتوں(tissues) میں آکسیجن کی مزید کمی واقع ہونے سے جلد پر نیلے یا جامنی رنگ کا یرقان عود کر آتا ہے۔جس سے ٹھنڈ لگتی ہے اور رنگت پیلی ہونا شروع ہوجاتی ہے۔شدید درد محسوس ہوتا ہے اور آخر کار جسم کی بافتیں یعنی ٹشو مرنے لگتے ہیں۔آکسیجن کی کمی واقع ہونے کے نتیجے میں خلیوں کو آکسیجن کی فراہمی کسی بھی وقت منقطع ہوجاتی ہے۔جس سے آکسیجن کا جزوی دباؤ متاثر ہوجاتا ہے،پھیپھڑوں میں آکسیجن کے انتشار میں مشکلات آنے لگتی ہیں،اس عمل سے خون میں ہیموگلوبن کی مقدار بھی کم ہونے لگتی ہے جس کے نتیجے میں بافتوں(tissues) کے دورانِ خون میں کمی واقع ہوتی ہے اور سانس لینے کے تواتر میں مشکلات آنے لگتی ہیں۔اس عمل میں رگوں میں ہونے والے کھنچاؤ کی وجہ سے دل کا دورہ پڑتا ہے اور پورے جسم کا دورانِ خون کم ہوجاتا ہے۔جس کی وجہ سے اعصاب پر ضعف پڑتا ہے جومہلک اورنقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔کسی کو موت دینے کے لئے روح نکالنے کا ایسا جان لیوا نظام ترتیب دیا جاتا ہے جس میں جان چلی جاتی ہے لیکن گردن نہیں ٹوٹتی۔روح قبض کرکے دم نکالنے میں جو نظام استعمال ہوتے ہیں ان کی عام طور پر تین اقسام ہیں:

(۱) **لٹکا کے دم نکالنے کا نظام**۔اس نظام میں کسی رسی نما چیز کو گردن کے گرد لپیٹ کر کسی کو معلق کرکے اس کا دم نکالا جاتا ہے۔

(۲) **شریانوں پر بند باندھ کے دم نکالنے کا نظام**۔اس نظام میں کسی کو لٹکائے بغیر رسی کی طرح کی کسی چیز سے عذاب دے کر مارا جاتا ہے۔

نوٹ: عذاب دینے کا لفظ علما کی طرح اپنے پاس سے نہیں لکھا گیا بلکہ سائنس بھی **عذاب** کو مانتی ہے جس کے لئے garrotte کا لفظ سائنس کی اصطلاحات میں دیکھا جاسکتا ہے اور ترجمہ کی جانیوالی''ذرع'' کی سائنسی تشریح کے مندرجہ بالا انگریزی متن میں بھی یہ لفظ دیکھا جا سکتا ہے۔جو کچھ یہاں بیان کیا جارہاہے اس عمل کا قرآنی حوالہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمُ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ (۶:۹۳)

''اور کاش تم ان ظالم لوگوں کواس وقت دیکھو جب موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں۔آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی۔''

(۳) **ہاتھ سے گردن دبا کے دم نکالنا**۔انگلیوں یا کسی دوسری انتہائی مہلک چیز سے دم نکالنا۔ کئی ایسے نظام بھی ہیں جو دماغ میں آکسیجن کی نارمل روانی میں مداخلت کر کے دم نکالتے ہیں۔

(الف):اطراف کی شریانوں یا شہ رگوں کو بھینچ کے دم نکالنا۔

(ب): شریانوں کے گودال کے خلاف تحریک سے خون کے فشار کو روکنا، دل پر ضرب لگانا یا دونوں طریقے استعمال کرنا۔

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَ اَدْبَارَھُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (۸:۵۰)

''اور اگر تو دیکھے کہ جس وقت فرشتے کافروں کی جان قبض کرتے ہیں ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں اور کہتے ہیں جلنے کا عذاب چکھو۔'' (۸:۵۰)

یہ دم نکالنے کی نوعیت پر منحصر ہے کہ ان میں سے کوئی ایک یا کئی طریقوں کو اکٹھا استعمال کیا جائے۔ دم نکالنے کے لئے جو مرکزی نظام یا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے وہ دل کے کام کرنے میں رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے دماغ میں جانے والا خون بند ہو کر اعصاب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتا ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس عمل کے اطلاق کے بعد غشی پڑنے کا عرصہ سات سے چودہ سیکنڈ اور کچھ حالتوں میں ایک منٹ بتایا گیا ہے۔ جس سے غشی طاری ہونے کے بعد منٹوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔

شریانوں پر بند باندھ کے دم نکالنا ''عذاب'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جس میں سل یعنی کیبل نما یا ڈوری کی طرح کی کوئی چیز جیسے رسی یا تار کو جزوی طور پر یا مکمل طور پر گردن کے گرد لپیٹ کر دم نکالا جاتا ہے۔ اگرچہ سانس بند کر کے جان نکالنے کا یہ طریقہ بھی ملتا جلتا ہے مگر اس میں فرق یہ ہے کہ جس قوت سے گلا گھوٹ کر جان نکالی جاتی ہے وہ قوت کسی شخص کو لٹکا کر اس کے اپنے جسم کے وزن سے پیدا کرنے کی بجائے کسی اور چیز سے پیدا کی جاتی ہے۔ **وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا** ۔ ان کی قسم جو (جان ان کے جسموں کے ایک ایک انگ میں سے) نہایت سختی سے کھینچ لاتے ہیں۔ (79/1)۔ **وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا**. اور ان کی قسم جو (مومنوں کی جان کے) بند نہایت نرمی سے کھول دیتے ہیں۔ (79/2)۔ **قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ تُرْجَعُوْنَ.** کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاتے ہو (32/11)

قارئینِ کرام زیر نظر آیت **ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَۃٍ ذَرْعُھَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُکُوْہُ** (۶۹:۳۲) پر نہایت غور و خوض کرنے کے بعد ہم ذ-ر-ع کے بنیادی حروف سے ماخوذ لفظ ذَرْعُھَا پر اپنی تحقیق مکمل کر کے یہ ثابت کر چکے ہیں اس لفظ کا مروجہ ترجمہ یعنی ہاتھ، لمبائی یا کیوبٹ درست نہیں بلکہ یہ اس سلسلے یا نظام کا حصہ ہے جس میں انسان کی روح قبض کر کے اسے موت دی جاتی ہے۔ اسی آیت کا ایک اور لفظ ذِرَاعًا بھی ہماری تحقیق کا حصہ ہے۔ اس آیت کے تراجم اور تفسیروں میں سبھی افکار کے علما نے ایک تیر سے دو دو شکار کئے ہیں۔ بنیادی حروف ذ-ر-ع سے ذَرْعُھَا اٹھانے کے بعد شاید بنیادی الفاظ کی قلت کی وجہ سے ذِرَاعًا بھی انہیں بنیادی حروف سے اٹھا لیا گیا۔ جبکہ ذِرَاعًا کے بنیادی حروف ذ-ر-أ ہیں جن سے حاصل ہونے والے بنیادی لفظ یا مخرج ذرأَ سے ہی ذِرَاعًا ماخوذ ہے۔ جس کا مطلب ہے پیدا کرنا۔ کسی بھی اچھی لغت یا قاموس میں یہ لفظ اسی مطلب میں ملے گا۔ قرآن کے کسی لفظ کو سمجھنے اور اس کا ترجمہ کرنے میں غلط بنیادی حروف یا ان سے بننے والے مخرج کا غلط انتخاب اور قرآن کے کسی لفظ کے غلط معانی کا استعمال صرف ہمارے زیر مطالعہ آیت ۶۹:۳۲ میں ہی نہیں دیکھا گیا بلکہ پورے قرآن کے تراجم اور تفسیروں میں یہی غلطی کی گئی ہے جس کی نشان دہی اور تصحیح کسی بھی مکتبۂ فکر کے عالم نے نہیں کی۔ ہمارے سبھی علما اپنے اپنے نظریات کے مطابق ان غلطیوں کو الٹی سیدھی اور بے تکی دلیلوں سے صحیح ثابت کر کے غلطیوں پر مزید غلطیاں کرتے رہے جس کی وجہ سے قرآن کا اصل مفہوم لوگوں تک نہیں پہنچ سکا۔

عربی زبان کے متعین کردہ محدود بنیادی حروف (root letters) قرآن کو نہیں بلکہ اس خطے میں بولی جانے والی زبان اور وہاں کی مخصوص ثقافت کو مدِنظر رکھ کر قدیم علما نے بنائے تھے جو عربی زبان کی ضرورت تو شاید پوری کرتے ہوں مگر قرآن فہمی کی ضرورت پوری نہیں کرتے۔ اسلام کوئی نیا دین نہیں لایا بلکہ جو دین حضرت محمد ﷺ سے پہلے انبیا علیہ السلام کو دیا گیا تھا آپ ﷺ کو اسی دین کو قائم کرنے کا ریمائنڈر (reminder) قرآن کی شکل میں بھیجا گیا۔ اپنی زبان میں ریمائنڈر یاد دہانی کو کہا جاتا ہے جسے قرآن نے ''ذکر'' کہا ہے۔ یاد دہانی، ریمائنڈر اور ذکر کسی بالکل نئی چیز کا نہیں ہوتا بلکہ اسی بات کا ہوتا ہے جو کبھی پہلے بھی بتائی گئی ہو مگر آپ نے اسے یاد نہ رکھا ہو اور پہلے سے بتائے ہوئے قوانین کی توثیق اور انہیں کا پھر سے اجرا مقصود ہو۔

شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِهٖۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ (۴۲:۱۳)

”تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور اسی راستہ کی ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین پر قائم رہو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔“ (۴۲:۱۳)

ہم اپنے دیگر مضامین میں یہ بات تحقیق سے ثابت کر چکے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کا اصل مخرج عربی زبان کی بنیادی سامی (Semitic) زبانوں یعنی عبرانی اور ارامی زبانوں سے نکلتا ہے جو قرآن سے پہلے نازل ہونے والے صحیفوں اور وحی کے سلسلے کی مقدس زبانیں ہیں۔ لہٰذا، قرآن کو سمجھنے کے لئے بنیادی الفاظ اگر عربی زبان کو تشکیل دینے والی عبرانی، ارامی اور سیریائی زبانوں کو مدِنظر رکھ کر لئے جاتے تو قرآن فہمی میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوتی اور نہ ہی امت میں پھوٹ پڑتی۔ مگر ہم تو قرآن کو اپنے نظریات میں ڈھال کر پڑھتے ہیں اور قرآن میں بیان کردہ سچائیوں کو جاننا ہی نہیں چاہتے۔ خواہ ہم شیعہ ہوں، سنی ہوں، اہلِ حدیث ہوں یا اہلِ قرآن۔ ہم اپنے اپنے نظریات میں فرعون بنے بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد جو بگاڑ ہمارے دین میں پیدا ہوا تھا وہ آج تک درست نہیں ہو سکا۔ اگر سبھی علماء اور ان کے جیالے پیروکار اپنے الگ الگ نظریات کو چھوڑ کر صرف ایک قرآن پر متفق ہو جاتے تو نہ دین مذہب میں تبدیل ہوتا اور نا ہی مذہبی فرقے وجود میں آتے۔ جب قرآن فہمی کی بنیاد ہی غلط ہو گی تو عجمیوں کو کیا عربیوں کو بھی قرآن سمجھ نہیں آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کے وزیر اطلاعات نے قرآن کی آیت ۳:۵۴ کا حوالہ دے کر بین الاقوامی میڈیا کو یہ بیان دیا۔ Allah was the best deceivers عربی وزیر کیا کرے اس نے بھی ”مکر“ کے مروجہ بنیادی حروف سے قرآن سیکھا ہے۔ عربی لغات کے علاوہ دنیا کی تمام ڈکشنریوں میں ”مکر“ کی تعریف میں مثبت اور منفی دونوں طرح کے معانی دیئے گئے ہیں مگر ہمارے یہاں مکر کے معانی میں صرف، فریب اور دھوکہ دہی کے الفاظ ملتے ہیں۔ ہم وہی لفظ مکر وہ اور دھوکے باز لوگوں کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں اور انہیں الفاظ کو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ کہاں گئی وہ جامع زبان جس میں ایک تلوار کے سو سو نام بتائے جاتے ہیں؟ ایک ایک چیز کے سو سو نام ہوں اور قرآن فہمی میں الفاظ کی اتنی قلت!

اگرچہ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا تھا مگر دورِ حاضر کے علما نے بھی قرآن کو سمجھنے کے معاملے میں کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق قرآن کو بھی نئے انداز سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ قرآن جس کا ایک ایک لفظ اپنے آپ میں کسی قاموس اور معجم سے کم نہیں اس کے اسی ہزار (۸۰۰۰۰) سے ذائد الفاظ کو ہم نے صرف دو ہزار (۲۰۰۰) بنیادی الفاظ میں قید کر کے رکھ دیا۔ صورتِ حال یہ ہے کہ قرآن کے چالیس (۴۰) لفظ مقامی عربی کے ایک ہی بنیادی لفظ سے نکالے جا رہے ہیں۔ راقم الحروف بھی اپنی تحریروں میں اس اندیشے کے پیشِ نظر انہیں پرانے سہ حرفی رکشوں کو دھکا لگا کر کھینچنے پر مجبور ہے کہ روایتی علمائے دین اور ان کے جیالے اچک کر بنیادی حروف پکڑیں گے اور نہایت ہوشیاری سے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیں گے۔ جو کچھ یہاں کہا جا رہا ہے اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ بھی متفق نہ ہوں مگر سمجھنے والی بات صرف یہ ہے کہ بنیادی حروف قرآن کا ماخذ نہیں بلکہ قرآن کے الفاظ کو سمجھنے کے لئے قدیم علماء نے بنیادی حروف کا جو قاعدہ بنایا تھا اس کے ہار میں قرآن کو اپنے نظریات کے مطابق پرو دیا گیا۔ ان قدیم علماء کے اخذ کئے ہوئے راستے پر اندھی بھیڑوں کی طرح چلنے والے لوگ اپنے سینے میں غازی علم الدین شہید کے سے جذبات تو ضرور لئے پھرتے ہیں مگر یہ بات ان کے پلے بالکل بھی نہیں پڑتی کہ چالیس پر تقسیم کرنے کے بعد پڑھنے اور سمجھنے کے لئے کتنا قرآن باقی بچتا ہے؟ ہاں البتہ ثواب کے لئے پڑھتے ہیں تو وہ ان کا اپنا عقیدہ ہے مگر حقیقت میں تو آپ نے اور آپ کے علماء نے قرآن کو خود آدھا کر دیا۔ قرآن کا حقیقی پیغام جو آج ہمیں سمجھ نہیں آتا اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم نے اس کے حقیقی پیغام کو دبا رکھا ہے۔ اسی لئے ہم میں کوئی تبدیلی بھی نہیں آتی۔ نہ ایمان میں، نہ کردار میں، نہ اطوار میں اور نا ہی ہماری زندگی میں۔ روز جی جی کے مرتے ہیں لیکن نصیحت پھر بھی نہیں پکڑتے۔ ہمارے سبھی علما نے قرآن کے الفاظ کو حدیثوں میں تلاش کیا اور انہیں حدیثوں کی روشنی میں قرآن کو سمجھنے کے لئے لغات بنا ڈالیں۔ یعنی عربی لغات اور خاص طور

پر قرآن کے نام سے چھپنے والی تمام لغات حدیثوں کا دوسرا نام ہیں۔ کیسی منافقت ہے؟ حدیثیں چھوڑ کے ان سے لغات بنالیں جن سے قرآن کا ترجمہ کیا اور انہیں حدیثوں کے پس منظر میں قرآن کی تفسیر بھی لکھ ڈالی۔ اسپتال کے صدر دروازے پر کھڑی ہوئی گنے کا جوس نکالنے والی مشین میں کیڑا لگا ہوا گنا پیڑھ کے جوس نکالا اور وہی زہریلہ جوس طالبِ شفا مریضوں کو پلا دیا۔ پیلیا کا لے یرقان میں بدل گیا اور ہپا ٹائٹس والے آگے رخصت ہوگئے۔ صرف وہ بچا جو گنے کے جوس کی ریڑی کے پاس سے گزر گیا مگر ریڑی والے کے جھانسے میں آکر رکا نہیں۔ یاد رکھیے، کھلے دل سے غلطی تسلیم نہیں کریں گے تو کبھی درستگی نہیں ہوگی۔ جس لفظ کی بنیاد ہی غلط چنی جائے گی اس کا مطلب بھی لامحالہ غلط نکلے گا۔ خواہ علمائے حدیث ہوں یا قرآن والے دونوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ قرآن کو حدیث سے نیچا دکھانے میں دونوں مکتبہِ فکر کے علما کا اتحاد ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کہہ کے کرتا ہے اور دوسرا قرآن کے نام پر لوگوں کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان غلطیوں کو درست کیوں نہیں کیا گیا؟ حدیث والوں کی بات چھوڑ دیجئے کم از کم قرآن والے ہی عقل کرتے!

قرآنِ کریم میں استعمال کئے ہوئے اللہ تبارک تعالیٰ کی وحی کے الفاظ کے حقیقی معانی کو مؤثر طریقے سے مروڑنا اور اسلامی روایت کے طرزِ عمل کا جواز پیش کرنے کے لئے ہیرا پھیری کرنا ہمارے سبھی علماء کا خاصہ ہے۔ بنیادی حروف (ROOT LETTERS) کے ذریعے قرآن کو سمجھنے میں الجھن (CONFUSION) پیدا کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ قرآن کے معاملے میں ہر اس جگہ آپ کو کم وبیش ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جہاں قرآن کے اصل بیان اور مفہوم کو چھپا کر جان بوجھ کے ایسی الجھن اور کنفیوژن پیدا کی گئی ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی آپ قرآن کے اصل بیان کو سمجھ نہ پائیں۔ صَلاۃ کو آج تک ہم کیوں نہیں سمجھ پائے؟ اس کے پیچھے بھی وہی سازش کارفرماں ہے۔ "صَلاۃٌ" کا لفظ جان بوجھ کر اَلْأَفْعَالُ الْمُعْتَلَّةُ یعنی ناقص، ضعیف اور کمزور مصدر (The weak verbs) سے اٹھایا اور اس کے بعد اسے مختلف بنیادی حروف اور مخارج میں بانٹ دیا گیا تاکہ قرآن کی بتائی ہوئی حقیقی "صَلاۃٌ" کا نام ونشان تک مٹ جائے کیونکہ یہ وہی "صَلاۃٌ" تھی جس کی بدولت مسلمان کہلانے والے عام سے لوگوں نے اپنے وقت کی سپر پاور کی اینٹ سے اینٹ بجا کے رکھ دی تھی۔ اسی "صَلاۃٌ" کی وجہ سے مسلمانوں کو فتح پے فتح نصیب ہورہی تھی۔ مسلمانوں کی ثابت قدمی، ان کی پیش قدمی، ان کی خوشحالی، ان کی عزت وتوقیر اور ان کے عروج کو ہمیشہ کے لئے پستی، بدحالی، ذلت اور شکست میں بدلنا مقصود تھا اس لئے "صَلاۃٌ" کے بنیادی حروف ہیرا پھری کر کے وصل سے بدل کر ص ل و، ص ل ی اور ص ل ل کر دیئے گئے تاکہ 'صَلاۃٌ' کا مفہوم اور معانی ہماری سمجھ میں نہ آئیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کیلئے مختلف آیات کے تراجم میں 'صَلاۃٌ' کے مختلف بنیادی حروف سے بنے ہوئے مخارج استعمال کئے گئے تاکہ 'صَلاۃٌ' کی کئی اقسام بن جائیں جس کی وجہ سے پر پھلائے ہوئے پرندوں کی "صَلاۃٌ" الگ ہوگئی، فرشتوں کی "صَلاۃٌ" کو کوئی اور نام دے دیا گیا انسانوں کی "صَلاۃٌ" کے معانی اور قواعد ہر مکتبۂ فکر نے اپنی ضرورت کے مطابق الگ الگ گھڑ لئے۔ دراصل یصلو، تصلو، یصلونه، یوصلو، وصلنه، وصیلة، وصاله، وصله، یصلون، صلو، یصلی، صلة، صلاة سبھی قرآنی الفاظ بنیادی لفظ وصل سے ہی ماخوذ ہیں اور یہی وہ مخرج ہے جس میں قرآنی "صَلاۃٌ" کا اصل عکس جھلکتا ہے۔ یہی لفظ قرآن سے پہلے صحیفوں میں بھی ملتا ہے اور یہی "صَلاۃٌ" ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ سے پہلے انبیا علیہ السلام کو بھی دی گئی تھی جو یقیناً قرآن کی بتائی ہوئی "صَلاۃٌ" سے مختلف نہیں تھی۔ اگر ہم اس بات سے اختلاف کرتے ہیں تو پہلے انبیا کا سارا عمل بھی مشکوک ہوجاتا ہے اور قرآن کی مندرجہ ذیل آیت کا کوئی مطلب بھی باقی نہیں رہتا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲:۱۳)

"تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور اسی راستہ کی ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین پر قائم رہو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔" (۴۲:۱۳)

ہم عقیدت اور احترام میں عربوں کے گن گاتے رہے اور کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ قرآن میں اصل گڑبڑ انہیں کے ہاتھوں شروع ہوئی۔ اسی تناظر میں قرآن کی ایک آیت کا مطالعہ کرتے

ہوئے ہم اپنے مضمون کو آگے بڑھاتے ہیں۔

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا یَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ (۹:۹۷)

"عرب کفر اور نفاق میں بہت زیادہ سخت ہیں اور اسی لائق ہیں کہ نہ سیکھیں وہ قاعدے جو نازل کئے اللہ نے اپنے رسول پر اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔" (۹:۹۷)

The Arabs (al-arabu)are the worst in rejection and hypocrisy, and more likely not to know the limits of what God has sent upon His messenger. (9:97)

ہمارے مترجمین اور علماِ کرام کی منافقت اس آیت کے تراجم اور تشریح سے کھل کر سامنے آتی ہے۔ اللہ نے اس آیت میں صاف صاف عربوں کا نام لے کر انہیں قرآن کے ایسے بدترین منکر اور منافق کہا ہے جو قرآن کے دائرہ عمل کو بالکل نہیں پہچانتے۔ مگر ہمارے علما اور مترجمین نے عربوں سے ڈر کے مارے اور انہیں خوش رکھنے کے لئے اپنے تمام تراجم اور تشریح میں العراب (The Arabs) کا ترجمہ عربوں کی بجائے بدو کر رکھا ہے۔ ہم کیسے مسلمان ہیں کہ اللہ کے کلام میں تبدیلی کرتے ہوئے اللہ سے بالکل نہیں ڈرتے؟ جہاں قرآن کا بیان ان کے نظریات سے الگ ہوا وہیں کسی نہ کسی بہانے سے تبدیلی کر دی۔ کیونکہ روایات میں بیان کی ہوئی افسانوی قیامت سے پہلے زندہ ہونے کا تصور ہمارے نظریات میں شامل نہیں اس لئے **ثُمَّ فِیۡ سِلۡسِلَۃٍ ذَرۡعُہَا سَبۡعُوۡنَ ذِرَاعًا فَاسۡلُکُوۡہُ** (۶۹:۳۲) کے لفظ **ذَرۡعُہَا** کے مفہوم میں بھی تبدیلی کی گئی جو بالائی سطور میں مکمل تفصیل کے ساتھ آپ پر عیاں ہو چکی ہے۔ اسی آیت کے لفظ ذِرَاعًا کو جان بوجھ کر غلط بنیادی حروف ذ ر ع سے اخذ کیا گیا تا کہ اس کے حقیقی معانی چھپ جائیں۔ بنیادی حروف ذرأَ سے نکلنے والا لفظ ذِرَاعًا بھی دو الفاظ ذرَا اور عَا کے ادغام سے بنا ہے۔

لین کی لغت کی جلد سوم کے صفحہ ۱۲۳-۱۲۴ پر "ذ -ر -ا" کے معانی ان الفاظ میں دیئے گئے ہیں: پیدا کرنا، تخلیق کرنا، بکھیرنا، تکثیر کرنا، بیج بونا، وافر، بچے، جنین یا تخم آوری یعنی سلالہ اور ذریہ۔

قرآن کی آیات ۶:۱۳۶، ۷:۱۷۹، ۱۶:۱۳، ۲۳:۷۹، ۶۷:۲۴ اور ۴۲:۱۱ میں ذرا کا استعمال انہیں معانی میں ہوا ہے۔

Thal-Ra-Alif = to produce/create/scatter/multiply/broadcast/ sow, numerous, children/offspring.

dhara'a vb. (1)

perf. act. 6:136, 7:179, 16:13, 23:79, 67:24

impf. act. 42:11

Lane's Lexicon, Volume 3, page: 123, 124

"ذ-ر-ر" کے بنیادی حروف بھی "ذ-ر-ا" سے ملتے جلتے معانی دیتے ہیں مثلاً: منتشر کرنا، بکھیرنا، چھڑکنا، چڑھنا یا ارتفاع۔ کسی چیز کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ، چھوٹی چینٹی، ایک مہین ذرّے جیسا حشرات الارض، اناج کا مہین ترین بیج، کھلنا، چھڑکا ہوا مہین ذرّہ۔ جنین، بچے، نسل، پرورش پانے والے بچے۔ **ذَرَّۃٍ** قرآن کی آیات ۳۴:۲۲، ۳۴:۳، ۱۰:۶۱، ۴:۴۰، ۹۹:۷ اور ۹۹:۸ میں استعمال ہوا ہے جبکہ **ذُرِّیَّۃٌ** کا استعمال آیات ۲:۱۲۴، ۲:۱۲۸، ۲:۲۲۶، ۳:۳۴، ۳:۳۶، ۳:۳۸، ۶:۱۳۳، ۶:۸۷، ۶:۸۴، ۴:۹، ۱۰:۸۳، ۷:۱۷۳، ۷:۱۷۲، ۱۸:۵۰، ۱۷:۶۲، ۱۷:۳، ۱۴:۴۰، ۱۴:۳۷، ۱۳:۳۸، ۱۳:۲۳، ۱۹:۵۸، ۲۵:۷۴، ۲۹:۲۷، ۳۶:۴۱، ۳۷:۷۷، ۳۷:۱۱۳، ۴۰:۸، ۴۶:۱۵، ۵۲:۲۱، ۵۲:۲۱ اور ۵۷:۲۶ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (لین کا قاموس، جلد ۳ صفحہ ۱۲۳)

Thal-Ra-Ra = to scatter, strew, sprinkle, rise.

Least degree.

Atom, small ant, smallest kind of an ant resembling in weight and shape to an atom, smallest seed of grain, grub, small particle thats sprinkled.

Progeny, offspring, children, race, raising children.

dharrah n.f. 4:40, 10:61, 34:3, 34:22, 99:7, 99:8

dhurriyah n.f. 2:124, 2:128, 2:266, 3:34, 3:36, 3:38, 4:9, 6:84, 6:87, 6:133, 7:172, 7:173, 10:83, 13:23, 13:38, 14:37, 14:40, 17:3, 17:62, 18:50, 19:58, 19:58, 25:74, 29:27, 36:41, 37:77, 37:113, 40:8, 46:15, 52:21, 52:21, 57:26

Lane's Lexicon, Volume 3, page: 123

قارئینِ کرام ذ-ر-ر اور ذ-ر-ا کے بنیادی حروف والی آیات پر غور کیا جائے تو یہ جاننے

میں بالکل بھی دیر نہیں لگتی کہ ''ذ–ر–ا اور ذ–ر–ا'' اصل میں ایک مخرج ہے جو درحقیقت زرع کے معانی رکھتا ہے جس میں بیج بونا (SOW) , کاشت کرنا (CULTIVATION)، اگانا (IMPLANT) نشا (GROW)، ذرے کے برابر بیج (SEED) اور جنین (OFFSPRING) یعنی ایک مہین بیج سے انسان کی نسل کی کاشتکاری اور پیدائش کی بات کی جارہی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات کے قطعات میں ہمارے زیر مطالعہ لفظ **ذرا** سے پیدا کرنے کا مطلب لیا گیا ہے۔ مضمون کی طوالت کے باعث سبھی آیات نقل کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا، بالائی سطور میں بہت سی آیات کے حوالے درج کردیئے گئے ہیں جنہیں مزید مطالعہ کے لئے قرآن میں دیکھا جاسکتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (۷:۱۷۹)

''اور ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جن اور آدمی پیدا کیے ہیں۔'' (۷:۱۷۹)

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِى الْاَرْضِ (۱۶:۱۳)

''اور جو زمین میں پیدا کر رکھا ہے۔'' (۱۶:۱۳)

وَهُوَ الَّذِىْ ذَرَاَكُمْ فِى الْاَرْضِ (۲۳:۷۹)

''وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر پیدا کیا۔'' (۲۳:۷۹)

لہٰذا، **ذرَا** کا مطلب جنین کی صورت میں دوبارہ پیدا کرنا اور **عًا** جس کے ادغام سے **ذراعا** بنا ہے۔ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

عـــا : قواعد کے لحاظ سے ''کلام معقول'' کہلاتا ہے۔ اُم القریٰ یونیورسٹی مکۃ المکرّمہ کے محقق اور استاد پروفیسر ڈاکٹر حسن غزالہ اپنی اشاعت ''ترجمہ اور فنِ نگارش'' (Translation and Stylistics) میں کسی مصدر یا اسم کے ساتھ ملحقہ لفظ ''**عـــا**'' میں پنہاں مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

عـــا is a certain speech in a certain situation on a certain topic addressed to a certain person, So, it is not speech in general.

عـــا: کسی مخصوص موضوع پر ایک خاص صورتحال میں ایک حتمی خطاب ہے جو کسی مخصوص شخص سے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا، کسی جملے میں یہ تقریر عام نہیں کہلاتی۔

''کلام کبیر'' (عا) [kalaam kbeer)]: "Big talk": "Serious/responsible talk".

(عا) کلام کبیر: یعنی ''بڑی بات'' سنجیدہ / ذمہ دار گفتگو۔

''کلام عل العین و الراس'' (عا) [kalaamak; 'ala l-ayn war-raas]: "Your speech is on (my)eye and head.

(عا) کلام عل العین و الراس: آپ کی بات سر آنکھوں پر۔

''کـــلام رجـــال'' (عـــا) [kalaam rjaal]: "Talk of men": "Responsible word", "A word of honour". This is either a comment on somebody else's statement, or a confirmation by the speaker himself. It means a responsible saying, opinion or word given firmly by a person, usually. It is a kind of oath or a pledge made by him for another person that he assumes full responsibility to meet someone.

''کـــلام رجـــال'' (عا): انسانوں کی بات، ذمہ دار لفظ، عزت کا لفظ۔ کسی کے بیان پر تبصرہ یا خود بیان دینے والے کی تصدیق۔ اس کا مطلب ایک ذمہ دارانہ گفتگو، رائے یا عام طور پر کسی شخص کا دیا ہوا محکم لفظ۔ یہ اس کا کسی دوسرے شخص کے لئے بنایا ہوا ایک طرح کا حلف یا عہد ہوتا ہے جو اس پر پورا اترنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔

''قـــول صـــائـــب'' [qawlon saa'eb]: "Hitting saying": "Right saying", "Well-said". Here a saying is highly appreciated because it hits the target perfectly, right in the bull's-eye. Here lies the metaphor: a saying is identified with an arrow that hits the target in the heart. This target is the absolute truth about something or somebody. A similar expression is: **''أصـــاب كـــبـــد الـــحـــقـــيـــقـــة''** [asaaba kabida l-haqeeqah]: "He hit the liver of the truth": "He hit the heart of the matter", where 'liver'. But truth has no liver or heart, only in the allegoric sensetherefore when hit, man's life terminates. By analogy, when truth is hit in the heart, it comes to an end and becomes clear and available to everybody.This image of hitting is preferable, especially in classical Arabic and culture.

''الـــقـــول يـــنـــفُـــذ ما لا تنفُذ الإبر'' [al-qawlu yanfuthu maa laa tanfuthu l-ibaru]:Speech penetrates where needles cannot penetrate":

"Speech is as penetrating as a pin". This metaphor is a fact of life, for words can touch the heart, whereas pins cannot. Words can still affect emotions and feelings, but pins cannot. Identical with this expression is the phrase "**ربقولاً شدمنصول**" [rubba qawlen ashaddu min sawlen]: "Perhaps a saying is tougher than an assault": "Words can be as fierce as a fight/as sharp as a needle". Words are given a power greater and more influential than an attack in a war with a deadly weapon and the possibility of a man getting killed.

قول صائب: بات سے مارنا، سیدھی بات کرنا، خوب کہنا۔ یہاں یہ بات بہت قابلِ قدر ہے کیونکہ یہ تیر ٹھیک نشانے پر لگتا ہے یعنی سیدھا سانڈھ کی آنکھ میں۔ یہ ایک ایسی بات کا استعارہ ہے جس میں تیر سیدھا دل کے نشانے پر لگتا ہے۔ یہ نشانہ کسی شے یا کسی شخص کے بارے میں حقیقتِ مطلق ہوتا ہے۔ "**أصاب كبد الحقيقة**" بھی ایک ایسا ہی کلام ہوتا ہے جس میں وہ حقیقی جگر گوشے پر ضرب لگاتا ہے یعنی کسی معاملے کے قلب پر چوٹ لگتی ہے۔ لیکن سچائی کا نہ تو جگر ہوتا ہے نہ ہی دل یہ تو محض ایک استعارہ ہے۔ لہٰذا، جب سچائی دل سے ٹکراتی ہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور وہ ہر ایک کو صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ سچائی کی چوٹ لگنے کا تصور کلاسیکل یعنی دورِ اول کی عربی زبان اور ثقافت میں ملتا ہے۔ (نوٹ: قرآن کی عربی بھی کلاسیکل عربی کہلاتی ہے۔)

القول ينفُذ ما لا تنفُذ الإبر: یہ کلام وہاں داخل ہو جاتا ہے جہاں سوئی بھی داخل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا، یہ تقریر ایک سیخ کی طرح داخل ہوتی ہے۔ یہ زندگی کی اس حقیقت کا استعارہ ہے جس میں الفاظ دل میں ایسے اتر جاتے ہیں جیسے سوئی بھی نہیں اترتی۔ یعنی یہ وہ الفاظ ہیں جو جذبات اور احساسات پر اثر انداز ہوتے ہیں جن کا مقابلہ سوئیاں بھی نہیں کر سکتیں۔

اس جملے سے بھی ایسی ہی بات کا اظہار ہوتا ہے "**ربقولاً شدمنصول**" کوئی بات کہہ دینا کسی پر حملہ کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ الفاظ سے بھی اتنی ہی آگ برستی جتنی جنگ سے یعنی الفاظ بھی سوئی جیسے نوکیلے ہوتے ہیں۔ الفاظ میں طاقت اور اثر کسی جنگ میں استعمال کئے جانے والے مردہ ہتھیاروں سے زیادہ ہوتے ہیں اور انسان کے مرنے کے امکانات بھی اس میں زیادہ ہو جاتے ہیں۔

قارئین کرام بالائی سطور میں اُم القریٰ یونیورسٹی مکۃ المکرّمہ کے محقق پروفیسر ڈاکٹر حسن غزالہ کی تحقیقی تحریر کا اصل انگریزی متن نقل کر کے آپ کی سہولت کے لئے اس کا اردو بھی پیش کر دیا گیا ہے تاکہ آپ اس بات کو بخوبی سمجھ جائیں کہ قرآن کا ایک ایک لفظ کتنا قیمتی ہے اور **ذراعا** کے ساتھ جڑا ہوا چھوٹا سا کلمہ "**عا**" بھی اپنے اندر کتنی تفصیل رکھتا ہے؟ پروفیسر حسن غزالہ کی تحقیق کی روشنی میں اس آیت "**ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ**" کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ کلمۂ "**عــــا**" کی تفصیل میں پروفیسر موصوف نے جتنی باتیں بتائیں ان سب کا اطلاق اس آیت پر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ خاص صورتِ حال (situation) تو اس آیت کے متن سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ گناہوں کی پاداش میں گرفتار کیا ہوا خاص شخص بھی ہمارے زیرِ نظر آیت میں موجود ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلمۂ مخصوص یعنی اللہ کا خاص نظام بھی متحرک ہے۔ اس مجرم کے دل پر سچائی کے تیر بھی چلائے جا رہے ہیں۔ سچائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اس کا جگر بھی چھلنی ہو چکا ہے۔ وہ حقیقت جاننے کے بعد اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ تبارک تعالیٰ کی تعریف بھی کرتا ہے۔ اللہ تعالی کے احکامات کو سر آنکھوں پر رکھنے کی یقین دہانی کرانے کے ساتھ ساتھ اس بات کا عہد بھی کرتا ہے کہ وہ دنیا میں واپس جا کر کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس کا خمیازہ وہ آج بھگت رہا ہے اور وہ شخص وہاں سے خروج کی التجاء بھی کرتا ہے۔

قرآن متعدد آیات میں ان سب باتوں کی بار بار تصدیق کرتا ہے جن کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ مگر مندرجہ بالا باتوں کا عملی اطلاق کس مقام پر اور کیسے ہوتا ہے اس بات کا ادراک ہمیں اس آیت پر تحقیق کرنے سے پہلے نہیں تھا۔ گویا، اللہ تعالی اس آیت میں اپنے اس عظیم الشان نظام سے پردہ اٹھا رہے ہیں جس میں انسان موت کے بعد داخل ہوتا ہے اور گزشتہ زندگی کے اعمال کی جانچ پڑتال (audit) کے بعد اگلی زندگی کا معاہدہ (contract agreement) کرتا ہے۔ جس میں اسے نئی ذمہ داریاں بھی دی جاتی ہیں اور اس پر پچھلی غلطیوں کا بوجھ بھی ڈال دیا جاتا ہے جن کی جزا اور سزا آنے والی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ مگر افسوس کہ جس نظام سے اللہ تعالی نے پر

وہ اس لئے اٹھایا تھا کہ انسان اللہ کے اس نظام کو سمجھ کر عقل کرے اور موت سے پہلے اپنے اعمال درست کر لے وہ ہمارے علماء نے ستر ہاتھ لمبے رسوں اور زنجیروں والے پردے سے جکڑ کے ڈھانپ دیا۔

نوٹ:۔ اُمّ القریٰ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر حسن غزالہ نے اپنی تحقیق میں ہمارے زیرِ مطالعہ آیت "ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ "(۶۹:۳۲) کا ترجمہ اور تشریح نہیں کی بلکہ ان کی تحریر کلمہ "عا" کے معانی اس کی تشریح اور عربی زبان بشمول ثقافتی اور کلاسیکی عربی یعنی قرآن کی زبان میں اس کلمہ کے استعمال تک محدود ہے۔

ذراعا کے معانی ادبی، ثقافتی اور کلاسیکی اعتبار سے دیکھنے کے بعد سائنس کی نظر سے دیکھنا بھی ضروری ہیں۔ کیونکہ قرآن کی یہی خوبصورتی ہے کہ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو اپنے آپ میں نا صرف ادبی اعتبار سے تفصیلی کلمہ ہوتے ہیں بلکہ تکنیکی اور سائنسی نکتہ نظر سے بھی اپنا مفہوم اس اعلی انداز سے واضح کرتے ہیں کہ ان کے ادبی معانی کا سائنس کے ساتھ بالکل بھی اختلاف نہیں ہوتا۔ سائنس چونکہ اطلاقی علم ہے لہٰذا، سائنس میں قرآن کے الفاظ کی عملی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ دورانِ تحقیق ہم نے یہ اصول بھی دریافت کیا کہ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر ادب اور سائنس کے امتزاج سے کیا جائے تو قرآن کا حقیقی بیان کھل کر سامنے آتا ہے۔ یہ دریافت کر کے اپنے علم کی اوقات بھی معلوم ہوگئی کہ انبیا علیہ السلام کو دیئے جانے والے علم کی ابتدا سائنس کے علم کی انتہاء ہے۔ یعنی اللہ کی وحی کے الفاظ اتنی علمی بلندیوں پر ہیں کہ آج کی انتہائی ترقی یافتہ سائنس اللہ کی طرف سے کی ہوئی وحی کے ابتدائی الفاظ کے گرد ہی گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انگریز سے سائنس اور فنی دانشوری کی سند لے کر تحقیقی میدان میں اترے تو اتنے بڑے تیس مار خاں بن گئے کہ بڑوں بڑوں کی مونچھ کے بال اکھاڑ لائے۔ مگر جب قرآن پڑھنے کے بعد اپنے علم کا اندازہ ہوا تو ایسا لگا جیسے قرآن کہہ رہا ہو کہ عقل کے اندھو! آنکھیں کھول کر دیکھو ہم نے ان سب اصولوں (theories) کا عملی اطلاق پہلے ہی کر رکھا ہے جن کے بارے میں تم ابھی سوچ ہی رہے ہو۔ بالکل ایسا لگا جیسے چھت پر پہنچنے کے قریب تھے کہ کسی نے نیچے سے سیڑھی کھینچ لی اور دھڑام سے منہ کے بل زمین پے گر پڑے۔ سجدہِ سہو بھی ادا ہو گیا اور قرآن کی سچائی معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ سے قرآن سنتے ہی لوگ کیونکر ایمان لے آتے تھے اور کفار کیوں کہتے تھے کہ جس چیز کی آپ ﷺ تلاوت فرماتے ہیں اس میں جادو ہے؟

زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب انسان نے تجربہ گاہ میں بھیڑ کا بچہ بنایا۔ اصل کوشش تو انسان کا بچہ بنانے کی تھی مگر کلیسا والوں تک خبر پہنچی تو مذہب آڑے آیا جس نے حسبِ عادت سائنس کو ناقص علم قرار دیتے ہوئے مذہبی اور اخلاقی اقدار کا سہارا لے کر یہ منصوبہ بند کروا دیا۔ حکومت خواہ کسی ملک کی بھی ہو اسے مصلحتاً مذہبی ٹھیکے داروں کے دباؤ میں آ کر اسے ان کی بات ماننا پڑتی ہے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکومتیں بھی کی تبدیل ہو جاتی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ وقتی پابندیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور دنیا کا نظام اپنی ڈگر پر رواں دواں رہتا ہے۔ عام لوگ یہی سمجھتے رہے کہ یہ منصوبہ نا کام ہو کر بند ہو گیا کیونکہ بھیڑ کا بچہ بنانے کے بعد سولہ سال سے سائنسدان خاموش بیٹھے تھے۔ یہ خاموشی صرف ان لوگوں کے لئے تھی جو محققین اور سائنسدانوں کی مذکورہ جماعت سے باہر تھے۔ اندر کی بات یہ تھی کہ درحقیقت پوپ نے اپنے ایڈز کے مرض کا علاج کرانے کے دوران سائنسدانوں کو ان شرائط پر اپنا کام جاری رکھنے کی اجازت دے دی تھی کہ وہ پوپ کو لاحق ہونے والی ایڈز کو خفیہ رکھیں گے اور پوپ کو زندہ رکھنے کے لئے اعضا سازی کریں گے۔ سائنسدان حضرات بھی کم نہیں تھے انھوں نے پوپ کے کانوں تک خود ہی یہ بات پہنچائی تھی کہ جو تکنیک کلوننگ (cloning) یعنی انسان کا بچہ بنانے میں استعمال ہوگی اسی تکنیک کی بدولت انسانوں کے اعضا بھی دوبارہ پیدا کئے جا سکتے ہیں اور انسانی جسم کے ناکارہ ہو جانے والے اعضا کو نئے اعضا سے بدلنا بھی ممکن ہو جائے گا۔ یعنی دل، جگر، گردے اور پھیپھڑے وغیرہ سب دوبارہ پیدا ہو جائیں گے۔ پوپ کے کانوں تک یہ بات پہنچانے کے بعد سائنسدان اطمنان سے اپنا کام کرتے رہے۔ اس وقت پروفیسر جان گرڈن (John Gurdon) کیمبرج یونیورسٹی میں کام کر رہے تھے، پروفیسر کرس میسن (Chris Mason) یوسی ایل، لندن یونیورسٹی میں تھے۔ روبن لوول بیج (Robin Lovell-Badge) طبی تحقیق کے برطانوی قومی ادارے (The National Institute for Medical Research in London) میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے اور چارلس ویکینٹی (Charles Vacanti) ہاورڈ یونیورسٹی (Harvard

(University) میں سائنسدانوں کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرنے کے ساتھ ساتھ جاپان کے سائنسدان ہروکو اوبوکاٹا (Haruko Obokata) کے ساتھ مل کر انسانی خلیے کو الٹا لپیٹنے (rewind) پر کام کر رہے تھے جو درحقیقت وقت کو الٹا چلا کے پیچھے لے جانے والی بات تھی۔ وہ انسانی خلیئے کو واپس لپیٹ کر ٹھیک اسی مقام پر لے جانا چاہتے تھے جہاں سے پیدا ہونے کے بعد یہ خلیہ چلتے چلتے موجودہ عمر تک پہنچتا ہے۔ یعنی یہ منصوبہ کسی عمر رسیدہ شخص کو نئے سرے سے پیدا کرنے یا نقطۂ آغاز سے انسان کی تجدید کرنے پر مشتمل تھا۔

اس علم کو سائنس کی زبان میں جینیٹک ٹیکنالوجی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے تجربات اللہ کے قوانینِ حیات پر گہرائی میں غور و خوض کرنے کے بعد کئے جا رہے ہیں۔ وہ کیا بات تھی کہ اسی سال سے زائد عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹا ہونے کی نوید سنائی گئی جبکہ انکی زوجہ محترمہ بھی بانجھ ہو چکی تھیں؟ "وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ "(۲۶:۸۰) اور "وَالَّذِیْ يُمِيْتُنِیْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ "(۲۶:۸۱) قرآن کی یہ دونوں آیات اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیانِ مبارک میں آتی ہیں مگر بحیثیتِ مجموعی ان کا اطلاق نا صرف بنی نوع انسان بلکہ ہر ذی حیات پر ہوتا ہے۔ یہ وہ آیات ہیں جو علمِ حیاتیات اور جینیٹک انجینئرنگ کے قوانین سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کوئی کچھ بھی کرے مگر اصل بات جو قرآن یہاں سمجھا رہا ہے وہ یہ ہے کہ "کسی لاعلاج مرض کا علاج مردہ ٹشو کو دوبارہ زندہ کر کے کیا جا سکتا ہے" اب اس کی تفسیر ایسے کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے بیماریوں کے علاج کے لئے ایسا نظام مقرر کیا ہے جس میں مردہ جسم نئی زندگی ملنے کی وجہ سے کام کرنے لگتا ہے۔ بیمار ہو جائیں تو ہمارا خودکار نظام بیماری کا علاج کرتا ہے لیکن جس بیماری کا علاج نہ ہو سکے اس کا علاج حیاتِ نو سے کیا جاتا ہے۔

ان آیات کا روایتی ترجمہ بھی پڑھ لیجیے: "اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفاء دیتا ہے۔" (۲۶:۸۰) "اور وہی مجھے موت دے گا پھر وہی مجھے دوبارہ زندہ فرمائے گا۔" (۲۶:۸۱) روایتی ترجمے سے انسان کو کیا فائدہ ہوا؟

"اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفاء دیتا ہے۔" (۲۶:۸۰) اس آیت میں دراصل بیماریوں کے علاج کا قدیم اور موجودہ طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ جس میں ہمارے جسم کی اپنی قوتِ مدافعت سے شفا ملتی ہے۔ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ ہماری دوائیں کچھ نہیں کرتیں سوائے اس کے کہ کسی بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے ہماری قوتِ مدافعت بڑھائیں اور بیماری کی قوت کو کمزور کریں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بعض صورتوں میں ڈاکٹر کہہ دیتے ہیں کہ مریض کا جسم دوا قبول نہیں کرتا۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جب جسم کی اپنی قوتِ مدافعت کام نہیں کرتی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوا کا انحصار قوتِ مدافعت کے نظام پر ہے۔

"اور وہی مجھے موت دے گا پھر وہی مجھے دوبارہ زندہ فرمائے گا۔" (۲۶:۸۱) اس آیت کے تراجم ہمارے علما نے قرآن کے الفاظ کے برعکس زمانہ مستقبل میں اس لئے کئے کہ ان کا غیر قرآنی عقیدہ اللہ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی کو موت دے کر قیامت سے پہلے زندہ کر دے!۔ اگر اس سے پہلی آیت ۲۶:۸۰ کا اطلاق زمانہ جاری یعنی ہر دور کے زمانہ حال میں ہوتا ہے جس کے لحاظ سے اس آیت میں بیان کئے ہوئے شفا دینے کے عمل کے تراجم بھی ہر دور کے زمانہ حال میں ہی کئے جاتے ہیں تو پھر اس سے اگلی آیت ۲۶:۸۱ میں بیان کئے ہوئے دوبارہ زندگی دینے کے عمل کے تراجم زمانہ مستقبل میں کیوں کئے جاتے ہیں؟۔ جبکہ گرامر کی رو سے ان دونوں آیات کے الفاظ اور افعال کی ترکیب بھی ایک جیسی ہے اور مستقبل کا صیغہ یعنی سوفَ یا اس کا مخفف س بھی کسی فعل کے شروع میں لگ کے اسے مستقبل کا فعل نہیں بناتے۔ یہ آیت یک طرف تو ان مردوں کو زندہ کرنے کی اللہ کی عظیم کاری گری بیان کرتی ہے جو کسی وجہ سے شفایاب نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف اس جدید علاج کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جس میں خلیات کو واپس (REWIND) الٹا گھما کر جسم کے اعضا کو نئے سرے سے اگایا (GROW) جاتا ہے۔ اور یہی جینیٹک انجینئرنگ ہے۔ جس کو سمجھنے کے لئے محققین، سائنسدان اور انجینئر حضرات دن رات کام کر رہے ہیں اور انسانی خلیئے کو واپس لپیٹنے (REWIND) کی تکنیک اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں پہنچ چکی ہے۔ اگر مسلمان روایتوں اور علما کے نظریات کے چکر میں پڑنے کی بجائے قرآن کو سمجھ کر پڑھ لیتے تو آج ہم دہشت گرد کہلوانے کی بجائے خلیئے کو ریوائینڈ (REWIND) کر کے یعنی خلیئے کو الٹا پھیر کے جینیٹک انجینئرنگ میں اعضا سازی کرنے کے ساتھ ساتھ موذی اور موروثی بیماریوں کے علاج کا سہرہ بھی اپنے سر پے رکھواتے۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ''پھراسے الٹا پھیر کے ہم نے پست سے پست تر حالت میں لوٹا دیا۔''(۹۵:۵) یہاں پر سائنس کے حوالے سے جینیٹک انجینئرنگ کی بات کی جارہی ہے جس میں انسانی خلیئے کو الٹا پھیر کے جنین سے پہلے کی حالت (pre embryonic state) میں پہنچایا جاتا ہے تاکہ اس کی دوبارہ پیدائش کی جاسکے؟ اللہ تعالی کا نظام اسی طرح کام کررہا ہے جس میں مہین سے ذرے (ذراعاً) سے زندگی ملتی ہے اور موت کے بعد پھر اسی معمولی سے ذرے کو جنین میں تبدیل کرکے انسان کی دوبارہ پیدائش کی جاتی ہے۔

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ.

''اورتم میں سے وہ بھی ہیں جو وفات پا جاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو نہایت ناکارہ عمر تک لوٹائے جاتے ہیں۔''(۲۲:۵)

یہاں بھی جینیٹک انجینئرنگ کا وہی فارمولہ مختلف انداز سے دہرایا جارہا ہے کہ جوٹشو جلدی کام کرنا چھوڑ جاتے ہیں وہ ناکارہ ہوجانے کے بعد واپس پھیر دیئے جاتے ہیں۔ترجمے کی بات تو جانے دیجیے اس آیت کی تفسیر میں ہمیں نہایت مدلل انداز سے یہ بتایا جاتا ہے کہ بڑھاپے میں انسان کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں،اس کے بعد اس آیت کو اسی جوڑتوڑ کے نظریاتی طریقے سے والدین کے ساتھ احسان کرنے والی آیت سے جوڑ کے بیان مکمل کردیا جاتا ہے۔قرآن تو کچھ اور کہہ رہا ہے مگر چونکہ ہم نے تفسیر میں ایسے ہی پڑھا تھا۔لہٰذا، ہم بغیر سوچے سمجھے اسی انداز سے اس بات کو آگے پہنچانے کا کام کررہے ہیں۔گویا غیر قرآنی خیالات کی تبلیغ ہوئی قرآن کی نہیں۔قرآن تو اس آیت میں وہ عظیم الشان بات کہہ رہا ہے جس پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔یہ وہ بات ہے جس کا حل تلاش کرنے میں آج کی سائنس اپنا ماتھا پیٹ رہی ہے۔جب سٹم سیل (stem cell) سے اعضا سازی کے تجربات کئے گئے تو ان میں سے بہت سے ٹشو کم عمری میں ہی مرگئے اور کچھ خلیئے ایسے بھی تھے جو لمبے عرصے تک زندہ رہے۔یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ان خلیات سے بنائے گئے اعضا کی عمر اور کلوننگ (cloning) سے تیار کی ہوئی زندگی کا عرصہ حیات متعین نہیں ہوسکا۔اس خامی کو دور کرنے پر دن رات کام ہورہا ہے مگر تا حال کوئی خاطر خواہ نتیجہ برامد نہیں

ہوا۔ہم یہ سوچ کر خوش کتنا خوش ہوتے ہیں کہ اس طرح غیر فطری طور پر بنائی ہوئی زندگی کونسی زیادہ دیر تک چلتی ہے؟ مگر یہ نہیں سوچتے کہ خواہ یہ زندگی ایک دن چلی یا اس سے بھی کم لیکن چلی تو سہی یعنی اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کا اطلاق کر کے محققین نے زندگی تلاش کرلی۔اس لحاظ سے بھیڑ (Dolly the sheep) کا بنانا قرآن کی سچائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔بھیڑ کا بچہ بنانے والے محققین جو آج کل اعضا سازی اور انسان سازی پر کام کررہے ہیں وہ دھریئے نہیں بلکہ ایمان میں ہم سے زیادہ مضبوط ہیں۔ان محققین کے انٹرویو پڑھ کے دیکھ لیجیے سبھی حضرات ایک ہی بات کہتے ہیں ''کہ وہ انسان کو فائدہ پہنچانے کے لئے قدرت کے قوانین کا عملی اطلاق کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔'' یہ لوگ قدرت کے قوانین کا بغور مشاہدہ کر کے ان پر یقین کی حد تک ایمان لے آئے ہیں مگر چونکہ ہمارے مکتبۂ فکر کے خیالات ان باتوں سے مطابقت نہیں رکھتے اس لئے ہماری زبان پر ہمیشہ میں نامانوں والا ورد جاری رہتا ہے۔ہم حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی نا صرف اسے جھٹلاتے ہیں بلکہ اس میں کیڑے بھی نکالتے ہیں۔جب تک ان علماء کی تفسیروں اور تراجم کو دریا برد کر کے قرآن کو نئے سرے اور آزاد ذہن سے نہیں سمجھا جائے گا اس وقت تک موجودہ اور آنے والی نسلوں میں قرآن فہمی کا راستہ ہموار نہیں ہوسکے گا۔قرآن میں سب کچھ موجود ہے اور یہ ہر زمانے کی ضروریات پر کھل کر بات کرتا ہے جس کو سمجھنے کے لئے بہت بڑی قربانی چاہیے۔یہ وہی قربانی ہے جو کفار اپنے آبا اجداد کے طور طریقے نہ چھوڑنے کی وجہ سے نہیں دے سکے تھے اور قرآن کی نظر میں منکرین کہلائے۔حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے یہی قربانی دی تو ان کی قربانی کو عظیم قربانی کا نام دیا گیا۔یہی قربانی ہمیں بھی اپنے نظریات، اپنے علما اور اپنے مکتبۂ فکر کو چھوڑ کر دینا ہوگی ورنہ ہم بھی منکرین کہلائے جائیں گے۔مگر ہمارا تو یہ حال ہے کہ اگر کوئی ہمارے نظریئے کے خلاف معمولی سی بات بھی کردے تو ہم اسے بغیر سوچے سمجھے کھڑے پیروں جھٹلا دیتے ہیں اور اگر کوئی بات ہماری سمجھ میں آ بھی رہی ہو تو اس کی خود سے تحقیق کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کی بجائے ہم اس کی تصدیق کرنے کے لئے انہیں علما اور ان کے چیلوں سے رائے لینے کو ترجیح دیتے ہیں جو لوگ خود قرآن کے مفہوم کو مسخ کرنے کے ذمہ دار

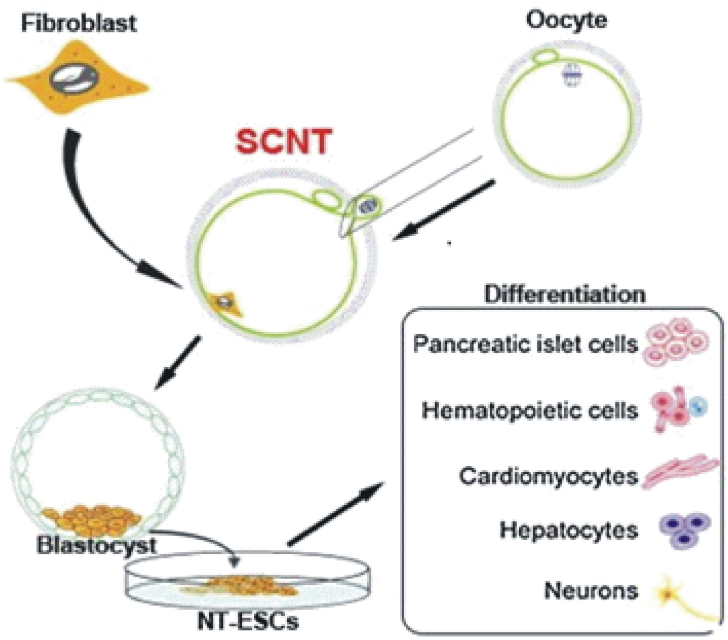
ہیں۔مگر ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہم جن سے پوچھ کر کسی بات پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں کیا ان علمائے دین نے کبھی اس غلطی کی نشان دہی کی؟ اگر انہوں نے کبھی ان غلطیوں سے پردہ نہیں اٹھایا تو وہ بالکل بھی اس قابل نہیں کہ ان سے کوئی مشورہ لیا جائے یا انہیں رجوع بھی کیا جائے۔اگر انہیں ان باتوں کا علم تھا اور انہوں نے جان بوجھ کر سچائی کو لوگوں تک نہیں پہنچایا تو وہ منافق ہیں اور اگر انہیں علم نہیں ہے تو وہ عالم نہیں بلکہ جاہل ہیں۔

میر بیمار ہوئے جس کے سبب اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

(میر تقی میر)

وَمِنكُم مَّنْ يُتَوَفّٰى وَ مِنكُم مَّنْ يُرَدُّ اِلَىٰٓ اَرْذَلِ الْعُمُرِ ''اور تم میں سے وہ بھی ہیں جو وفات پا جاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو نہایت ناکارہ عمر تک لوٹائے جاتے ہیں۔'' (۲۲:۵)

بہر حال اس آیت میں بڈھوں کے اوسان خطا ہونے کی کوئی بات نہیں کی گئی بلکہ اس خامی کا حل بتایا گیا ہے جس کو ڈھونڈنے کے لئے ہمارے علاوہ ساری دنیا سر جوڑ کے بیٹھی ہے۔جب اس خامی کو دور کر کے انسانوں کے اعضا کو نئی زندگی دی جانے لگی تو ذیابیطس کے مستقل علاج کے لئے نیا لبلبہ، نیا دل اور نئے گردے پیدا کروانے والوں کی قطار میں سرِ فہرست وہی لوگ ہوں گے جو آج اس کا انکار کر رہے ہیں۔ہمیں تو اللہ کی طرف سے سب کچھ بنا بنایا تھالی میں ڈال کے دیا گیا تھا مگر ہم نے اس کی قدر نہیں کی ! بہتر ہوتا کہ ہم ترجموں، تفسیروں اور درسوں کے چکر سے نکل کر قرآن کے اطلاقی پہلوں پر غور کرتے تا کہ ہمارے وجود سے بھی نسلِ انسانی کو کچھ فائدہ پہنچتا۔اگر ہم ایسا کرتے تو آج اکیلے نہ ہوتے بلکہ قرآن کی سچائی دیکھ کر لوگ خود بخود ہمارے ساتھ ہو لیتے۔ یہی اللہ کا ذکر، یہی صلاہ اور یہی قرآن کا حقیقی پیغام ہے جسے اللہ تبارک تعالیٰ ہمیشہ جاری رکھتے ہیں اور ''لَحٰفِظُوْنَ'' کا حقیقی مطلب بھی یہی ہے۔اللہ تبارک تعالیٰ کو اپنا ذکر ہر حال میں قائم رکھنا ہے خواہ وہ کسی بھی ذریعے سے رکھے۔جینیٹک انجینئرنگ بھی اللہ تبارک تعالی کا ایک ذکر ہے جو آپ نے قائم نہیں کیا تو دوسروں نے کر لیا۔مگر اللہ کا ذکر قائم ہو کے رہا۔اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵:۹)



سبھی موذی بیماریوں کا علاج زندگی کے ایک ہی خلیئے سے کرنے کا قرآنی طریقہ۔

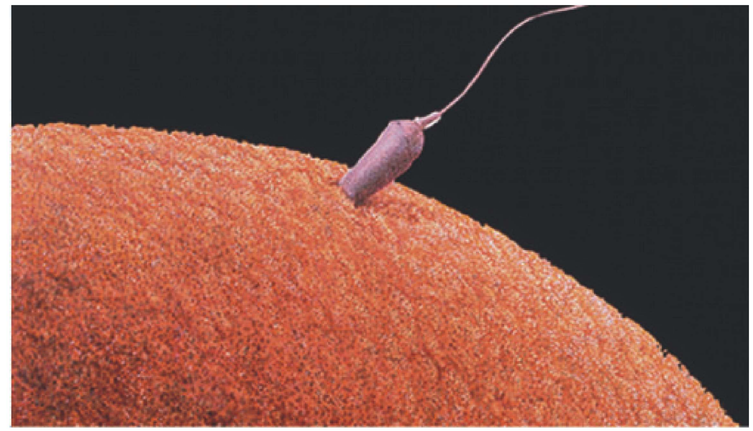
''ثُمَّ فِىْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ '' (۶۹:۳۲) میں دراصل انسانی جنین کے خلیئے کو ستر محوروں یا ستر ادوار میں سے گزار کے اپنی ابتدائی حالت میں لوٹانے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔اس آیت میں صاف صاف کہا جا رہا ہے کہ ستر مراحل میں سے گزرنے یعنی ستر بار لپیٹنے (rewind) سے خلیہ واپس اپنی ابتدائی خام حالت میں آ جاتا ہے۔اور اس مہین ذرے سے دوبارہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ ''ذرا'' کو قرآن میں انسانی کاشت کاری کا مہین ذرہ بھی کہا گیا ہے۔لغات میں ''ذِرَاعًا'' کے معانی جہاں کیوبٹ یا ہاتھ کی پیمائش بتائے گئے ہیں وہیں اسے محور، بل (twist) اور اسپنڈل (spindle) بھی کہا گیا ہے۔یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس آیت کے دونوں الفاظ ''ذَرْعُهَا'' اور ''ذِرَاعًا'' سے ہاتھ لمبی پیمائش یا کیوبٹ کا ایک ہی مطلب اخذ کیا جائے۔اگر ''ذَرْعُهَا'' کو ہاتھ کی پیمائش یا کیوبٹ کے مطلب میں

لیتے ہیں تو پھر "ذِرَاعًا" کا کیا مطلب ہوگا؟ اور اگر یہی بات "ذِرَاعًا" سے اخذ کی جا رہی ہے تو پھر "ذَرْعُهَا" کس معانی میں لیا جاتا ہے؟ اس آیت کے تراجم میں یہی سب سے بڑا جھول ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ "ذِرَاعًا" کے معانی اسپنڈل (spindle)، محور، بل (wind) اور انسانی بیج یا پیدائش کا مہین ذرہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اسی طرح "**ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ**" (۶۹:۳۲) میں اگر "سِلْسِلَةٍ" کو زنجیر، رسّہ یا تار لیا جائے تو "فَاسْلُكُوْهُ" کا مصدر "سلک" بھی یہی معانی دیتا ہے۔ جو لوگ عرب ممالک خاص طور پر بجلی کے محکمے یعنی شرکہ کھربا میں کام کر چکے ہیں وہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ سلک مکھرب بجلی کے تاروں (electric wires or cables) کو کہتے ہیں۔ بجلی کے تار بھی رسی کی طرح بل دار (stranded) ہوتے ہیں اور یہ زنجیر نما گندھے ہوئے اور کنڈے نما (connectors) بھی ہوتے ہیں۔ گنتی کے سات الفاظ پر مشتمل ایک چھوٹے سے جملے میں "ذَرْعُهَا" اور "ذِرَاعًا" جیسے جامعہ الفاظ کو ایک معانی اور "سِلْسِلَةٍ" اور "فَاسْلُكُوْهُ" جیسے بڑے مرکب الفاظ کو بھی ایک ہی معانی میں لیا جائے گا تو باقی تین الفاظ "ثُمَّ فِيْ" اور "سَبْعُوْنَ" بچتے ہیں جن سے کیا مفہوم نکلے گا؟ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کا ترجمہ انہیں تین الفاظ کو مدِنظر رکھ کر کیا گیا۔ "سِلْسِلَةٍ" اور "فَاسْلُكُوْهُ" سے زنجیروں اور رسوں سے باندھنے کا تصور لیا گیا جبکہ "ذَرْعُهَا" اور "ذِرَاعًا" کو کیوبٹ میں پیمائش بتا کر ترجمہ مکمل کر دیا گیا۔ تفسیر کرنے والے علماء نے تو ایسی واہیات باتیں لکھی ہیں جنہیں نقل کرنا بھی زیب نہیں دیتا۔ کعب الآحبار لکھتے ہیں کہ اس زنجیر کی ایک ایک کڑی پوری دنیا میں پائے جانے والے لوہے کے برابر ہوگی۔ ابنِ جریج ابنِ عباس سے روایت کرتے ہیں کہ "فَاسْلُكُوْهُ" کا مطلب یہ ہے کہ یہ ستر ہاتھ لمبی زنجیر موٹی کر کے پیچھے سے یعنی مقعد میں ڈال کر منہ سے نکالی جائے گی اور اس زنجیر میں بہت سے لوگوں کو ایک ساتھ پرو کے ایسے بھونا جائے گا جیسے ٹڈیوں کو سیخ میں پرو کے بھونا جاتا ہے۔ ابنِ کثیر بھی العوفی ابنِ عباس سے روایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زنجیر کو پیچھے سے مقعد میں گھسا کر اتنا کھینچا جائے گا کہ یہ دونوں نتھنوں سے اس طرح باہر نکلے کہ انسان اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ گویا اصل الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا اور واہیات باتیں اللہ سے منسوب کر دیں۔ انسان ارتقائی منازل طے کر کے اپنے شعور کے اعلیٰ دور تک تو پہنچ گیا مگر وہ اب بھی اللہ تبارک تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات کو کسی قبیلے کے خونخوار سردار یا ایک ایسے ظالم بادشاہ کے روپ میں دیکھتا ہے جو اپنی نافرمانی کا بدلا لینے کے لئے جلاد بنا بیٹھا ہے۔ یہ سب انسانوں کے وصف (attributes) ہیں اللہ کے نہیں کیونکہ اللہ نے ہر کام کا باقاعدہ نظام بنا رکھا ہے۔

"سِلْسِلَةٍ" بھی ایک مکمل نظام ہے جس کے دو بڑے حصے "ذَرْعُهَا" اور "ذِرَاعًا" ہیں جو گرفت، احتساب اور آنے والی زندگی میں جزا اور سزا کا اطلاق کرنے کے فرایض سرانجام دیتے ہیں۔ "ذَرْعُهَا" اور "ذِرَاعًا" کے نظام کے درمیان آنے والا لفظ "سَبْعُوْن" قرآن کی اس خوبصورت اور انوکھی طرزِ تحریر کا حصہ ہے جس میں ایک لفظ بیک وقت کئی کاموں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا، "سَبْعُوْن" ایک طرف تو "ذَرْعُهَا" کے حوالے کے ساتھ کسی شخص کی کئی اموات، ہر موت کے بعد ہونے والے احتساب اور کئی بار اللہ کی پکڑ کے سلسلے کو ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف "ذِرَاعًا" کے ساتھ مل کر کئی بار پیدائش، ہر پیدائش کے وقت انسان کی معافی تلافی اور اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کے لمبے سلسلے کو ظاہر کرتا ہے۔ "سَبْعُوْن" کو جب 'ذِرَاعًا" اور "فَاسْلُكُوْهُ" کی مادی ترکیب کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے تو یہ مادی (matter-material)، میکانکی (mechanical) اور تکنیکی (technical) عوامل (mechanism) کے ساتھ مل کر اپنی ستر بار تعداد بھی بتاتا ہے کیونکہ تعداد کا تعلق مادے (matter) یا کسی چیز کے وجود سے قائم ہوتا ہے۔ "ذِرَاعًا" کو بیج (seed) یا انسان کا جرثومہ کہا جائے تو "سَبْعُوْن" مادی شے کے حوالے سے اپنے معانی دے گا جو قرآن کے لفظ انبت یعنی ایک مہین سے جرثومے سے شروع ہونے والی زندگی سے لے کر انسان کی ارتقا کے تمام مراحل پر محیط ہوگا (جس کی تفصیل راقم الحروف کے تحقیقی مقالے قرآنی نظریہ حیات میں دیکھی جا سکتی ہے)۔ اس کے علاوہ "فَاسْلُكُوْهُ" بھی خالصتاً میکانکی عمل ہے جو انسان کو واپس لپیٹ کر

مہین کئے ہوئے ذرے کی شکل میں ماں کے رحم میں داخل کر تا ہے۔ اس لحاظ سے "فَاسْلُكُوْهُ" بیک وقت دوکام کرتا ہے یعنی ضرورت کے مطابق مادی زنجیر، تار، کیبل یا رسی نما چیز کے استعمال پر بھی دلیل رکھتا ہے اور رحم میں خلیئے کے دخول کا میکانکی عمل بھی سرانجام دیتا ہے۔سائنس کی زبان میں اس رسی کو بچے کی نال(umbilical cord) کہا جاتا ہے جس کی طبی تعریف ملاحظہ فرمائیے۔



حیاتیاتی گھڑی کاالٹا چل کرزندگی کاواپس لوٹنا(Rewinding the biological clock)

The mean of term umbilical cord length is 50 to 60 cm. A short cord at term is less than 35 cm.

Long umbilical cords, over 70 cm of length at term, are often associated with wrapping of the cord around the fetus.Some times the cord is twisted around baby's neck.

ماں کے پیٹ میں بچے کی ناف کے بند یا نال کی اوسط لمبائی ۵۰ سے ۶۰ ۔ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔لیکن جن بچوں کی نال ان کے جسم اور خاص طور پر گردن کے گرد رسی کی طرح لپٹی ہوئی پائی جا تی ہے اس کی لمبائی **70 سینٹی میٹر** ہوتی ہے۔

"**ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ** "(۶۹:۳۲) میں اس ستّر سینٹی میٹر لمبی نال کی لمبائی کو بھی "سَبْعُوْن" کہا گیا ہے۔اور ستر کے مضاعف(multiples) اگلی زندگی کے دور کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

حمل ٹھرنے کے فوراً بعد کئے جانے والے الٹراساؤنڈ کے ریکارڈ میں ماں کے رحم میں تقریباً دس ملی میٹر یعنی ایک سینٹی میٹر کے سائز کا بچہ دکھائی دیا گیا۔اس سے چھوٹے سائز کے بچے کا تصویری ریکارڈ سونوگرافی میں موجود نہیں۔ کیونکہ رحم کی نالی کے بالائی حصے میں بیضے کے زرخیز ہو کر تقسیمی مراحل سے گزرتے ہوئے آہستہ آہستہ رحم تک پہنچنے کے بعد ہی اس کو اسکین میں دیکھا جا سکتا ہے۔جس میں یہ تقریباً ایک سینٹی میٹر کی رگوں سے بھری ہوئی کاغذ جیسی مہین جلد والے ورم دار لوتھڑے(tumour) کی شکل کا دکھائی دیتا ہے۔اس ایک سینٹی میٹر کے اسپنڈل(spindle) نما جنین پر نال کے ستر بل دیئے جائیں تو کیا رسی کے ستر بل نہیں بنتے؟

سورہ کہف کی آیت ۱۸:۱۸۔(**وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ**) کا اصل مفہوم ہے کہ ''اور ان کے شکاری کتے کے ڈھانچے کو موت سے جگا کر زندہ کیا گیا۔''(۱۸:۱۸) جبکہ ہمارے سبھی علماء نے اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے''اور ان کا کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے چوکھٹ پر بیٹھا تھا'' ہم اپنے غیر قرآنی نظریات کی رو میں اس قدر بہہ گئے کہ ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ماری گئی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کئی سو سال گزرنے کے بعد بھی اصحابِ کہف کا کتا جوں کا توں وہیں زندہ بیٹھا رہا جبکہ اصحاب کہف خود حالتِ موت میں رہے؟ کیونکہ بخاری،مسلم،ترمذی اورابن ماجہ کی روایت:"**عن أبي هريرة رضى الله عنه قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: يقول الله تعالىٰ: أنا عند ظن عبدي بي، وأنا معه إذا ذكرني، فإن ذكرني في نفسه، ذكرته في نفسي، وإن ذكرني في ملإ، ذكرته في ملإ خير منهم، وإن تقرب إلي بشير، تقربت إليه ذراعا، وإن تقرب إلي ذراعا، تقربت إليه باعا(ا) وإن أتاني يمشي، أتيته هرولة.**" میں "ذراع" کو ہاتھ کہا گیا ہے خواہ کسی بشر کے ہوں یا اللہ کے اس لئے ہمارے علماء بھی "ذراع" کا مطلب ہاتھ ہی نکالتے ہیں خواہ قرآن کچھ بھی کہے لیکن ہم اپنے پیرو مرشد کا نظریہ نہیں چھوڑنے والے کیونکہ "ذراع" موت اور "ذراعیہ" کا اصل مطلب اسے موت سے زندہ کرنا یا موت سے جگانا(wake up) ہے جو ہمارے علما کے ان غیر قرآنی عقائد کی نفی کرتا ہے جس میں روزِ قیامت قبروں سے ریگ کر زندہ کئے جانے والے تصور کے خلاف اس روایتی قیامت سے پہلے ہی مردے زندہ کرنے کی بات کی

جارہی ہے۔جس طرح **وَ کَلْبُھُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ** میں ''اوران کے شکاری کتے کے ڈھانچے کوموت سے جگا کرزندہ کیا گیا۔''(۱۸:۱۸)(اصل ترجمہ)۔بعینہ ''**ثُـــمَّ فِـــیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُھَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ**''(۶۹:۳۲)میں بھی ''**ذِرَاعًا**'' انسان کو موت کے بعد ایسے ہی جگا کر زندہ کئے جانے کی بات کرتا ہے۔ان چار الفاظ (**وَ كَـــلْبُھُـــمْ بَـاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ**) کا یہ ترجمہ ''اوران کا کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے چوکھٹ پر بیٹھا تھا۔'' کر کے ہمارے علما نے ان الفاظ کے اصل معانی کو بالکل نظر انداز کر دیا جو قرآن کی اس آیت میں اللہ تعالی نے استعمال کئے ہیں۔

قارئین کرام اس آیت کے الفاظ پر توجہ فرمائیے۔کلب عربی میں کتے کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ جمع غائب کی ضمیر لگنے سے ''**كَـلْبُھُـمْ**'' بن کر مطلب نکلا ''ان کا کتا''، باسِط کو انگریزی میں Tenter کہا جاتا ہے اور فارسی میں ''چہار چوب پارچہ خشک کنی'' کہا جاتا ہے۔یعنی وہ جگہ جہاں جانوروں کی کھالیں خشک کرنے کے لئے ڈالی جاتی ہیں۔آکسفورڈ کی قاموس میں بتائے گئے ''**بَاسِطٌ**'' کے معانی اور تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

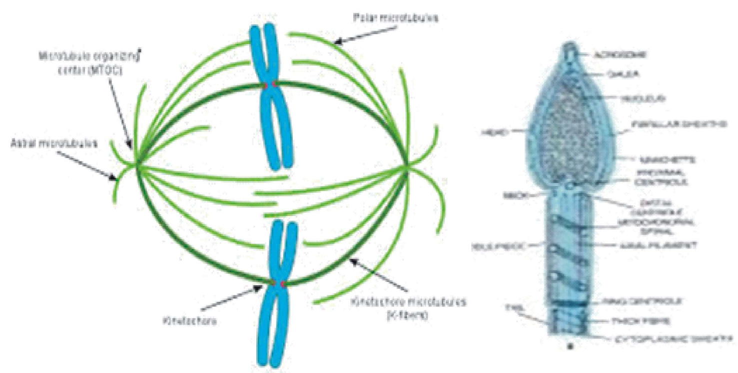
A framework on which fabric can be held taut for drying or other treatment during manufacture.

ایک ایسا ڈھانچہ جس پر کپڑا ٹانگ کے سکھایا جاتا ہے یا تحویل صناعی کے عمل میں استعمال ہونے والا ڈھانچہ۔(آکسفورڈ لغات)

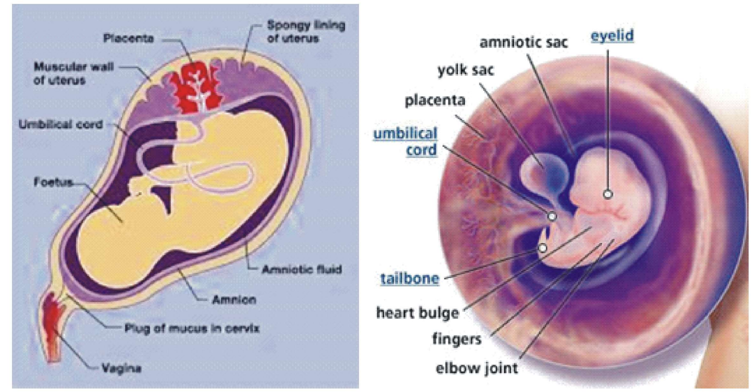
کھال سکھا کر چمڑہ بنانے والے کارخانے انگریزی کے اسی لفظ Tenter سے ماخوذ ہیں جنہیں ٹینریز (tenries) کہا جاتا ہے۔پاکستان کے تقریباً سبھی شہروں میں ٹینریاں ہوتی ہیں جن کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہو تو شاید آپ نے بھی چمڑے کی سڑاند یا بدبو محسوس کی ہوگی۔لہٰذا، **بَـاسِطٌ** کا حقیقی مطلب یہ نکلتا ہے کہ ''ایسا ڈھانچہ جس پر چڑھا ہوا چمڑہ بھی سوکھ گیا ہو'' یعنی ہڈیوں کا ڈھانچہ اور **ذِرَاعَیْـــهِ** اسے موت سے جگانے یا زندہ کرنے کے معانی میں ماضی کا فعل ہے جس کے ساتھ کتے پر رجعت کرنے والی واحد ضمیر ''اسے موت سے جگایا'' یا ''اسے موت سے زندہ کیا'' کا مطلب بیان کرتی ہے۔**اَلْـوَصِیْدِ** میں **صِیْدِ** شکار کرنے والا اور شکاری کے معانی دیتا ہے۔اصحاب کہف کے ساتھ ایک کتا بھی تھا جو ان کے لئے شکار بھی کرتا تھا اور دشمنوں سے ان کی حفاظت بھی کرتا تھا اس لئے اس کتے کو قرآن میں شکاری کتے کا نام دیا گیا ہے۔

قارئین کرام قرآن کی بالائی آیت ۱۸:۱۸ میں اللہ تعالی اپنی عظیم الشان کاریگری سے پردہ اٹھاتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ اصحابِ کہف کے شکاری کتے کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو نئی زندگی عطا کی گئی۔مگر ہمارے علما کہتے ہیں کہ ''اصحابِ کہف کا کتا چوکھٹ پر اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔''

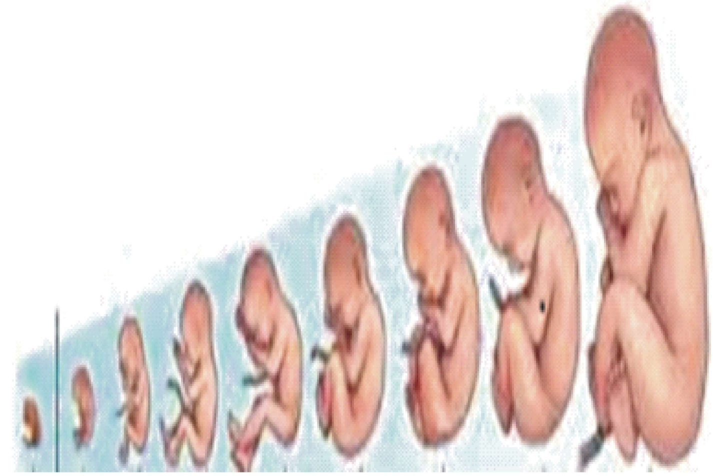
اگر ہم ان علماء کے تراجم، تفسیروں اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں سے قرآن پڑھیں گے تو ہمیں قرآن سمجھ نہیں آئے گا۔کیونکہ ان علما کے نظریئے کے مطابق سوئے ہوئے مردوں کے قبروں سے نکل کر رینگنے والی قیامت کے برپا ہونے سے پہلے انسان تو کیا کتا بھی زندہ نہیں ہوسکتا۔مگر افسوس کہ ہم ان غیر قرآنی نظریات سے نا صرف خود قرآن پڑھتے ہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کا درس دے کر گمراہ کرتے ہیں۔



اسپنڈل سیل(spindle cell)



جنین میں آنول سے داخل ہوتی ہوئی نال



برزخی رحم میں جنین کی پرورش۔

نوٹ: قرآن کی سبھی آیات جن میں ذرَا اور اس سے ماخوذ ہونے والے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کے معانی میں انسان کی پیدائش بغیر ماں باپ کے نہیں ہوتی بلکہ انسانی نسل کی کاشتکاری انسان کے تخم کو ماں کے رحم میں دوبارہ بونے (sowing) سے ہوتی ہے۔یعنی بچے کی پیدائش کا عمومی طریقہ ہی پیدائش نو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اگر چہ اس خلیئے میں بغیر جنسی عمل کے زرخیز ہونے کی صلاحیت موجود ہے مگر اس بات کا اطلاق صرف وہیں پر ہوگا جہاں قرآن کسی ایسی پیدائش کا خصوصی حوالہ دے گا جس میں بچہ اکیلی ماں یا اکیلے باپ سے پیدا کیا گیا ہو یا زندگی کے ابتدائی جرثومے انبت کا حوالہ دیا گیا ہو۔

رحم میں حمل کی ابتدا نطفہ اور تخمک خلیئے یعنی بیضے کے باہم ملنے سے ہوتی ہے۔تخمک خلیئے کو خلية المغزل (spindle cell) یعنی تکلا نما سیل بھی کہا جاتا ہے۔یہ وہی خلیہ ہے جو زرخیزی (fertilisation) کے بعد ماں کے رحم میں جنین کی شکل اختیار کرتا ہے۔قرآن میں اسے ذرَا کہا گیا ہے۔میڈیکل کی لغات میں اس کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتی ہے۔

Spindle Cell ذرَا

1. The basic structural unit of living organisms.

2. A small more or less enclosed space.

All living cells arise from other cells, either by division of one cell to make two, as in mitosis and meiosis, or by fusion of two cells to make one, as in the union of the sperm and ovum to make the zygote in sexual reproduction.(World Medical Dictionary)

ذرَا یعنی سپنڈل سیل (تخمک خلیہ)

۱-زندگی پانے والے اجسام یا حیاتیات کی ساخت کا بنیادی خلیہ

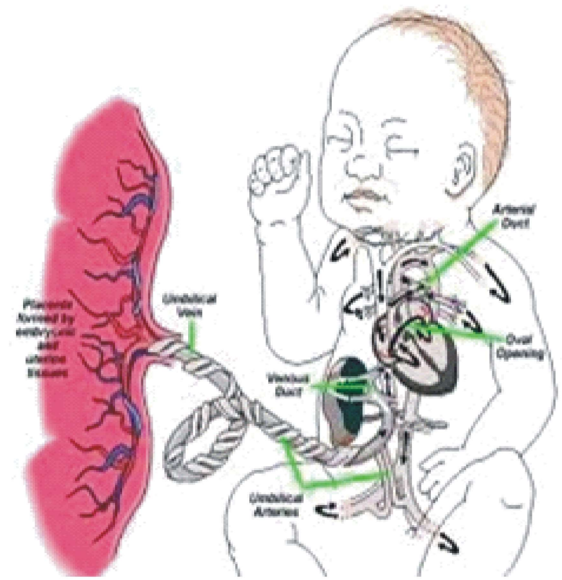
۲-ایک مہین کم وبیش فضائی محصور۔

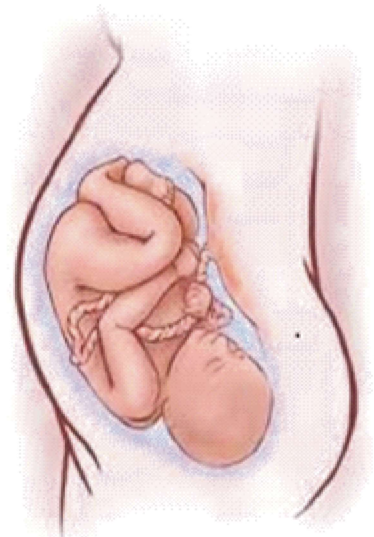
زندگی کے تمام خلیئے دوسرے خلیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ایک خلیئے کے دو حصوں میں تقسیم ہونے سے دو خلیئے بنتے ہیں مثلاً انقسام الفتیلی اور اِنقسام منصف یا دو خلیوں کے ادغام سے بھی ایک خلیہ بنتا ہے مثلاً نطفہ اور بیضۂ زن جنسی تناسل کے دوران تخم بناتے ہیں۔(ورلڈ میڈیکل ڈکشنری)

ذراعا کی تعریف مغزل (spindle) گھومتا ہوا پہیہ (spinning wheel) اور محور (axis) کے طور پر بھی کی جاتی ہے جسے آکسفورڈ کی لغت میں اسپنڈل (spindle) بھی کہا گیا ہے۔

خلية المغزل (spindle cell) جب زرخیزی (fertilisation) کے بعد ماں کے رحم میں جنین کی شکل اختیار کرتا ہے۔تو اس ورم دار لوتھڑے (tumour) کی پیمائش تقریباً ایک سینٹی میٹر ہوتی ہے۔یہ مقام جنین کی نمو کے آغاز کا مقام کہلاتا ہے۔قرآن اسے علق کے بعد تخلیق ہونے والی شکل مضعفة کہتا ہے مگر ہمارے نابلد علما قرآن کے تراجم میں علق کو جونک جیسا

معلق وجود کہتے ہیں اوراس کی اگلی حالت مضـعـفة کو مضحکہ خیز اندازمیں دانتوں سے چبایا ہوالوتھڑا کہتے ہیں جوان قرآنی الفاظ کے تراجم نہیں ہیں۔علـق کے صحیح معانی ملاپ اور کیمیکل ری ایکشن کے ہیں اور مـضـعـفة زرخیز بیضے کو کہاجاتا ہے۔اس مرحلے سے پہلے اعضاوجود میں نہیں آتے اور نال کی بناٹ بھی اسی مرحلے میں شروع ہوتی ہے کیونکہ اس مرحلے سے پہلے جنین رحم کی نالیوں میں آزادلڑھکتا پھرتا ہےاوراس آزادی کی وجہ سے ہی یہ نالیوں میں سے ہوتا ہوارحم میں گرکراس کی دیواروں سے چپکتا ہے جہاں اس کونال کی مدد سے باندھ دیا جاتا ہے جوآنول یعنی برزخی تہوں سے نکل کرجنین کے گرد لپٹتی ہےاورجنین کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پرورش کے لئے خوراک کابندوبست بھی کرتی ہے۔یہی وہ ستر سینٹی میٹرلمبی رسی یا زنجیر ہے جس کا حوالہ **سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ**"(۶۹:۳۲) میں دیا گیا ہے۔ایک سینٹی میٹر کی پیمائش کے بچے کے جسم پراسی زنجیرکو لپیٹا جاتا ہے۔جن کو ماں کے رحم میں بننے والی قبرمیں ان کے اعمال کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے یہ زنجیر یا رسی لمبی کر کے ان کی گردن کے گرد لپیٹ دی جاتی ہے تاکہ انہیں اذیت ملتی رہے۔جن کے اعمال بہتر ہوتے ہیں یہ رسی ان کی گردن کی بجائے جسم پر لپٹی ہوئی ہوتی ہے جس سے ان کو تکلیف نہیں ہوتی۔







70 سینٹی میٹرلمبی نال جوآنول سے نکل کر بچے کے ناف تک جاتی ہے۔

هَاوِيَةٌ کی تحقیق میں جو چار نکات سامنے آئے تھے ان میں دو نکات پہلے بیان کئے جا چکے ہیں اور یہاں تک تیسرے نکتے کا مطالعہ بھی مکمل ہو گیا۔ یعنی هَاوِيَةٌ اندھیری کان میں کسی چیز کی نقل و حمل کے لئے رسے یا زنجیروں والا نظام بھی ہے۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ اندھیری کان درحقیقت ماں کے رحم میں بننے والی ہر انسان کی اصل قبر ہے جس میں نقل و حمل کے لئے رسے یا زنجیروں والا نظام "ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ" (۶۹:۳۲) میں بتایا گیا ہے۔

هَاوِيَةٌ کی تحقیق کا چوتھا نکتہ ملاحظہ فرمائیے۔

۳- یہاں خاموشی نہیں بلکہ زندگی کی تمام سرگرمیاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔

هَاوِيَةٌ کے بنیادی لفظ "هوى" (Whim) کے معانی کا مطالعہ قرآنی آیات اور لغات کی رو سے کیا جا چکا ہے۔ جن میں "هوى" (Whim) کو خواہش، تمنا، چاہت، پیار، محبت، لگاؤ، پسند، لذت، کشش، جھکاؤ، جذبہ، تعریف اور لطف اندوزی کے مطلب میں لیا گیا ہے۔

ستائش، تعریف، ہدایت و نصیحت، تعظیم، احترام، تواضع، ادب، پرستار، حوصلہ افزائی، حامی، معاونت، طرف داری، واپسی، پیچھے کی طرف لوٹنا، قبول کرنا، دوبارہ رابطہ، رحم (womb) اور پیٹ (matrix) بھی اسی کے معانی میں آتے ہیں۔

هَاوِيَةٌ کے بنیادی لفظ هوى کا قرآنی آیات میں استعمال ملاحظہ فرمائیے۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۲:۸۷)

"جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لایا جسے تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے تو تم اکڑ بیٹھے اور بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل کیا۔" (۲:۸۷)

كُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۵:۷۰)

"جب کبھی کوئی رسول ان کے پاس وہ حکم لایا جو ان کے نفس نہیں چاہتے تھے تو ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کر ڈالا۔" (۵:۷۰)

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ. (۱۴:۳۷)

"پس تو لوگوں کے دلوں کو شوق و محبت کے ساتھ ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں پھلوں کا رزق عطا فرما، تا کہ وہ شکر بجالاتے رہیں۔" (۱۴:۳۷)

وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى. (۲۰:۸۱)

"اور جس پر میرا غضب واجب ہو گیا سو وہ واقعی ہلاک ہو گیا۔" (۲۰:۸۱)

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى. (۵۳:۱)

"ستارے کی قسم ہے جب وہ ڈوبنے لگے/ نیچے اترنے لگے/ غروب ہونے لگے/ غائب ہونے لگے۔" (۵۳:۱)

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى. (۵۳:۲۳)

"وہ محض وہم اور اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔" (۵۳:۲۳)

اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ۔ (۶:۷۱)

"شیطان نے زمین میں راہ بھلا دی/ راستہ بھلا دیا۔" (۶:۷۱)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ. (۲:۱۲۰)

"اگر تو ان کی خواہشات کا پیرو ہوا بعد اس کے کہ تجھے علم آ چکا تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہو گا اور نہ مددگار۔" (۲:۱۲۰)

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ. (۲:۱۴۵)

"اگر آپ نے اپنے پاس علم آ جانے کے بعد ان کی خواہشات کی پیروی کی تو بیشک آپ زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔" (۲:۱۴۵)

وَلَاتَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ. (۵:۴۸)

''اورآپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔'' (۵:۴۸)

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓی۔ (۴:۱۳۵)

''خواہشات کی پیروی نہ کریں۔'' (۴:۱۳۵)

وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۔ (۵۳:۳)

''اور نہ وہ اپنی خواہش سے کچھ کہتا ہے۔'' (۵۳:۳)

هَاوِيَةٌ دوزخ کا کیسا گڑھا ہے؟ جس میں خواہشات، ارمان، پیار محبت اور چاہت بھی موجود ہے؟ لوگ اس کی طرف مائل بھی رہتے ہیں، اسے پسند بھی کرتے ہیں اور اس کی ستائش وتعریف بھی کی جاتی ہے۔ لوگ اس کے پرستار بھی ہیں اور اس میں تعظیم، ادب، احترام اور تواضع ہونے کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی، معاونت اور ہدایت ونصیحت بھی ہوتی ہے اور لوگ اس میں ڈوبے بھی رہتے ہیں۔ یہ ہماری طرف داری بھی کرتی ہے، ہمیں قبول بھی کرتی ہے، ہم سے رابطے میں بھی رہتی ہے، پیچھے لوٹ کر ہماری واپسی بھی اسی میں ہوتی ہے اور ہم کسی ستارے کی طرح اپنا سفر طے کرتے ہوئے اس میں غروب بھی ہو جاتے ہیں۔ (۵۳:۱) اس کو رحم اور پیٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس میں ہلاکت بھی ہوتی ہے۔ یہ راقم الحروف کے الفاظ نہیں بلکہ قرآن کی ان آیات کے الفاظ ہیں جن کا مطالعہ ہم نے بالائی سطور میں کیا۔ کیا یہ سب باتیں اسی دنیا کی نہیں جس میں ہم رہتے ہیں؟۔

قارئین کرام اصل بات جو قرآن نے کہی گئی ہے وہ مکمل طور پر واضح ہوتی چلی جارہی ہے کہ موت کے بعد عالم برزخ اور ہماری قبر ماں کے پیٹ میں ہوگی اور دوبارہ پیدائش بھی اسی دنیا میں ہوگی جس میں ہمیں اپنی موجودہ زندگی کا سفر طے کر کے دوبارہ پہنچنا ہے تاکہ اگلی زندگی کا سفر دوبارہ شروع ہو اور پھر اسی دنیا میں وعظ ونصیحت کا سلسلہ بھی شروع ہو پھر ہلاکت کے بعد اس زندگی کے دور میں کیئے گئے اعمال کی جانچ پڑتال ہو اور وہاں سے اگلی زندگی کا دور پھر سے اسی طریق پر شروع کیا جائے۔

اس قسم کی هاوِيه کو آگ کا کھولتا ہوا کنواں کہنے والوں سے عقل کے ناخن لینے کی درخواست ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے کیا وہ باتیں آگ کے کسی دہکتے ہوئے گڑھے کے خواص ہیں؟ اگر یہ سب کچھ کسی زمین پر بنے ہوئے اندھے گڑھے (pit) میں نہیں ہوتا اور نہ ہی قبروں سے رینگ کر نکلنے والے مردوں کے تصوراتی واقعہ کے بعد قائم ہونے والی دوزخ میں یہ سب کچھ ہوگا تو پھر هَاوِيَةٌ کیا ہے؟ اگر پیار محبت چاہت پسند ناپسند اور خاطر تواضع جہنم میں ہوگی تو وہ جہنم کیسا؟ یہ تو زمین پر بسنے والی دنیا کے لوازمات ہیں جن کی ضرورت گوشت پوست کی بنی ہوئی جسمانی زندگی کو ہوتی ہے۔ ہم هاوِيه کے بیان کے شروع میں اس کے تفصیلی معانی دیکھ چکے ہیں کہ هَاوِيَةٌ میں ہدایت ونصیحت، بیداری، جوش وخروش سرگرمی، عمل، رواداری، صبر، غم، خوشی، غصہ، اشتعال، میل ملاپ اور جنسی اختلاط وغیرہ سب کچھ ہوں گے۔ علما کچھ بھی کہیں مگر عقل تسلیم نہیں کرتی کہ دوزخ میں یہ کام بھی ہوں گے۔ تفسیروں میں تو ہم نے پڑھا ہے کہ دنیا سے جانے کے بعد عمل ختم ہو جاتا ہے مگر هَاوِيَةٌ میں تو عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں وعظ ونصیحت بھی ہوتی ہے تاکہ آنے والی زندگی میں کام آنے والے اچھے اعمال کیئے جاسکیں۔ یقین نہیں ہوتا تو هَاوِيَةٌ کے معانی کسی اچھی لغت میں خود دیکھ لیجیے۔ علما کی بنائی ہوئی لغات اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں میں هَاوِيَةٌ کے معانی دیکھیں گے تو بہک جائیں گے۔ کسی عام دانشور کی لکھی ہوئی لغات استعمال کیجیئے یا پھر هَاوِيَةٌ کے بنیادی حروف ہ و ی سے بننے والے لفظ ''ھوی'' کے انگریزی معانی (Whim) کو انگریزی کے قاموس اور لغات میں دیکھیئے۔ آپ کو هَاوِيَةٌ کی حقیقت اور اس کے سب معانی صاف صاف دکھائی دیں گے۔ هَاوِيَةٌ کے معانی میں جائے پیدائش، آبائی زمین، آبائی گھر، اچھل کے نکلنا اور گود میں رکھنا کے معانی بھی ملیں گے۔ قرآن کی آیت (وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِیْ فَقَدْ هَوٰی) ''اور جس پر میرا غضب واجب ہوگیا سو وہ واقعی ہلاک ہوگیا۔'' (۲۰:۸۱) کے مطابق هَاوِيَةٌ میں ہلاکت بھی ہوتی ہے مگر ہمارے علما کا نظریہ ہے کہ دوزخ میں موت نہیں آئے گی۔ قرآن کی یہ آیت درست مانی جائے یا علماء کا غیر قرآنی نظریہ؟ لہٰذا، اپنے موجودہ نظریات کو ایک طرف رکھ کے هَاوِيَةٌ کے تمام معانی پر ایمانداری سے غور وخوض کریں گے تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ هَاوِيَةٌ ماں اور دنیا سے تعبیر ہے۔ جہاں پر انسان کی بار بار تربیت ہوتی ہے تاوقتیکہ

انسان اپنے آپ کو اتنا بلند نہ کر لے کہ اسے اس تربیت گاہ میں دوبارہ آنے کی ضرورت نہ پڑے۔ (لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی وَ وَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ)(۵۶:۴۴) اس مقام پر انسان کا دنیا سے مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور یہ ایسی موت ہوگی جس کے بعد پھر کبھی موت نہیں آئے گی اور نہ ہی انسان دنیا میں واپس آئیگا۔ جب تک یہ مقام نہیں آتا تب تک انسان موت وحیات کی گردشوں میں سے گزرتا چلا جائے گا اور انسان کو اس اعلیٰ مقام تک پہنچانے کی تربیت اسی ھَاوِیَةٌ میں ہوتی چلی جائے گی۔ لہٰذا ھَاوِیَةٌ ایک مکمل تربیت گاہ ہے جو دنیا میں ہی قائم ہوتی ہے اور رہتی دنیا تک ایسے ہی رہے گی۔

جہنم کے وجود سے قطعی انکار نہیں۔ جہنم اپنی دہکتی ہوئی دردناک آگ کے ساتھ پوری طرح موجود ہے مگر وہاں نہیں جہاں ہم سمجھتے ہیں۔ جہنم بھی اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے دیگر نظاموں کی طرح ایک جامع نظام ہے جو دنیا کے لوگوں کے لئے دنیا میں ہی بنایا گیا ہے اور جب تک دنیا باقی ہے یہ نظام بھی اپنا کام کرتا رہے گا۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ. (۱۱:۱۰۷)

''وہ اسی میں رہتے ہیں جب تک آسمان وزمین قائم ہیں مگر جتنا تمہارے رب نے چاہا بیشک تمہارا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے۔''(۱۱:۱۰۷)

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ. (۱۱:۱۰۶)

''یقیناً جو بد ہیں وہ آگ میں جلتے ہیں جس میں ان کی چیخ وپکار پڑی رہتی ہے۔''(۱۱:۱۰۶)

وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ۔(۱۱:۱۰۸)

''اور جو لوگ نیک بخت ہیں وہ جنت میں رہتے ہیں جب تک آسمان زمین قائم ہیں، سوائے اس کے کہ تیرا رب کچھ اور چاہے اس کی بخشش کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔''(۱۱:۱۰۸)

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بالائی آیات میں اللہ نے کوئی مستقبل کا صیغہ استعمال نہیں کیا بلکہ جاری عمل کی بات کی جا رہی ہے جو ماضی میں بھی ہوتا رہا۔ حال میں بھی اسی طرح ہوتا ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ گویا دوزخ کی طرح جنت بھی اسی دنیا میں قائم ہوتی ہے اور جب تک زمین وآسمان قائم رہیں گے نیک لوگوں پر اللہ کا انعام واکرام بھی جاری رہیگا اور اس جنتی زندگی میں داخل ہونے والے لوگ خوش وخرم رہیں گے۔ زمین وآسمان کے قائم رہنے کی معینہ مدت کے بعد جنت اور دوزخ کا وجود بھی باقی نہیں رہیگا۔ نئی دنیا کے معیار پر پورا نہ اترنے والے بدکار یہیں بھسم ہو جائیں گے اور زندگی صرف انہیں لوگوں کو نصیب ہوگی جو واقعی میں اس کے اہل ہوں گے۔ موت وحیات کے لامحدود ادوار سے گزار کر انسان کو بار بار اس دنیا میں واپس لانے کا مقصد دراصل انسان کو اس دنیا کے قابل بنانا ہے جو زمین وآسمان کی بساط لپیٹنے کے بعد معرضِ وجود میں آئے گی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ ارتقائی لحاظ سے اللہ کی سنت ہے جو کئی بار پہلے بھی دہرائی جا چکی ہے اور اسی طرح آئندہ بھی دہرائی جائے گی۔ بگ بینگ (big bang) سے پہلے زندگی کسی اور شکل میں تھی جس کی بساط لپیٹ کر زندگی کو الگ شکل دی گئی۔ ایک دنیا وہ بھی تھی جس میں جنات رہتے تھے۔ اس دنیا کا وجود اب باقی نہیں رہا۔ مگر ان میں سے بھی کچھ ارواح نے فلاح پا کر اگلی زندگی کے لئے ترقی کی۔ اسی طرح دنیا میں درندوں کا دور بھی آیا جس میں ڈائنوسار (Dinosaurs) قابل ذکر ہے مگر آج اس کا بھی نام ونشان نہیں ملتا۔ بہت سی انواع کے ادوار گزرنے کے بعد ان کی دنیا ختم ہوتی گئی اور پھر انسان کا دور آیا جس کے لئے ایک الگ دنیا بسائی گئی اور گزشتہ دنیاؤں کی طرح اس دنیا کا وقت بھی مقرر کیا گیا جس کے بعد انسان کو ازسرِ نو پیدا ہو کر خلق جدید کی صورت میں اس سے اگلی دنیا میں ترقی کرنا ہے۔

اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ. (۵۰:۱۵)

''کیا ہم تھک گئے تھے پہلی بار کی تخلیق سے جو ازسرِ نو تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں؟۔''(۵۰:۱۵)

لہٰذا جنت اور دوزخ کے بارے میں ہمارا موجودہ عقیدہ باطل اور غیر قرآنی ہے۔ جس کو قرآن سے سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے علما کے تراشیدہ باطل نظریات کو رد کر کے خالص قرآنی تعلیمات کا بول بالا کیا جائے اور اللہ کا ذکر عین قرآن کے مطابق قائم ہو۔ انشااللہ۔

جس طرح سائنس کے مسلمہ اصول پوری کائنات میں کارفرماں دکھائی دیتے ہیں اوران کا اطلاق بغیر خطا کے ہرجگہ ہوجاتا ہے بعینہٖ ماں کے رحم میں دریافت کی ہوئی قبراور برزخ پر نا صرف قرآن اورروایات بلکہ ان سب باتوں کا بھی مکمل اطلاق ہوتا ہے جوقبر کے بارے میں مشہور ہیں۔لہٰذا برزخ اور ماں کے رحم میں بننے والی انسانی قبر پرقرآن کے بیانات، روایات اوردیگر کہی سنی باتوں کا پورا اترنا اپنے آپ میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مرنے کے بعد ہر انسان کی قبر مادرِرحم میں ہی بنتی ہے۔یہی قرآن کے بیان فـامـه هـاویـه کی مکمل تشریح بھی ہے اور انسانی قبر کی سچائی بھی یہی ہے۔

ماں کے پیٹ میں دریافت کی ہوئی برزخ اورقبر کہاوت اورروایت کے آئینے میں:

(ا):قبرمیں مردہ زندہ ہوجاتا ہے؟

چونکہ زمین پر بنی ہوئی مٹی کی اندھیری، اندر سے کھوکھلی اورلمبوتری قبر کی مشابہت ماں کے رحم سے پوری طرح ملتی ہے۔لہٰذا، اگر ماں کا رحم مرنے کے بعد انسان کی قبرتسلیم کیا جائے تو اس میں جنین زرخیزی کے بعد زندہ ہوجاتا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔

''پھر دوبارہ زندہ کیا ہم نے تم کوتمہاری موت کے بعد تاکہ تم شکرگزار بنو۔''(۲:۵۶)

وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّارَیْبَ فِیْهَا وَ اَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ۔

''اور یقیناً اس گھڑی کے آنے میں کوئی شک نہیں جب اللہ دوبارہ زندگی دیتا ہے قبروں میں۔''(۲۲:۷ صحیح ترجمہ)

بالائی آیت کے تراجم میں گھڑی ہوئی خودساختہ ''قیامت'' کا اس آیت کے متن کے الفاظ سے کوئی تعلق نہیں اور یَبْـــعَـــثُ ہردور کے زمانہ حال کا فعل ہے۔اس آیت کے دیگر الفاظ کی صرف ونحو میں بھی نہ تو مستقبل کا کوئی صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور نا ہی اللہ نے قبر میں جانے والوں کودوبارہ زندہ کرنے کے عمل کو مستقبل میں پیش آنے والے کسی واقع سے مشروط کیا ہے۔یہ بات بھی ذہن نشین کرلیجئے کہ مصدر بُعَثُ موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کے معانی دیتا ہے۔بالفاظِ دیگر بُـعَـثُ اوراس کے ماخوذات کسی کوپہلی بار پیدا کرنے کے معانی نہیں دیتے ۔لہٰذا قرآن میں اللہ نے جہاں بھی بُعَثُ یا اس کے ماخوذات استعمال کئے ہیں ان کا صحیح اور مکمل ترجمہ ''موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا'' جب تک قرآن کے تراجم وتفسیر میں شامل نہیں کیا جائے گا قرآن کا اصل مفہوم واضح نہیں ہوگا۔گویا ہمارے زیرنظر آیت میں یقیناً قبر میں مردوں کوزندہ کرنے کی بات کی گئی ہے۔لہٰذا زمین پر بنی ہوئی مٹی کی قبر میں تو زندگی کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے البتہ اگر مادرِرحم کو ہی انسان کی اصل قبرتسلیم کیا جائے تو انسان اسی میں جاکر دوبارہ زندہ ہوسکتا ہے۔

اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ۔(۹:۱۰۰)

''توکیا نہیں جانتا جب دوبارہ زندہ کردیئے جاتے ہیں جوقبروں میں ہیں؟۔''(۹:۱۰۰)

(۲):قبرمیں فرشتے آتے ہیں؟

جی ہاں ماں کے رحم میں بنی ہوئی قبر میں فرشتے آتے ہیں۔فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کے اوزار (Tools) بھی کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ۔(۳:۶)

''وہی تو ہے جوتمہاری ماں کے رحموں میں تمہاری صورتیں، جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے۔''(۳:۶)

اس آیت میں براہِ راست ماں کے رحم میں کئے جانے والے عمل کا ذکر ہے۔اس کے علاوہ رحم میں بننے والی قبر میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تکمیل یعنی رحم میں رونما ہونے والی تبدیلیاں بشمول رحم کی قبر سے نکل کر دنیا میں واپس آنے کے عمل ایسے عظیم الشان منصوبے پر فرشتوں کی تعیناتی بعید از قیاس نہیں۔فرشتے اگر موت کے لئے مقرر ہیں تو پیدائش کے لئے بھی مقرر ہیں۔ اللہ کے فرشتے جبرائیل علیہ السلام کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا.(۱۹:۱۹)

''میں اللہ کا پیغام لے کرآیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ بیٹا عطا کروں۔''(۱۹:۱۹)

(۳): قبر میں مردے سنتے ہیں؟

اِنَّ اللّٰہَ یُسۡمِعُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ. (۳۵:۲۲)

''بیشک اللہ جسے سنا نا چا ہے وہ سن لیتا ہے لیکن تم انہیں نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں۔'' (۳۵:۲۲)

آ ج کی میڈیکل سائنس بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ ماں کے رحم میں بچہ خاص حالتوں میں سنتا ہے۔البتہ زمین میں بنی ہوئی مٹی کے گڑھے والی قبر میں مردوں کے سننے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔رحم مادر والی قبر میں پوچھ گچھ ہوئی، سوال جواب ہوئے اور اپنی غلطیاں جان کر پشیمانی ہوئی۔ کیا ان سب باتوں میں سننے کا عمل موجود نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے جو نظام مقرر کر رکھا ہے اس نظام میں اللہ تعالیٰ کے منصوبے یعنی من یشا کے مطابق ماں کے پیٹ کی قبر میں مدفون لوگ یقیناً سن سکتے ہیں۔مگر عام انسانوں کے لئے یہ بات ایسے ہی ہوگی کہ قبروں میں لوگ انہیں سن نہیں سکتے کیونکہ وہ ان کی باتوں کا جواب دینے کی براہ راست طاقت نہیں رکھتے سوائے مخصوص ردعمل سے دیئے جانے والے اشاروں کے جنہیں صرف ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں یا انہیں آلات سے ڈی کوڈ کیا جاتا ہے۔گویا رحم مادر میں بننے والی قبر میں لوگ سن سکتے ہیں۔

(۴): اچھے لوگوں کی قبر کی دیواریں کشادہ رہتی ہیں مگر بداعمال لوگوں کی قبریں تنگ ہو کر ان کی دیواریں آپس میں ٹکراتی ہیں؟

زمین پر بنی ہوئی مٹی کی قبر اور اس کی دیواریں بے جان ہونے کی وجہ سے بالکل بھی حرکت نہیں کرسکتیں چہ جائیکہ وقت کی شکست وریخت سے زمینی قبر منہدم ہی نہ ہو جائے۔البتہ ماں کے رحم میں بننے والی قبر کی دیواریں مکمل طور پر زندہ ہونے کی وجہ سے تنگ اور کشادہ بھی ہوتی رہتی ہیں اور ان میں سکڑنے کا عمل بھی میڈیکل سائنس سے ثابت ہو چکا ہے۔

(۵): قبر میں پوچھ گچھ یعنی سوالات، حساب کتاب اور عذاب ہوتا ہے؟

زمین پر مٹی کے گڑھے میں بنی ہوئی قبر میں تو صرف انسان کی روح کے اوپر سے اترا ہوا خول ہی باقی ہوتا ہے جو کچھ دنوں میں گل سڑ کے خاک ہو جاتا ہے۔حقائق بتاتے ہیں کہ سبھی لوگ قبر میں دفنائے بھی نہیں جاتے یعنی بعض لوگوں کو مرنے کے بعد جلا دیا جاتا ہے، بعض پانی میں بہہ جاتے ہیں، کچھ لوگ خوں خوار درندوں کا شکار ہو جاتے اور کچھ ہوائی حادثات میں لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔مگر قرآن کہتا ہے کہ قبر سب کی بنتی ہے۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقۡبَرَهٗ۔ (۸۰:۲۱)

''پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔'' (۸۰:۲۱)

اگر بالآخر سب کو قبر میں پہنچایا جاتا ہے تو وہ قبر کہاں پر بنتی ہے؟ کیونکہ زمین پر مٹی کی بنی ہوئی قبر تو سبھی مرنے والوں کی قبر بننے کے بیان پر پورا نہیں اترتی کیونکہ سب لوگ دفن نہیں کئے جاتے۔اور یہ ہی ہماری تحقیق کا اصل محرک بھی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اللہ کے حکم کے مطابق اگر سبھی مرنے والوں کی قبر بنتی ہے تو وہ کہاں اور کیسی ہوتی ہے؟ ہم مصدقہ ذرائع سے تحقیق کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ماں کا رحم ہی وہ جگہ ہے جہاں سب کی قبر بنتی ہے خواہ کوئی زمینی قبر میں دفن ہوتا ہے یا نہیں۔

اَلنَّارُ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ۔ (۴۰:۴۶)

''دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح و شام وہ پیش کئے جاتے ہیں، اور جب اس گھڑی کا دن آجاتا ہے تو حکم ہوتا ہے کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔'' (۴۰:۴۶)

مرنے والوں پر یہ عذاب ہماری تصوراتی قیامت یعنی قبروں سے نکل کر مردوں کے رینگنے سے پہلے بتایا گیا ہے۔ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ کے معانی موت کے دن کی مقررہ گھڑی ہے جس کے بعد یہ عذاب اور شدید کر دیا جائے گا۔ آل فرعون دراصل فرعون کی نسل میں سے آنے والوں یعنی اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کا استعارہ ہے۔ایسے نافرماں لوگ جیتے جی بھی اللہ کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں اور انہیں مرنے کے بعد بھی شدید عذاب دیا جاتا ہے جس کا اطلاق رحم مادر میں بننے والی قبر میں پوری طرح ہوتا ہے۔قیامت دراصل موت کا ہی دوسرا نام ہے جو موت کے ساتھ ہی قائم ہو جانے والے مختلف احتسابی عوامل سے تعبیر ہے۔چونکہ احتساب دوبارہ زندہ

کر کے کیا جاتا ہے اس لئے قیامت یعنی موت کے دن کو زندگی کی نئی شاہراہ پر قدم رکھنے کے لحاظ سے یوم المبعوث بھی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا دوبارہ پیدا ہو کر واپس دنیا میں آنے اور اس کے درمیانی وقفے میں ''صبح شام دیا جانے والا عذاب'' برزخ یا قبر کی زندگی میں یعنی ماں کے پیٹ میں ہی ہوتا ہے۔ وقتِ معینہ تک ماں کے رحم میں بننے والی قبر میں عذاب ہونے کے بعد وہیں سے دوبارہ پیدائش ہوتی ہے اور دنیا میں واپسی کے بعد اس عذاب کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر موت کے بعد قیامت تک مزے سے سوتے رہنے کا عقیدہ باطل اور غیر قرآنی نہیں تو کیا قیامت آنے سے پہلے ہی آلِ فرعون (بداعمال لوگوں) کو صبح شام سوتے میں عذاب دیا جا رہا ہے؟ قرآن مرنے کے بعد فوری احتساب کی بات کرتا ہے۔ اس لحاظ سے بداعمال لوگوں پر قبر کا عذاب ہونا یقینی امر ہے جو قرآن سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ حساب کتاب ہونے کے بعد ہی جرائم کی نوعیت کے مطابق سزا کا اطلاق ہوتا ہے اور حساب کتاب کے عمل کے دوران جب کسی کے گناہ سامنے لائے جاتے ہیں تبھی اعترافِ گناہ بھی ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔

فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ۔ (۴۰:۱۱)

''سو اعتراف کرتے ہیں ہم اپنے گناہوں کا تو کیا (اس عذاب سے) نکلنے کا ہے کوئی راستہ؟'' (۴۰:۱۱ ترجمہ شبیر احمد)۔ سو (اب) ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، پس کیا (عذاب سے بچ) نکلنے کی طرف کوئی راستہ ہے۔ (۴۰:۱۱ ترجمہ طاہر القادری) سرور اور جارج سیل نے اس آیت کا مندرجہ ذیل ترجمہ کیا ہے۔ سرور: We have confessed our sins, so is there any way out of this (hell)? جارج سیل۔ and we confess our sins: Is there therefore no way to get forth from this fire?) قرآن کی اس آیت (۴۰:۱۱) کا آخری حصہ بھی واضح کرتا ہے کہ موت کے بعد عذاب دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس آیت کے متن میں عذاب دیئے جانے کے الفاظ موجود نہیں لیکن اندازِ بیان اور کسی حالت سے باہر نکلنے کے راستے کی التجا کسی بڑی مصیبت میں گرفتاری پر خود سے دلیل ہے۔ یعنی اگر اندر حالات موافق ہوتے تو باہر نکلنے کے لئے انتہائی عاجزانہ اور گڑگڑا کے فریاد کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی۔ عذابِ قبر کو نہ ماننے والوں کو غور کرنا چاہیے کہ آیت ۴۰:۴۶ میں جس عذاب کی بات ہو رہی ہے وہ قیامت سے پہلے دیا جاتا ہے اس لحاظ سے موت اور قیامت سے پہلے کا درمیانی عرصہ جس میں یہ عذاب دیا جاتا ہے اس دوران انسان قبر میں نہیں تو اور کہاں ہوگا؟ وہ قبر بھی ایسی ہوگی جس میں انسان اپنی جسمانی حالت میں زندہ ہوگا ورنہ قرآن کی آیت ۴۰:۴۶ کے بیان کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔ رہی بات پوچھ گچھ یا سوالات کی تو پولیس والوں سے پوچھ لیجیے۔ وہ بہتر طور پر سمجھا دیں گے کہ کوئی مجرم اعترافِ گناہ کرنے میں کتنے اور کس کس قسم کے تفتیشی مراحل سے گزرتا ہے؟۔

وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا۔

''اور جب یہ ایک زنجیر میں باندھ کر اس تنگ جگہ میں ٹھونسے جاتے ہیں تو اپنی موت کو پکارتے ہیں۔'' (۲۵:۱۳)

لہٰذا، رحم مادر ہی وہ تنگ جگہ ہے جہاں سب لوگوں کو نال (ستر گز کی رسی) سے باند کر ٹھونسا جاتا ہے اور سب نیک و بد کی قبریں بھی وہیں بنتی ہیں۔ نیکو کاروں کے لئے حالات موافق ہوتے ہیں اور اعمال بد والے لوگ رحم مادر میں بننے والی قبر میں کسی اندھیرے کنویں میں الٹا لٹکنے کی مانند عملی طور پر ایک زنجیر (نال) کے ساتھ الٹے لٹکے ہوئے اللہ تبارک تعالیٰ سے خروج کا راستہ ملنے کی استدعا کرتے ہیں۔ سبھی لوگ جانتے ہیں کہ رحمِ مادر یعنی قبر کے اندھیرے گڑھے میں زیادہ تر بچوں کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوتی ہیں اور وہ جسم پر لپٹی ہوئی نال سے باندھ کر الٹے لٹکائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض بچوں کی صورتِ حال اس سے بھی بدتر ہوتی ہے جس میں ان کی نال انہیں کے گلے میں پھانسی کے پھندے کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ کچھ بچے ماں کے رحم میں سیدھے بھی ہوتے ہیں جو الٹے لٹکے ہوئے نہیں دکھائی دیتے اور نا ہی غیر معمولی لمبائی کا رسہ یا زنجیر نما نال ان کے جسم یا گردن پر لپٹ کر انہیں اذیت دیتے ہیں۔ ۴۰:۱۱ میں (خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ) کے الفاظ بہت معنی خیز ہیں۔ سائنس رحم کے سکڑنے کے عمل سے ہونے والے اخراج کو پیدائش (birth) کہتی ہے۔ اس لحاظ سے ان لوگوں کا اخراج ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کی صورت میں ہی ممکن ہے۔





لہٰذا، جب زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں موت دے کر قبر میں میں پہنچا دیتے ہیں۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ۔(۲۱:۸۰)

''پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا۔(۲۱:۸۰)

گویا یہ طے ہے کہ نیک و بد دونوں کا ٹھکانا اللہ کی مقرر کردہ قبر اور اس کے بعد اس سے باہر کی دنیا ہے۔ اگر زندگی میں اچھے اعمال کئے تھے تو قبر میں بھی راحت رہتی ہے اور اس قبر سے باہر نکلنے کا راستہ انسان کو ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں دنیا جہان کی آسائشیں میسر ہوتی ہیں یعنی نیکوکار اپنی ماں کے رحم میں بننے والی قبر میں بھی سکون سے رہتے ہیں اور جب وہاں سے پیدا ہو کر باہر نکلتے ہیں تو ان کی آنکھ جنت نظیر باغ و بہار میں کھلتی ہے۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی۔(۷۹:۴۱)

''تو بے شک جنت ہی ہے اس کا ٹھکانا۔''(۷۹:۴۱)

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۔(۹۵:۶)

''مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے انکے لیے بے انتہا اجر ہے۔''(۹۵:۶)

ان کے برعکس بدکار لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوتا ہے۔ وہ قبر میں بھی صعوبتیں اٹھاتے ہیں اور وہاں سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں جہاں ذلت، پستی، رسوائی، تنگدستی، فاقہ کشی، ذہنی تناؤ، کشیدگی، دکھ، درد اور پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ. (۴۴:۵۰)

''بے شک یہی ہے جس کی نسبت تم شک کیا کرتے تھے۔''(۴۴:۵۰)

فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِیَ الْمَاْوٰی. (۷۹:۳۹)

''تو بے شک جہنم ہی ہے اس کا ٹھکانا۔''(۷۹:۳۹)

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰی سَوَآءِ الْجَحِيْمِ۔(۴۴:۴۷)

''اسے پکڑ کر جہنم کی طرف لے جاؤ۔''(۴۴:۴۷)

اسی سلسلے میں ہم اس آیت کا مطالعہ بھی کر چکے ہیں:

وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا۔(۲۵:۱۳)

''اور جب وہ اس کے کسی تنگ مکان میں ایک زنجیر میں جکڑ کر ڈال دیے جاتے ہیں تو وہاں موت کو پکارتے ہیں۔''(۲۵:۱۳)

لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔(۲۳:۱۰۰)

شاید اب میں کچھ بھلائی کماؤں اس میں جو چھوڑ آیا ہوں، ہشت یہ تو ایک بات ہے جو وہ اپنے منہ سے بڑبڑاتا ہے اور ان کے آگے ایک آڑ حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک (۲۳:۱۰۰)۔

سورۃ المومنون کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس آیت کے سیاق وسباق اس بات کی قطعی دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ بیان عین موت کے وقت یا موت کے فوراً بعد برزخ میں لیا گیا ہے کیونکہ یوم المبعوث کے آنے تک ان کے پیچھے برزخ کی آڑ حائل رہنے کا ذکر بھی اسی آیت میں ہے جس کے مطابق یہ واقعہ روایتی قیامت سے پہلے اور موت کے بعد کا ہے۔ لفظی اعتبار سے اس حالت کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اگر اس حالت کو برزخ کے قرآنی معانی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ موت نہیں بلکہ ایک ایسی زندگی ہے جو موت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے جیسی ساتھ ساتھ چلنے والے دو دریاں کی مثال ہے۔ اس حالت میں جب کسی کو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ اب اسکی جان بچنے والی نہیں تو اسے اپنا سب کیا دھرا یاد آ جاتا ہے۔ جان حلق میں آنے کے بعد اسے اپنے اعمالِ بد پر پچھتاوا بھی ہوتا ہے کہ کیونکہ آج یہ خالی ہاتھ ہے اور کچھ بھی اس کے کام نہیں آیا۔ یہی وہ حالت ہے جب مرنے والے لوگوں کے ہونٹوں پر معمولی سی جنبش دیکھی جاتی ہے مگر جو وہ بڑبڑاتے ہیں اس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں انسان اپنے مالک کے حضور اس مصیبت سے نکلنے کی درخواست ضرور کرتا ہے۔ لیکن دوبارہ دنیا میں واپس جا کر جو کچھ وہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے بہتر جانتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا گیا 'ہرگز نہیں ! یہ تو بس ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے 'یعنی دنیا میں واپس جا کر یہ شخص سب عہد و پیمان بھول جائے گا۔ اس کے بعد اس پر اللہ کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ اپنے اعمال کے مطابق اچھی یا بری کوکھ میں جاتا ہے جو اصل میں مقام برزخ ہے۔ اس کا ذکر اس آیت کے آخری حصے میں (وَرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ) کے الفا

ظ میں کیا گیا ہے۔یعنی جب تک وہ دوبارہ پیدا ہو کر باہر نہیں آتا اس کا ٹھکانا یہی ہے۔**اور برزخ کی یہ کال کوٹھڑی ہی اصل میں قبر ہے جو ماں کے رحم میں بنتی ہے۔**اس بات سے آپ اچھی طرح واقف ہیں کہ مرنے کے بعد ہر ایک کو قبر نہیں ملتی۔کوئی ڈوب کے مرتا ہے، کسی کو جلایا جاتا ہے اور کسی کو جنگلی جانور پھاڑ کے کھا جاتے ہیں۔مگر قرآن ہر ایک کے لئے قبر کی بات کرتا ہے۔قرآن کا بیان غلط اس لئے نہیں ہوسکتا کہ یہ خالقِ کائنات کے اپنے اٹل الفاظ ہیں۔اگر عملی طور پر قرآن کے بیان میں کوئی اختلاف (variation) دکھائی دیتا ہے تو قرآن غلط نہیں بلکہ ہم خود غلط ہیں جو قرآن میں کہی گئی بات کو کیا سے کیا بنا لیتے ہیں۔

لہٰذا، موت کے بعد دوبارہ پیدائش تک مندرجہ بالا آیت ۲۳:۱۰۰ کے مطابق انسان معینہ مدّت تک برزخی قبر میں رہتا ہے۔اور برزخ ماں کے پیٹ میں ہے جو ہم قرآن کی روشنی میں کی گئی تحقیق سے ثابت کر چکے ہیں۔جو حضرات ماں کے پیٹ میں بننے والی برزخ اور اس میں بنائی جانے والی انسانی قبر کو اتنے ٹھوس ثبوتوں کے بعد بھی تسلیم نہیں کرتے تو انہیں چاہیئے کہ قرآن میں کی گئی برزخ کی تعریف کو بعینہٖ کسی اور جگہ فِٹ کر کے مصدقہ ثبوت فراہم کر دیں۔ہم بھی ان کی دریافت کی قدر کرتے ہوئے دل و جان سے ان کی تحقیق کو تسلیم کر لیں گے۔لیکن اگر اس دنیا میں انہیں ایسا کوئی مقام نہیں ملتا جس کی تعریف قرآن میں بیان کی گئی برزخ سے مطابقت رکھتی ہو تو انہیں قرآن پر ایمان لے آنا چاہیئے۔چونکہ قرآن صرف اس دنیا کے لئے آیا ہے اور اس کے بیان کا اطلاق بھی اسی دنیا پر ہوتا ہے جسے انسان جانتا ہے۔لہٰذا، اس جانی پہچانی دنیا سے باہر کسی ماورائی مقام پر ''ہوسکتا ہے یا ممکن ہے'' کی گردان کے ساتھ فرض کی ہوئی برزخ قابلِ تسلیم نہیں ہوگی کیونکہ آج کے دور میں علم اتنی ترقی کر چکا ہے کہ کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے آپ کو ٹھوس ثبوت درکار ہیں۔خیالی کہانی (fiction) اور حقیقت (reality) میں یہی سب سے بڑا فرق ہے۔

لہٰذا پوری دنیا کو کھلا چیلنج ہے کہ ماں کے رحم میں بننے والی برزخ اور اس برزخ میں بننے والی قبر کی تحقیق کو ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ غلط ثابت کر کے دکھا دے۔

چونکہ قرآن یہ واضح کرتا ہے کہ انبیا علیہ السلام بھی اسی دنیا کے رہنے والے انسانوں میں سے تھے۔لہٰذا، اللہ تبارک تعالیٰ نے دنیا میں رہنے والے انسانوں کے لئے جو نظام بنایا ہے انبیا علیہ السلام کی ذاتِ مبارک پر بھی اس کا مکمل اطلاق ہوتا ہے۔سورہ الصافات میں ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔ ''**وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ**'' یعنی ''ہم نے ٹھہرایا اسے اگلی بار آنے والے خاص لوگوں میں۔'' (۳۷:۱۲۹) جن انبیا علیہ السلام کے ذکر مبارک کے ساتھ قرآن کے یہ الفاظ آئے ہیں وہ انبیا علیہ السلام بحیثیت نبی کے ہی کسی خاص مقصد کے تحت پیدائشِ نو کے ذریعے استثنائی طور پر دنیا میں دوبارہ تشریف لائے۔مگر جن انبیا علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ ''**وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ**'' کے الفاظ نہیں آئے ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے شعور کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے نبوت کے منصبِ اعلیٰ پر فائز ہونے تک دنیا میں بار بار ضرور تشریف لاتے رہے۔مگر نبوت ملنے کے بعد انہیں دنیا میں دوبارہ بھیجنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور وہ اس زمرے (Category) میں شمار کئے جانے لگے جس کے بعد دوبارہ موت نہیں آتی۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى. (۵۶:۴۴)

''پہلی دفعہ کے مرنے کے سوا موت کا مزہ نہیں چکھتے۔'' (۵۶:۴۴ ترجمہ فتح محمد)

بالائی آیت میں اس نظام کے دو اہم پہلو غور طلب ہیں جن میں سے ایک تو یہ کہ پہلی موت یعنی ایک موت کے بعد مزید موتوں کا سلسلہ بھی موجود ہے ورنہ اس آیت میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ پہلی موت کے بعد ان لوگوں کو کوئی موت نہیں آئے گی۔دوسرا غور طلب پہلو یہ جاننا ہے کہ یہ بات کن لوگوں کے بارے میں کہی جا رہی ہے جنہیں صرف ایک ہی موت دی جاتی ہے یعنی وہ موت جس کے بعد دنیا میں ان کی واپسی ممکن نہیں؟

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۵۶:۸۸)۔

درحقیقت وہ مرنے والا مقربین میں سے ہو۔ (۵۶:۸۸)

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا. (۴:۶۹)

''جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے جو انبیا اور صدیقین اور شہدا اور صالحین ہیں۔اور یہ رفیق کیسے اچھے ہیں۔'' (۴:۶۹)

اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ. (۳۷:۵۸)

''سواب ہم نہیں مرنے والے۔''(۳۷:۵۸)

اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ.

''سوائے پہلی موت کے اور ہمیں عذاب بھی نہیں دیا جانے والا۔(۳۷:۵۹)

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔(۳۷:۶۰)

''بے شک یہی بڑی کامیابی ہے۔''(۳۷:۶۰)

بالائی آیات کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے انبیا علیہ السلام کا شمار اللہ کے ان مقربین میں ہوتا ہے جن کو اس مقام پر پہنچنے کے بعد دوبارہ موت نہیں آتی۔

اسی طرح صدیقین، شہدا، صالحین اور ان کی طرح عمل کرنے والے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ۔(۳۷:۶۱)

''اسی طرح عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔''(۳۷:۶۱)

یعنی مقربین کی صفوں میں پہنچانے والے مثالی کام کر کے جو لوگ انتہائی راست باز بن جاتے ہیں انہیں بھی ان کی زندگی کے اس دور کی موت کے بعد دوبارہ موت نہیں آتی جس زندگی کے دور میں وہ شعوری ترقی کرتے ہوئے راستبازی کے اس اعلی مقام تک پہنچ جاتے ہیں جو فلاح پانے والے صالحین کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔لہٰذا بالائی آیات میں ایک عمومی (general) فارمولہ بشمول انبیا علیہ السلام سبھی لوگوں کے لئے بنا دیا گیا۔یعنی جو کوئی بھی اپنی زندگی کے کسی بھی دور میں شعوری ترقی کرتا ہوا فلاح کے اعلی مقام تک پہنچ جائے گا اس کے بعد اس کی واپسی اس دنیا میں نہیں ہوگی اور یہ اس زندگی کی پہلی اور آخری موت کہلائیگی۔بے شک یہی فارمولہ ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زائد انبیا علیہ السلام پر بھی لاگو ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی اسی دنیا اور اسی نظام کے اندر رہنے والے انسان تھے۔مگر (وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ) ''یعنی'' ہم نے ٹھہرایا اسے اگلی بار آنے والے خاص لوگوں میں۔''(۳۷:۱۲۹) کے استثنائی حکم (directive) کے ذریعے تمام انبیا علیہ السلام میں سے صرف پانچ انبیا کو دوبارہ نبی بنا کر دنیا میں بھیجا گیا۔استثنائی چھوٹ (exceptional leave) معمول کے قانون اور قاعدے سے ہٹ کر مخصوص حالات میں دی جاتی ہے اور استثنائی چھوٹ کا حکم جاری ہونے کے بعد اس پر معمول کے قواعد کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔قانون دان حضرات استثنائی چھوٹ (exceptional leave) کو بخوبی سمجھتے ہیں کیونکہ قرآن کا یہ بیان خالصتا قانون کی زبان میں دیا گیا ہے۔قارئینِ کرام غور فرمایئے! اس آیت کا بیان بھی چونکہ نقل مکانی، منتقلی اور انتقال یعنی موت کے بعد آنے والی زندگی کے متعلق ہے جو کسی حد تک دنیا میں مائی گریشن یا امیگریشن (immigration-migration) کے قوانین سے مشابہت رکھتا ہے۔دنیا کے سبھی ممالک میں رہائش اختیار کرنے کا قانون قریباً ایک جیسا ہے۔جو کوئی اس قانون کے زمرے میں آتا ہے اسے وہاں کی رہائش اور اس کے بعد باقاعدہ شہریت بھی مل جاتی ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو امیگریشن کے قانون کے مطابق ان ممالک میں حقِ شہریت یا رہائش کا حق نہیں رکھتے۔اس صورت میں یا تو وہ لوگ ان ممالک میں داخل (enter) ہی نہیں ہوسکتے اور اگر کسی طریقے سے یہ لوگ داخل ہو بھی جائیں تو وہاں رہ نہیں سکتے۔البتہ ان میں سے کچھ مخصوص افراد کو اگر مخصوص حالات میں کسی ملک میں داخل کرنا اور وہاں رکھنا مقصود ہو تو قانونی دائرہ عمل سے باہر (outside the rule) انہیں اس ملک میں داخلے کا حق اور وہاں پر رہنے کی استثنائی اجازت دے دی جاتی ہے جسے بین الاقوامی امیگریشن کے قانون کی زبان میں ''داخلے اور رہائش کی استثنائی چھوٹ'' (exceptional leave to enter) اور exceptional leave to remain کہا جاتا ہے۔یعنی قانون نہیں بدلا جاتا مگر قانون کے اطلاق میں خاص وجوہات کی بنا پر چھوٹ دے دی جاتی ہے۔

لہٰذا (وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ) میں 'تَرَكْ'' کے جو معانی ''چھوڑنے'' یا LEAVE کے مطلب میں لئے گئے ہیں وہ دراصل مذکورہ مقربین کو پہلی موت کے بعد دنیا میں واپس نہ بھیجنے کے مقررہ قانون سے استثنائی چھوٹ (exceptional leave) ہے جو مخصوص حالات میں صرف پانچ انبیا علیہ السلام کو دی گئی تھی۔

آنے والے وقتوں میں قرآن پر مزید تحقیق ہوگی تو یقیناً کئی اور حقائق نکل کر سامنے آئیں گے جنہیں ہم باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے ابھی تک تلاش نہیں کر سکے۔مگر ہماری تحقیق سے یہ بات

ضرور ثابت ہوتی ہے کہ (وَتَرَکْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ) کے الفاظ نبی سے کم رتبے والے لوگوں کے لئے نہیں آئے۔ لہٰذا جو انبیا علیہ السلام اپنے دورِ نبوت کے بعد دوبارہ پیدا نہیں ہوئے ان کو نبوت ملنے سے پہلے کی زندگیوں کے لئے بھی یہ الفاظ نہیں آ سکتے کیونکہ وہ بھی بحیثیت عام انسان حیات و ممات کے بے شمار ادوار سے گزر گزر کر ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے نبوت کے اعلیٰ وارفع مقام تک پہنچے تھے۔ کائنات کی کوئی بھی شے ایسی نہیں جو ارتقائی مراحل سے گزرے بغیر معرضِ وجود میں آئی ہو۔ یہ قوانینِ فطرت بھی ہیں اور مشیت الٰہی بھی یہی ہے۔ زمین و آسمان کی پیدائش کے مراحل اور حیات کے خلیۂ کو مرحلہ وار ترقی دے کر احسن تقویم کے ساتھ مکمل انسان کی شکل و صورت دینا ارتقا نہیں تو اور کیا ہے؟ گویا ہر شے کو اپنے مقررہ مقام تک پہنچنے کے لئے قدرت کے پروگرام کے مطابق ارتقائی مراحل سے ضرور گزرنا پڑتا ہے جس کا ایک ایک مرحلہ وقت کے معینہ ٹھہراؤ پر محیط ہوتا ہے جو دراصل زندگی کے ادوار ہی کہلاتے ہیں۔

قرآن کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ۔

''بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے۔(۷:۵۴)

اس آیت میں ''سِتَّةِ اَیَّامٍ'' زمین و آسمان کی تخلیق اور ارتقائی مراحل طے کر کے اپنے مقررہ مقام یا ظاہری شکل میں پہنچنے کے معینہ عرصے یعنی معینہ وقت (Time) کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ یہاں یہ بات ہمارے زیرِ بحث نہیں ہے کہ آیا قرآن میں بتائے گئے دن کی پیمائش دنیا کے دن سے مختلف ہے یا نہیں مگر اس آیت سے ہمیں صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ ارتقا کے مراحل میں ترقی کرنے کے لئے ہر شے کو ایک عرصہ (time period) درکار ہے یعنی کوئی شے اپنے مقام پر آناً فاناً میں صرف چھو منتر سے نہیں پہنچتی بلکہ ہر شے کو نقطۂ آغاز سے چل کر اپنی منزل تک پہنچنے میں وقت کے مختلف ادوار لگتے ہیں۔ سائنس بھی اس قانون کی توثیق فزکس کی اس تھیوری سے کرتی ہے جس میں کسی شے کو منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے وقت اور رفتار چاہیے۔ s=vt

اگر منزلِ مقصود کے فاصلے کو s فرض کریں، v کو رفتار اور t کو ٹائم یعنی تمام مراحل میں سے گزرنے کا فاصلہ طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کا عرصہ تو سائنس مزید دو باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔

Speed is directly proportional to distance when time is constant: v s (t constant)

Speed is inversely proportional to time when distance is constant: v t (s constant)

جب رفتار فاصلے پر براہِ راست متناسب ہو تو منزل تک پہنچنے کے لئے وقت کا تسلسل مستقل رہتا ہے: وی a ایس (وقت مسلسل)

جب رفتار وقت سے معکوس ہو جاتی ہے تو منزلِ مقصود تک پہنچنے کے فاصلے مسلسل لمبے ہوتے چلے جاتے ہیں: وی a1/T (فاصلہ مسلسل)

گویا یہ فاصلے ہی حیات و ممات کے مختلف ادوار ہیں جن میں سے گزر کر منزلِ مقصود یعنی قربِ الٰہی والی حالت میں پہنچنے کے لئے وقت کا مستقل تسلسل درکار ہے۔ جو لوگ سیدھے راستے یعنی صراطِ مستقیم پر گامزن رہتے ہیں انہیں منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے حیات و ممات کے کم ادوار سے گزرنا پڑتا ہے جن میں ان کا شعور تیزی سے نشوونما پاتا ہے۔ جو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین سے الٹے چلتے ہیں ان کی رفتار بھی معکوس یعنی الٹی ہو جاتی ہے اور قوانینِ فطرت کے خلاف چلنے کی وجہ سے ان کی جہنمی زندگیوں کے ادوار بھی لمبے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بار بار جئیں گے اور بار بار مریں گے جب تک کہ وہ اپنا راستہ بدل کر سیدھے رستے یعنی صراطِ مستقیم پر نہیں آ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس سے پہلی کتابیں باشعور انبیا علیہ السلام پر نازل فرما کے انسان کو دین کا سیدھا راستہ دکھایا تا کہ اس پر چل کر انسان تیز رفتاری اور کم سے کم وقت میں اپنے شعور کو ترقی دے کر اپنی منزلِ مقصود پر جا پہنچے۔ مگر افسوس کہ اللہ کے عطا کردہ دین کو بھول کر ہم روایات کے معکوس راستوں پر چل پڑے جس کی وجہ سے نہ صرف ہم اپنی منزل سے دور ہوتے جا رہے ہیں بلکہ بار بار موت و حیات کی گردشوں میں گھِر کے مکافاتِ عمل کے تحت طویل جہنمی زندگی بھی گزارنے پر مجبور ہیں۔

اگر ہم نبوت ملنے سے پہلے انبیا علیہ السلام کے شعور کی ترقی ہونے کو بعینہٖ ارتقائی عوامل کے ذریعے نہیں مانتے تو دوسری صورت صرف یہی بچتی ہے کہ ہم یہ یقین کر لیں کہ اللہ نے نبی دنیا کے

لوگوں میں سے نہیں چنے بلکہ پہلے سے تربیت شدہ اور بنے بنائے نبی آسمانوں سے اتارے گئے ہیں۔ اگر اس بات کو سچ مان لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو اللہ نے عالم فاضل کیوں نہیں اتارا؟

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا.

''بے شک انسان پر زمانے کا ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذِکر چیز ہی نہ تھا۔'' (۷۶:۱)

نبی اگر انسان تھے تو بالائی آیت کا اطلاق نبیوں پر بھی ہوتا ہے۔ اس آیت کی تفسیروں سے متزلزل ہونے کی ضرورت نہیں جن میں قبل از وجود سے بعد از وجود کی ایک ہی رٹی رٹائی گھسی پٹی کہانی دہرائی جاتی ہے۔ یہاں وجود اور لا وجود کی بات نہیں بلکہ بحیثیت انسان وقت کے لحاظ سے اس کی ارتقائی ترقی کی بات کی ہو رہی ہے۔ اس آیت میں لفظ انسان بذاتِ خود انسان کے وجود پر دلیل ہے یعنی اس وقت انسان کا وجود تھا تو اسے انسان کہا گیا ورنہ انسان سازی میں استعمال ہونے والے کسی بے جان مادے (material) تراب، سلالہ اور ذرا وغیرہ میں سے کسی چیز کا نام لے دیا جاتا۔ کسی کو یہ کہنا کہ ''ایک وقت وہ بھی تھا جب تم معمولی سے کلرک تھے'' دوسرے الفاظ میں وقت کے لحاظ سے اس شخص کی ہونے والی ترقی کو ماننا ہے۔ یعنی جب اس شخص کو یہ بات یاد دلائی گئی اس وقت وہ شخص کلرک نہیں بلکہ کلرک کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے یقیناً کسی اعلیٰ مقام تک جا پہنچا ہوگا۔ اب اسی مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے بالائی آیت پر غور فرمائیں تو بات واضح ہو جائے گی کہ وہ انسانی شعور جو کبھی قابلِ ذکر نہیں تھا وقت کے لحاظ سے ترقی کرتا ہوا آج کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ یعنی اس آیت میں اس قانون کی وضاحت کی گئی ہے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ انسانی شعور ترقی کرتے کرتے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام کی طرف بڑھتا ہے۔

آدم کو علم دینے کی ابتدا صرف چیزوں کے نام سکھانے سے کی گئی اس کے بعد جوں جوں انسانی شعور ترقی کرتا گیا انسان مزید علم حاصل کرتا گیا۔ انسان نے بار بار دنیا میں آ کے اپنا علم اس سطح سے آگے بڑھایا جہاں اس نے گزشتہ زندگی میں چھوڑا تھا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو علم صرف چیزوں کے نام سیکھنے تک ہی محدود رہتا اور اللہ تبارک تعالیٰ دنیا میں آنے والے ہر نئے انسان کو چیزوں کے نام ہی سکھاتے رہتے۔ انبیا علیہ السلام تو نہایت برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کی مثل نہ کوئی ہوا نہ ہی ہوگا لیکن اگر ہم عام لوگوں کی مثالوں پر بھی غور کریں تو زندگی کے مختلف ادوار سے گزر کر ہونے والی شعوری ترقی کو ہر ایک انسان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نیوٹن میں ایسی کیا خاص بات تھی جو اس نے درخت سے سیب زمین پر گرنے کے بعد کششِ ثقل کا فارمولہ بنا لیا؟ کیا نیوٹن سے پہلے کسی انسان پر درخت سے سیب نہیں گرے تھے؟ ارشمیدس نے نہاتے ہوئے حجم دریافت کر لیا۔ کیا اس سے پہلے کوئی نہایا نہیں تھا؟ ایڈیسن، گراہم بیل اور آئن سٹائن سبھی عام انسان تھے۔ ان لوگوں میں بھی وہی صلاحیت تھی جو باقی کے دیگر انسانوں میں ہے مگر فرق صرف اتنا تھا کہ بار بار حیات و ممات کے ادوار سے گزر کر مزکورہ شخصیات کا شعور جس سمت میں ترقی کرتا رہا اسی میدان میں ان لوگوں نے وہ کچھ کر دکھایا جو ان کے ہم عصر نہیں کر سکے۔ یہ سب کچھ ہونا زندگی کے صرف ایک دور میں ممکن نہیں۔ لہٰذا پچھلی زندگی سے چلتا ہوا علم، تجربہ اور شعور ہی کسی شخص میں خاص صلاحیت اور کلا (talent) بن کر ابھرتا ہے جو اسے باقی کے لوگوں سے ممتاز کرتا چلا جاتا ہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ کے الفاظ صرف حضرت نوح علیہ السلام (۳۷:۷۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام (۳۷:۱۰۸)، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام (۳۷:۱۱۹) اور حضرت الیاس علیہ السلام (۳۷:۱۲۹) کے ساتھ استثنائی (Exceptional) انداز میں آئے ہیں۔ اتنے بہت سے انبیا علیہ السلام میں سے صرف پانچ کے ساتھ ان الفاظ کا آنا یقیناً غور کرنے والی بات ہے۔ قرآن کے ان الفاظ سے صرف پانچ انبیا علیہ السلام کے ''ذکر و ثنا کو دنیا میں باقی رکھنے کا تصور'' دینے والے مترجمین اور مفسرین نے نہ صرف قرآن کے ساتھ بے انصافی کی ہے بلکہ دیگر جلیل القدر انبیا علیہ السلام کے درمیان فرق بھی رکھا ہے کیونکہ اگر قرآن کی اس آیت میں انبیا علیہ السلام کے ذکر و ثنا کی بات ہوتی جیسا کہ تراجم اور تفسیروں میں بیان کیا جاتا ہے تو فرداً فرداً نہ سہی ایک ساتھ ہی سب انبیا علیہ السلام کے ذکر و ثنا کو باقی رکھنے کی بات کر دی جاتی جیسے کچھ انبیا علیہ السلام کو فرداً فرداً سلام بھیج کر سورہ الصافات (۳۷) کے آخر میں ''**وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ**'' کہہ کر تمام رسولوں پر اکٹھا سلام بھیج دیا گیا یعنی جن رسولوں کا نام گزشتہ آیات میں نہیں لیا گیا اس آیت میں ان کو بھی سلام بھیج دیا گیا۔ اسی طرح ''**وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي**

الْاٰخِــــرِیْــنَ ''(۳۷:۱۲۹) جیسے الفاظ بھی اس سورہ کے آخر میں سب انبیا علیہ السلام کے لئے آ جاتے۔یعنی سب انبیا علیہ السلام کا ذکر وثنا باقی رکھا گیا۔مگر ایسا اس لئے نہیں ہوا کیونکہ اس آیت کا مطلب ہی یہ نہیں جو ہمارے علمانے تراجم اور تفسیروں میں کر رکھا ہے۔

اگر اللہ تبارک تعالیٰ کو حضرت الیاس علیہ السلام کی ثنا یا ان کا ذکر خیر آنے والی نسلوں (in the later generations) میں باقی رکھنے کا حوالہ دینا مقصود ہوتا تو اسی سورہ الصافات کی آیت ۳۷:۷۷ کی طرح ''باقی'' رکھنے کا باقاعدہ لفظ استعمال کیا جاتا جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہی باقی رکھی۔قرآن کی مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ فرمایئے جو کسی چیز کو ''باقی رکھنے'' کے بیان کی قطعی دلیل ہے۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبَاقِیْنَ۔(۳۷:۷۷)

اور ہم نے اسی کی اولاد باقی رکھی۔(۳۷:۷۷)

دیگر آسمانی کتابوں کی طرح قرآن بھی حضرت الیاس علیہ السلام کی دوبارہ پیدائش کی تصدیق کرتا ہے جس کو سمجھنے کے لئے ہمیں دوبارہ سورہ الصافات کے ''وَتَرَکْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ'' والے بیان کی طرف آنا ہوگا۔قرآن کے یہی الفاظ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں آیت (۳۷:۷۸) میں نازل ہوئے۔دوبارہ یہی الفاظ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آیت (۳۷:۱۰۸) میں دہرائے گئے۔پھر اگلی آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ان پر بھی سلام بھیج کر انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔اس کے بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام کا ذکر مبارک آیا مگر یہاں دوبارہ آنے والوں میں انہیں روکنے کے الفاظ نہیں آئے اور قرآن حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور (۳۷:۱۱۹) میں ان دونوں انبیا علیہ السلام کے لئے ''وَتَرَکْنَا عَلَیْهِمَا فِی الْاٰخِرِیْنَ'' کے الفاظ آئے۔ان دونوں انبیا علیہ السلام پر سلام بھیج کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔اس کے بعد (۳۷:۱۲۳) میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر مبارک آیا اور (۳۷:۱۲۹) میں ان کے لئے بھی ''وَتَرَکْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ'' کے الفاظ دہرائے گئے اور ان پر بھی سلام اور خراج عقیدت والی آیت اسی ترتیب سے آئی جیسے ان سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے ناموں کے ساتھ آ چکی ہے۔(سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ)''سلام ہو الیاسوں پر۔''(۳۷:۱۳۰) اس کے بعد آنے والی آیت (۳۷:۱۳۱) کے الفاظ (اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ)''بے شک ہم نیکوکاروں کو اسی طرح صِلہ دیا کرتے ہیں۔'' بھی وہی ہے جو اول الذکر انبیا علیہ السلام پر سلام بھیجنے کی آیات (۳۷:۷۹، ۳۷:۱۰۹، ۳۷:۱۲۰ اور ۳۷:۱۳۰) کے بعد آئی اور پھر آیت (۳۷:۱۳۲)''اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ'' بھی پہلے کی ترتیب میں دہرائی گئی اس کے بعد بالترتیب حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کو رسولوں شمار کر کے ان کا ذکر کیا گیا اور موضوع مشرکینِ مکہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اس سورۃ کے اختتام سے ایک آیت پہلے (۳۷:۱۸۱) میں ''وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ'' کے الفاظ میں سبھی رسولوں پر سلام بھیج کر آیت (۳۷:۱۸۲) (وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ)''اور سب شان اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔'' کے الفاظ کے ساتھ سورہ الصافات مکمل ہوگئی۔

اہلِ تشیع مفسرین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ''(۳۷:۱۳۰) والی آیت میں یاسین کی آل اولاد کو سلام بھیجا گیا ہے اور چونکہ یاسین حضرت محمد ﷺ کو کہا گیا ہے اس حوالے سے یہ آیت اہل بیت کو سلام پیش کرتی ہے۔

فرات قال: حدثنی عبید بن کثیر معنعنا: عن ابن عباس رضی اللّٰه عنه فی قوله تعالیٰ (سلام عل آل یاسین) قال: هم آل محمد صل اللّٰه علیه و آله. (تفسیر فرات)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں حضرت محمد ﷺ پر سلام بھیجنے کا ذکر سورہ الصافات میں حضرت الیاس علیہ السلام کے ساتھ نہیں بلکہ آیت (۳۳:۵۶) میں خصوصی طور پر الگ سے کیا گیا ہے۔
(اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا)(۳۳:۵۶)

معانی الاخبار میں آلِ یاسین کے معانی پر مکمل باب لکھ کر پانچ من گھڑت حدیثوں سے یہ ثابت کیا گیا کہ سورۃ الصافات ۳۷ کی آیت ۱۳۰ ''(سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ)'' میں اہلِ بیت

کوسلام بھیجا گیا۔

حدثنا محمد بن إبراهيم بن إسحاق الطالقانی -رضی اللّٰه عنه -قال: حدثنا أبو أحمد عبدالعزيز بن يحيىٰ بن أحمد بن عيسىٰ الجلودی البصری، قال: حدثنا محمد بن سهل قال: حدثنا الخضربن أبی فاطمة البلخی، قال: حدثنا وهب بن نافع، قال: حدثنی كادح (4)، عن الصادق جعفر بن محمد، عن أبيه، عن آبائه عن علی عليهم السلام فی قوله عزوجل: سلام علی آل ياسين "قال: ياسين محمد صلی اللّٰه عليه واله ونحن آل ياسين. (معانی الاخبار)

سلطان وزیرالدین شیرازی نے بھی اپنی کتاب ''**شبهای پیشاور**'' میں اس بات کی توثیق کی کہ مذکورہ آیت میں ال یاسین اہلِ بیت کا حوالہ ہے۔

شافعی مکتبۂ فکر کے اہم مفتی، شریعت کے قانون میں حرفِ آخر (authority) اور سب سے وزنی رائے رکھنے والے شیخ الاسلام **ابن حجر الهيتمی** اپنی کتاب "**الصّواعق المحركه**" کے گیارہویں باب میں سورہ الصافات کی آیت ''**سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ**'': (۳۷:۱۳۰) کی تفسیر ابنِ عباس کی روایت کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ اس آیت میں علیؓ اور محمد ﷺ دونوں نام اکٹھے آنے کی وجہ سے ان دونوں شخصیات پر سلام بھیجا جا رہا ہے۔ ابن حجر کی مزکورہ کتاب میں بظاہر شیعہ فرقے کی طرف سے کئے جانے والے دعووں کے خلاف مواد پایا جاتا ہے مگر موصوف شیخ الاسلام نے حضرت علی کا نام اس آیت کی تفسیر میں جڑ کے نا صرف اہلِ بیت کو سلام بھیجنے والے شیعوں کے خود ساختہ دعووں کی توثیق کی بلکہ ان کے حق میں قرآن کے الفاظ میں تحریف بھی کر ڈالی۔ اہلِ تشیع نے ابنِ حجر کو کبھی بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور ابنِ حجر نے بھی اپنی تحریروں میں اہلِ تشیع پر تنقید کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مگر اس کے باوجود ابنِ حجر نے ''**سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ**'': (۳۷:۱۳۰) کی تفسیر قرآن کے الفاظ بدل کر شیعوں کے حق میں صرف اس لئے کی کہ اس آیت کی صحیح تفسیر سے ان کے اپنے روایتی عقائد پر زد پڑتی تھی۔ اس لحاظ سے ابنِ حجر نے گھاٹے کا سودا پھر بھی نہیں کیا کیونکہ شیعہ حضرات جو ابنِ حجر سے خفا تھے وہ بھی خوش ہو گئے اور ان کا غیر قرآنی عقیدہِ آخرت بھی بچ گیا۔ رہی بات قرآن میں تحریف کی تو وہ ہمارے علما کے لئے کوئی بڑی بات نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اول تو قرآن میں تحریف والی بات ڈر کے مارے کوئی اٹھائے گا ہی نہیں اور اگر کوئی ہمت کر کے اس بات کو منظرِ عام پر لے بھی آیا تو وہ اپنی موت کو خود آواز دے گا۔ مزکورہ شیخ الاسلام ہی کیوں اس آیت کے معاملے میں ہمارے سبھی مکاتبِ فکر کے علما اندھے دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے ایک سے زیادہ الیاسوں کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے تراجم اور تفسیروں میں ایک الیاس ہی لکھا۔ الکلبی نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اور فخر الدین الرازی بھی یہی لکھتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب ہے سلام ہو علیؓ پر اور سلام ہو محمد ﷺ پر یعنی ان کے خیال میں منجملہ طور پر یہ آیت اہلِ بیت کے لئے نازل کی گئی تھی۔ حضرت علی پر سلام بھیجنے کا جواز یہ گھڑا گیا کہ چونکہ تواریخ میں مرقوم ہے کہ جب حضرت الیاس علیہ السلام کے دشمن انہیں قتل کرنے کے قریب تھے تو تیز ہوا کا بگولہ آیا جو حضرت الیاس علیہ السلام کو اڑا کر آسمان پر لے گیا جہاں وہ ابھی تک زندہ ہیں مگر زمین پر ان کی نمائندگی حضرت علی نے کی تھی اس لئے اس آیت میں یاسین کے حوالے سے علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کو خراجِ عقیدت سے سلام بھیجا گیا۔

نافعی کی دو قراءت میں آلِ یاسین پڑھا جاتا ہے باقی سب قرات میں ہم الیاسین ہی پڑھتے ہیں۔ اگر دو مختلف قرات والے قاری نماز میں اس آیت کی تلاوت کریں جن میں سے ایک ''آلِ یاسین'' پڑھے اور دوسرا ''الیاسین'' تو کیا دونوں کا مطلب الگ نہیں ہوگا؟ مگر ہمارے علماء کی نظر میں الگ الگ قرات کے باوجود قرآن کی اس آیت کے معانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا! ابو عامر کی قراءت میں ''علی یاسین'' پڑھا جاتا ہے جبکہ امام حفص کا لکھا ہوا قرآن جسے ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نسخہ سمجھ کر پڑھتے ہیں اس کی تحریر میں ''**إِل يَاسِينَ**'' لکھا ہے جسکو پڑھا ''**الیاسین**'' جاتا ہے۔ گویا امام حفص نے کمال مہارت سے شیعہ اور سنی دونوں دھڑوں کو مطمئن کر دیا یہی وجہ ہے کہ شیعوں سمیت ہمارے سبھی مکاتبِ فکر بےفکری سے قرآن کا یہی نسخہ پڑھتے ہیں۔ ویسے تو ہمارے علماء تجوید اور صرف ونحو میں بال کی کھال نکالتے ہیں مگر افسوس کا مقام ہے کہ ان میں سے کسی بھی عالم کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ مزکورہ آیت کے لفظ ''الیاسین'' کو توڑ کر اس کے حصے بخرے کرنے والے سازشی عوامل کی نشاندہی کر کے اس کو درست کر دیتا۔

درحقیقت ''الیاسین'' کو ''آلِ یاسین'' میں تبدیل کرنے کے فتنے کا آغاز حضرت عثمان غنی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد کوفے سے اس وقت ہوا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے انہیں اہلِ تشیع علماء کے پرکھوں نے قرآن میں تحریف کر کے اسے کوفی رسم الخط میں لکھا اور اس تحریف شدہ قرآن کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قرآن کا نسخہ ظاہر کر کے پوری امتِ مسلمہ میں جاری کر دیا۔ تاکہ ان کی آنے والی نسلوں کو بھی سلام پہنچتا رہے اور دنیائے اسلام میں اہلِ بیت کا بول بالا بھی قائم رہے۔ یہ وہ وقت تھا جب اسلامی خلافت انہیں شیعوں کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی۔ لہٰذا ان لوگوں نے طاقت کے زور پر اسلام کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا اور ہماری نالائقی یہ کہ ہم نے کبھی حقائق جاننے اور حق بات کو آگے لانے کی کوشش ہی نہیں کی۔

قرآن کے معروف مترجم یوسف علی کہتے ہیں کہ اس آیت میں ''یاسین'' کو سلام بھیجا گیا۔ ابنِ کثیر نے کہا کہ اس آیت میں حضرت الیاس کے گھر والوں کو سلام دیا گیا ہے۔ ان کے شاگردوں نے کہا کہ یہاں پر اللہ نے لاڈ میں حضرت الیاس کا نام بگاڑ کے الیاسین کہا اور دورِ حاضر کے علماء نے فرمایا کہ الیاسین کہنے سے مراد دراصل ایک الیاس ہی ہے۔ گویا دورِ جدید کے پڑھے لکھے علماء کو واحد اور جمع کے صیغوں میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیا کیونکہ قواعد کی رو سے دیکھا جائے تو ''الیاسین'' الیاس کی جمع ہے جس کا صاف صاف مطلب ہے ایک سے زیادہ ''الیاس''۔ قرآن سے پہلے صحیفوں میں کی گئی تحقیق سے ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت الیاس علیہ السلام **ایک سے زیادہ بار پیدا ہو کر دنیا میں بطورِ نبی تشریف لا چکے ہیں جن کی زندگی کے ہر دور پر خراجِ تحسین بھیجتے ہوئے قرآن نے جمع کے صیغے ''الیاسین'' کو استعمال کر کے ان پر سلام بھیجا ہے۔**

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنے شاگردوں سے اس ضمن میں گفتگو بہت غور طلب ہے۔ جب انہوں نے اپنے شاگردوں سے حلفیہ انداز میں کہا کہ یوحنا (یحییٰ) دراصل حضرت الیاس (Elijah) کے اوتار تھے جو دوبارہ پیدائش (Reincarnation) کے ذریعے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ لوقا ۱:۱۷، متی ۱۵-۱۴:۱۱، متی ۱۲:۱۷، مرقس ۶:۱۴ اور مرقس ۹:۱۳ میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بطور حضرت الیاس علیہ السلام دوبارہ پیدائش (Reincarnation) کی تصدیق کر رہے ہیں۔

ہمارے نامی گرامی شیوخ اور جید علماء ''**سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلۡ یَاسِیۡنَ** ''(۳۷:۱۳۰)'' والی آیت کے تراجم اور تفسیروں میں اِدھر اُدھر کی بے تکی باتیں اس لئے ہانکتے رہے کہ ضخیم کتابیں لکھنے کے باوجود بھی قرآن کا مفہوم ان کے سامنے واضح نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری روایات چونکہ فرضی قیامت سے پہلے زندہ ہونے کی تصدیق نہیں کرتیں لہٰذا نظریات کے لحاظ سے نہ تو ہمارے علماء قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور نا ہی ہم۔ مسلمانوں میں پیدا ہونے یا مسلمانوں والا نام رکھنے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا جب تک کہ وہ ارشادِ عالی ''**اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً**'' (۲:۲۰۸) کے مطابق ایمان لا کر مکمل طور پر اسلام میں داخل نہ ہو جائے۔

قارئین کرام آپ سے التماس ہے کہ آپ خود قرآن کھول کر سورۃ الصافات کی آیات ۳۷:۷۵ سے لے کر ۳۷:۱۳۲ تک ترتیب کے ساتھ تجزیاتی مطالعہ کیجئے۔ آپ کو یہ بات بخوبی سمجھ آ جائے گی کہ اس سورۃ کی آیت ۳۷:۱۳۰ میں ''**الیاسین**'' کہہ کر حضرت الیاس کی گزشتہ زندگیوں کے ادوار پر سلام بھیجا گیا ہے یا ''**اِلۡ یَاسِیۡنَ**'' لکھ کر اہلِ بیت کو سلام بھیجا گیا ہے جن کا نہ اس آیت سے پہلے ذکر ہے اور نا ہی بعد میں۔

البتہ دو آیات کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کے بیان میں ان کے اہلِ خانہ کو نجات بخشنے کے ضمن میں **اَھۡلَہٗ** کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اس بات کو قطعی طور پر ثابت کرتا ہے کہ جہاں اہلِ خانہ کی بات اللہ تعالیٰ نے کی وہاں اس کے لئے اہلِ خانہ کا باقاعدہ لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ اس آیت کے مطالعے سے اہلِ بیت پر سلام بھیجنے کے مفروضے خود بخود غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔

اِذۡ نَجَّیۡنٰہُ وَ اَھۡلَہٗۤ اَجۡمَعِیۡنَ۔ (۳۷:۱۳۴)

''جب ہم نے ان کو اور ان کے سب گھر والوں کو نجات بخشی۔'' (۳۷:۱۳۴)

اس روشن دلیل کے بعد بھی کوئی ''الیاسین'' سے آلِ یاسین گھڑ لے تو یہ اس کا اپنا ذاتی نظریہ تو ہو سکتا ہے مگر قرآن کا نہیں کیونکہ قرآن ''الیاسین'' سے حضرت الیاس علیہ السلام کے **ایک سے زیادہ جنم مراد لیتا ہے۔**

حضرت نوح علیہ السلام کا بحیثیت نبی دوبارہ آنا سمجھ میں آتا ہے چونکہ طوفانِ نوح کے بعد نئے سرے سے دنیا بسائی گئی تھی جس کی تربیت کے لئے ایک ایسے مدبر، دانا اور زمانہ شناس معلم کی ضرورت تھی جس کا شعور تمام ارتقائی مدارج طے کر کے مکمل ترقی کر چکا ہو۔ دنیا ختم ہو جانے کے

بعد شعور کی ارتقائی ترقی کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اب وہ بات نہیں تھی جس میں موت وحیات کے عملِ مسلسل سے گزرنے والے لوگ اپنی شعوری ترقی کے مختلف مدارج طے کر کے آگے کی طرف بڑھ رہے ہوں اور ایک وقت آنے پر اس کھیپ میں سے کوئی شخص ترقی کر کے اتنا راست باز ہو جائے کہ وہ نبوت کا اہل ہو کر لوگوں کی اصلاح کا کام کر سکے۔ طوفانِ نوح کے بعد آنے والی نسل کو اپنی شعوری ترقی نقطۂ آغاز سے کرنا تھی اس لئے ان میں یقیناً ایک پختہ شعور والے ایسے استاد کی ضرورت تھی جو ان کی اصلاح اور رہنمائی کرنے کا کارِ عظیم سرانجام دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بنے بنائے زندہ نبی بالکل بھی نازل نہیں کئے بلکہ نبی انہیں لوگوں میں سے اس شخص کو چنا گیا جس کا شعور ترقی کر کے اس مقام تک جا پہنچا جو نبوت کے لئے مطلوب تھا۔

کتابِ پیدائش کے حوالوں میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ طوفان سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر (۶۰۰) سال تھی۔ طوفان کے بعد وہ مزید ۳۵۰ سال تک زندہ رہے اور ۹۵۰ سال میں وفات پائی۔ اتنی لمبی عمر بذاتِ خود اپنے آپ میں استثنائی (Exceptional) مقام رکھتی ہے۔ جب سب کچھ نقطۂ آغاز سے شروع ہو رہا ہو تو لوگوں میں شعور پیدا کرنے کے لئے ۳۵۰ سال کا عرصہ کچھ نہیں ہوتا۔ سیدھی سی بات ہے کہ اسکول چلانے کے لئے معلم درکار ہے۔ کوئی تربیت یافتہ (Traind) معلم بھی دستیاب نہیں۔ نئے معلم کی ٹریننگ کا کورس ہزاروں سال کے لمبے عرصے پر محیط ہے اور ان کی ٹریننگ کرانے کے لئے بھی صرف یہی ایک معلم دستیاب ہے! اگر اس معلم کا بھی تبادلہ کر دیا جائے تو کیا ہوگا؟ ظاہر ہے اگر ایسا ہوا تو اسکول بھی بند ہوگا اور قوم بھی بے راہ روی کا شکار ہو جائے گی۔ بیشک اللہ تبارک تعالیٰ بہت دانا اور بڑی حکمت والے ہیں انھوں نے پیدائشِ نو کے ذریعے اسی تربیت یافتہ اور تجربہ کار معلم کو تمام تر نئی توانائیوں کے ساتھ دوبارہ اسی درس گاہ میں معلم مقرر کر کے انسانیت پر احسانِ عظیم فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام وہ جانی مانی اور مشہور ومعروف برگزیدہ شخصیت ہیں جن کا ذکر قرآن اور اہلِ کتاب کے صحیفوں کے علاوہ دنیا کے دیگر مذاہب کی کتابوں میں بھی نہایت عزت واحترام سے ملتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ ہندو بھی حضرت نوح علیہ السلام کو مانو (Ma-Nuu) یعنی آدمِ ثانی کا نام دے کر اوتار (Reincarnated) مانتے ہیں۔ ہندں کی پانچ ہزار سال پرانی کتاب ویدا (Veda) کہلاتی ہے جس کا مطلب علم (Knowledge) ہے اور یہ سنسکرت زبان میں لکھی ہوئیں چار ویداں پر مشتمل ہے۔ جن کے نام رِگ ویدا (Rigvada) یا جرویدا (Yajurveda) ساماویدا (Samaveda) اور اتھرواویدا (Atharvaveda) ہیں۔ ان قدیم کتابوں میں موجود حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر نائیک اور دورِ حاضر کے وسیع الذہن اور غیر متعصب علماء ان کتابوں کو بھی الہامی (Revealed) کتابوں کا درجہ دے چکے ہیں کیونکہ ان کتابوں کے بیانات بڑی حد تک دیگر آسمانی کتابوں اور قرآن سے ملتے ہیں۔ ان کتابوں میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراھیم علیہ السلام اور اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کا ذکر بھی قریب قریب اسی انداز میں بتایا گیا ہے جیسا قرآن اور اس سے پہلی آسمانی کتابوں میں ملتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں بیان مکمل کرتے ہوئے رگ ویدا کے پچیسویں اشلوک کے تعریفی کلمات میں یہ بتایا گیا ہے کہ ما۔ نو (حضرت نوح علیہ السلام) کی سچی کشتی نے ان (ہندوؤں) کے یہاں نہایت راست باز آدمی (حضرت نوح علیہ السلام) کو جنم دیا۔ ہندوں کا سال اور ان کا بکرمی کلنڈر بھی جل تھل مانو یعنی حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک ٹیلی ویژن پر اور اپنے عوامی اجتماعات میں بار ہا بیان دے چکے ہیں کہ دسویں بار پیدائش (10th Incarnation) پانے والا کالکی اوتار کوئی اور نہیں صرف محمد ﷺ ہیں جن کی ذات پر ہندوؤں کی ویداؤں میں موجود پانچ ہزار سال پرانی تمام پیشینگوئیاں پوری اترتی ہیں۔

نبی کریم حضرت محمد ﷺ کی بطور آخری اوتار یعنی پیدائش نو سے آپ ﷺ کی دوبارہ آمد ہندوؤں کی کتابوں بھوشِ پرانا میں پانچ ہزار سال سے موجود ہے جس کے سنسکرتی اشلوکوں میں محامد (Mahamad) کا لفظ دراصل نبی کریم حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب ہے جنھیں ان کتابوں میں کالکی اوتار بھی کہا گیا ہے۔

एतस्मिन्नन्तरे म्लेच्छ आचार्येण समन्वितः ।

His name will be Mahamad:

महामद इति ख्यातः शिष्यशाखासमन्वितः ॥ ५ ॥

Bhavishya Puran: Prati Sarg, Part III: 3, 3, 5

بھوشِ پرانا کے اشلوک ۵۔۲۷ کے مکمل سنسکرت متن کا اردو ترجمہ حاضرِ خدمت ہے۔

ایک غیر ملکی اور غیر زبان بولنے والا ملیچھا(Malechha) روحانی گروا اپنے ساتھوں کے ساتھ نمودار ہوگا جس کا نام محامد (محمد ﷺ) ہوگا۔عرب کے اس بزرگی والے فرشتہ صفت انسان کو گناہوں سے پاک کیا جائے گا اور اس کی خلوصِ دل سے لگن کو دیکھتے ہوئے اسے ''عرب میں سکونت پانے والے ''فخرِ بنی نوعِ انسان'' کے تعظیمی کلمات سے نوازا جائیگا۔وہ شیطان کو ختم کرنے کی عظیم قوت سے لیس ہوگا اور یہ ملیچھا مشرکوں اور بتوں کو پوجنے والے مخالفین سے بھی محفوظ رہے گا اور وہ ارداس (دعا) کرے گا،''اے خدائے پاک عظیم پروردگار میں تیرا غلام ہوں تو مجھے اپنے چرنوں میں قبول فرما۔''

بالائی اشلوکوں سے آگے یمن کے نائب الملک لحبشیا برا ھا الاشرام کا ذکر چلتا ہے جس نے مقدس سرزمینِ عرب (مکہ) کو تباہ کرنا چاہا تو ہلاک ہوگیا۔پھر محمد ﷺ کا ذکر ابراہا کے طاقتور دشمن کے طور پر اس طرح شروع ہوتا ہے۔مشہورِ عالم محامد (محمد ﷺ) دوبارہ نمودار ہوا تا کہ ان دشمنوں کو سیدھا راستہ دکھائے اور ان کی رہنمائی کرے۔محامد (محمد ﷺ) میں براہمہ (ابراہیم) جیسا کردار اور خصوصیات ہوں گی۔وہ درندہ صفت شیطانوں کو سیدھے راستے پر لگانے میں مصروف رہے گا اور خدائے ایشور کے احکامات کے مطابق مضبوط ایمان کا نفاذ کریگا۔اسے پوری دنیا کے لئے قانونِ الٰہی دیا جائے گا اور وہ مذہب میں گوشت خوری جاری کریگا۔

چونکہ سنسکرت میں عبرانی، ارامی اور عربی زبانوں کے بہت سے الفاظ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ پائے جاتے ہیں جن میں عبرانی زبان کے لفظ ''ماحیخا'' سے ماخوذ ملیچھا بھی شامل ہے جس کا مطلب برادران سے آیا ہوا ہے۔جیسا کہ ابتدا(Genesis): میں بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ اسماعیلیوں میں سے ہوں گے جو اسرائیلیوں کے بھائی ہیں۔لہٰذا، انجیل کے پس منظر میں ماحیخا یا ملیچھا کا مطلب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونا لیا جائے گا۔اس کے علاوہ بھوشِ پرانا کے مشہور مترجم مہارشی ویاسا نے ملیچھا کی تفسیر عقل مند، اچھے عمل کرنے والے، ذہین ترین اور خدا کی تعظیم کرنے والے روحانی پیشوا کے طور پر بھی کی ہے۔الہ باد یونیورسٹی کے پروفیسر اور خاندانی براہمن پنڈت وید اپرکاش اپاڈھیائی اپنی مقبول کتاب 'کالکی اوتار' میں رقم طراز ہیں کہ ان کی مقدس کتابوں کے مطابق جس رہبر و رہنما کالکی اوتار کا انتظار کیا جا رہا ہے اس کے اوصاف، حلیئے اور تعریف پر صرف عرب کے نبی محمد (ﷺ) پورے اترتے ہیں۔پنڈت ویدا پرکاش کے خیالات کی توثیق آٹھ اور ممتاز پنڈتوں نے بھی کی۔پنڈت موصوف نے اپنی کتاب ''کالکی اوتار'' میں ہندوؤں کی مقدس پرانوں سے مندرجہ ذیل حوالے دیئے ہیں۔

کالکی اوتار خدا کا آخری پیغمبر ہوگا جو پوری دنیا کی رہنمائی کے لئے آئیگا۔وہ ایک ایسی سرزمین پر پیدا ہوگا جس کے تین اطراف میں سمندر ہوگا۔اس کے باپ کا نام وشنو بھگت ہوگا۔اس کی ماں کا نام سومانی ہوگا۔اس کی عام خوراک(staple food) کھجور اور زیتون پر مشتمل ہوگی۔وہ سب سے ایماندار اور سچا انسان ہوگا۔وہ قابلِ عزت خاندان میں پیدا ہوگا۔خدا اسے ایک غار میں اپنے ایلچی کے ذریعے تعلیم دے گا۔وہ ایک اعلیٰ گھڑ سوار اور بہترین شمشیر زن ہوگا۔

کالکی اوتار اتم رِشی یعنی آخری پیغمبر کے والد کا نام ''وشنو بھگت'' اور والدہ کا نام ''سومانی'' کی تشریح کرتے ہوئے پنڈت ویدا پرکاش مزید لکھتے ہیں کہ وشنو اللہ اور بھگت یعنی اس کی عبادت کرنے والا غلام عربی میں ''عبداللہ'' بنتا ہے جو حضرت محمد ﷺ کے والد ماجد کا اسمِ گرامی تھا۔اسی طرح ''سومانی'' کا مطلب امن والی بنتا ہے جس کا عربی میں متبادل نام ''آمنہ'' ہوتا ہے جو اللہ کے نبی محمد ﷺ کی والدہ ماجدہ کا نام ہے۔

اس غلط فہمی کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ سب باتیں ہندوؤں کی کتابوں میں کہیں مسلمانوں نے نہ لکھ دیں ہوں کیونکہ یہ بیانات ہندوؤں کی کسی ایک کتاب میں نہیں بلکہ ان کی پانچ ہزار سال سے قبل کی سبھی مقدس کتابوں میں پائے جاتے ہیں جس وقت مسلمانوں کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔

ہندوؤں کی مقدس کتاب کالکی پرانا کا مندرجہ ذیل حوالہ ملاحظہ فرمائیے۔

شوم ویولے بِسنو گرے ھے پرادروبستم سومیتن ماتری بیوکن نائن تن تی دیشتھ۔(کالکی پرانا[۲] اشلوک ۴)

ترجمہ: ''اس کے بعد وشنو بھگت کی بیوی سوماتی حاملہ ہوگئی اور کالکی بیساکھی کی بارہ تاریخ کو پورے چاند کے بعد دنیا میں اترا۔'' (کالکی پرانا[۲] اشلوک ۴)

نوٹ: ہندوؤں کا کلنڈر بھی مسلمانوں کی طرح چاند کی منازل کے حساب سے چلتا ہے اور بیساکھی بھی ربیع الاول میں ہی آتی ہے دوسرے لفظوں میں بیساکھی کا مہینہ اور ربیع الاول ایک ہی دور میں

آتے ہیں۔

ہندوؤں کی مقدس کتاب سماویدا کے کچھ اشلوک حاضرِ خدمت ہیں۔

''ما'' دوَابرتیتا دیوا، ''دا'' کرانتے پرا کیرتیت، برشا نگوکھوایت، سودا ویدا شاسترے چاسمریتا۔(سماویدا)

اس کا انگریزی ترجمہ پنڈت وٹھ چاریہ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

Meaning: The devota whose name starts with a 'Ma' and ends with a 'Da' and who re-estabishes the tradition of eating beef, According to the Vedas he is the man who is highly adorable.

دیوتا جس کا نام ''م'' سے شروع ہو کر ''د'' پر ختم ہوتا ہے۔وہ گائے کا گوشت کھانے کا رواج دوبارہ شروع کریگا، ویدا کے مطابق یہ شخص انتہائی قابلِ تعریف ہوگا۔

لا الہ ہارتی پاپم اِلا اِلا ہا پرم پدم جنما بیکونتھا پراوپ-اِنوتی جانپی ناموحمدم (اترائن ویدا)

Meaning: There is no shelter but "La Ilaha." to get rid of sin. The shelter of Ilah (Allah)is the actual shelter. If one is born on earth, there is no alternative to getting salvation from sin but to take shelter in Ilah (Allah). And for this, it is essential to follow the path shown by Muhammad. (Uttrain Veda)

کوئی جائے پناہ نہیں لیکن لا الہ۔ گناہوں کو دور کرنے کے لئے۔اِلہ (اللہ) کی پناہ ہی اصل میں پناہ ہے۔اگر کوئی دنیا میں پیدا ہوا ہے تو اس کے پاس گناہوں سے نجات پانے کے لئے اِلہ (اللہ) کی پناہ کے سوا کوئی پناہ نہیں ہے۔اور اس کے لئے ضروری ہے کہ محمد (ﷺ) کے دکھائے ہوئے راستے کی پیروی کی جائے۔(اترائن ویدا)

ہوتر مندرہ ہوتر مندرہ مہا شریندرائے-اللا جیشتھنگ پرامنگ پورننگ برہمن اولام-اللا-رہسول محا مدّ راکنگ برسوا اولی اولم ادالابك میکم اللابك نکھت کم (اللا اوپانیشد)

Translation: The Supreme! The Most Exalted! The Most Powerful is HE. Alla is the best and the Greatest (or Highest). He is the Supreme, Complete and One without any Fault (Error etc.). Mahamad is HIS prophet, most acceptable. He us uncomparable. Alla is Comparable to Alla alone.(Allaupanishad)

اعلیٰ! بڑا ہی قابلِ عزت! بڑی طاقت والا ہے وہ اللہ بہترین اور عظمت والا ہے۔وہ اعلیٰ ہے، مکمل ہے اور کجی (غلطی) سے پاک ہے۔محمدؐ اس کے نبی ہیں، انتہائی تسلیم شدہ۔اس (اللہ) کے مشابہ کوئی نہیں۔اللہ اکیلا ہے جس کا موازنہ کسی اور کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

نوٹ: بالائی اشلوکوں کا سنسکرت کی ویداں سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے ہندوؤں کے راسخ العقیدہ براہمن گھرانے کے پنڈت وٹھ چاریہ نے ان اشلوکوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا جو آج کل ابوالحسین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

کالکی پرانا کے بارہویں باب کے اشلوکوں کے مصدقہ اور تسلیم شدہ تراجم بھی آپ کے مطالعے کے لئے ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

جگت گرو بشنو وگت سے سوماتی کے پیٹ میں جنم لے گا۔اس کا جنم بیساکھی کی بارہ تاریخ بروز سوموار سورج نکلنے کے دو گھنٹے کے بعد ہوگا۔اس کے باپ کا انتقال اس کے جنم لینے سے پہلے ہی ہو چکا ہوگا اور اس کی ماں اس کے جنم کے بعد کچھ عرصہ زندہ رہ کر گزر جائے گی۔جگت گرو سلما لکے بجیرہ کی امیرہ سے شادی کریگا جس میں کی اس کے چچا اور تین بھائی شرکت کریں گے۔پرس رام اسے ایک غار میں تعلیم دیں گے۔جب وہ اپنی تعلیمات کی تبلیغ کرنے بجیرہ سلمال سے سمبالہ آئے گا تو اس کے رشتے دار اس کی مخالفت کریں گے۔وہ اس پریشانی اور مخالفت کی وجہ سے شمالی پہاڑوں کی طرف ہجرت کر جائیگا لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ تلوار کے ساتھ سمبالہ واپس آئے گا اور اس پوری سرزمین کو فتح کریگا۔

جگت گرو دنیا کے ممتاز معلم کو کہا جاتا ہے۔بشنو وگت میں بشنو اللہ کے لئے استعمال ہوا ہے اور وگت بندہ یا غلام کے معانی میں استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ''عبداللہ'' لیا جاتا ہے۔سوماتی میں سو کے معانی امن اور اطمنان کے ہیں اور ماتی روح اور دل کو کہا جاتا ہے۔لہٰذا، امن والی روح سے آمنہ مطلب نکالا گیا ہے۔بیساکھ ہندوؤں کے بکرمی کلنڈر کے مطابق بہار کا موسم کہلاتا ہے جسے عربی میں ربیع کہا جاتا ہے۔آپ ﷺ کی پیدائش کا وقت اگر ہندوستان میں سورج نکلنے کے دو گھنٹے بعد ہو تو حجاز یعنی عرب کا وقت ہندوستان سے دو گھنٹے اور چالیس منٹ آگے لیا جائے گا

کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے عرب (حجاز) ۸۰ درجے مغربی خط العرض پر واقع ہونے کی وجہ سے ہندوستان سے ۴۰ درجے مغرب کی جانب واقع ہے جس کی وجہ سے ہندوستان اور عرب کے وقت کا فرق (۸۰-۴۰) x ۴ = ۱۶۰ منٹ بنتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت محمدؐ کی پیدائشِ مبارک بھی مکہ میں سورج طلوع ہونے سے پہلے طلع النہار کے قریب ہوئی تھی جو ہندوؤں کی کتابوں میں درج کالکی اوتار کی پیدائش کے وقت سے مطابقت رکھتی ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں دنیا کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس کے مطابق ہندوستان، تبت اور برما وغیرہ بحیرہ جمبو میں آتے ہیں۔ یورپ بحیرہ شیک میں آتا ہے۔ بلوچستان اور افغانستان میں رہنے والے بحیرہ کرونچا کے باسی کہلاتے ہیں۔ افریقہ بحیرہ کاش کہلاتا ہے۔ روس اور چین بحیرہ شکلی میں آتے ہیں اور عرب بحیرہ سلمال میں آتا ہے۔ سلمال کی امیرہ سے مراد ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ ہیں جن کی حیثیت کسی امیرہ یا شہزادی سے کم نہیں تھی کیونکہ ان کا شمار مالدار شخصیات میں ہوتا تھا اور ان کے والد بھی امیر کبیر اور عرب کے ممتاز شخص تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت محمدؐ کی شادی میں شرکت کرنے والوں میں آپؐ کے چچا ابو طالب اور تینوں بھائیوں حضرت علی، عقیل اور جعفر نے شرکت کی تھی۔ پرس رام میں پرس کلہاڑا یا اوزار (tool) کہلاتا ہے اور رام کا مطلب خدا (God) لیا جاتا ہے۔ گویا پرس رام خدا کا اوزار یعنی فرشتہ ہوا جس کے ذریعے نبی ﷺ کو قرآن کی تعلیم دی گئی۔ غار سے غارِ حرا مراد ہے اور سمبالہ سے مراد حرم، تعظیم والی اور مکرم جگہ ہے جو بلا شبہ **مکۃ المکرمہ** ہی ہوسکتا ہے۔ شمالی پہاڑوں کی طرف ہجرت سے مراد مدینہ منورہ ہے جو مکہ سے ۲۲۵ میل شمال کی بلندیوں پر واقع ہے۔ سمبالہ میں تلوار تھام کر واپس آنے سے مراد آپ ﷺ کی بطور فاتح مکہ میں دوبارہ واپسی ہے۔ اس سرزمین کو فتح کرنے سے مراد پورے عرب کا آپ ﷺ کی تعلیمات کے سامنے سرنگوں ہونا ہے۔

ہم لوگ اپنے انبیا علیہ السلام کے اذکار پر مبنی ہندوؤں کی ویداں کے حوالوں کو نا صرف بخوشی قبول کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی فخر سے بتاتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ ہندوؤں کی ویداؤں میں بھی موجود ہیں مگر جہاں انہیں ویداؤں میں یہ کہا جاتا ہے کہ کالکی اوتار کا یہ دسواں جنم ہوگا وہاں ہم جنم کرم یعنی آخرت کی حقیقت کو ماننے سے قطعی انکار کر دیتے ہیں کیونکہ ہم مفروضوں پر قائم کردہ اپنے جامد و ساکت نظریات کے خلاف کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے جبکہ بشمول قرآن کسی بھی الہامی کتاب میں آخرت کا وہ تصور موجود نہیں جسے ہم اپنے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ان ویداؤں میں قرآن کے حوالے سے ہمارے جانے پہچانے جن انبیا علیہ السلام کا ذکر آتا ہے ان سب کے ساتھ ایک لفظ اوتار (Reincarnated) یعنی ان کی پیدائشِ نو ضرور آتا ہے جسے ہم صرف اس لئے خاطر میں نہیں لاتے کہ اگر ان انبیا کو اوتار (Reincarnated) مان لیا جائے تو لوگ سمجھیں گے کہ شائید ہم ہندو ہوگئے ہیں۔ ہم یہودیوں کی تعلیمات میں بھی ''گِل گل'' اور گنتی کی آیات ۱۸-۶:۲۵ میں اوتاروں کی آمد کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہودی موشہ (Moshe) یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت آدم کے تیسرے بیٹے شیت کی پیدائشِ نو (Reincarnation) مانتے ہیں جبکہ شیت کو ہابیل کا اگلا جنم مانا جاتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں کی تاریخ میں ھلیل دوسرا جنم لے کر بطور حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ بائبل کی کتاب یونس (the biblical Book of Jonah) اوتار کی شکل میں انسان کے دوبارہ پیدا ہونے کے عمل کی وضاحت کرتی ہے۔ جو علماء ویداؤں کی سچائی جانتے ہوئے انہیں بحیثیت الہامی کتابوں کے قبول تو کر چکے ہیں مگر ابھی تک آخرت کے بارے میں اپنے روایتی خیالات چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے انہیں بھی شاید یہ ڈر ہے کہ پیدائشِ نو کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو ان کا ایمان جاتا رہے گا۔ حالانکہ اوتار (Reincarnated) کا مطلب قرآن کی زبان میں ''مبعوث'' ہے۔ جہاں جہاں قرآن کہتا ہے کہ فلاں نبی مبعوث ہوئے وہاں مبعوث ہونے سے دوبارہ پیدا ہونے والے اوتار (Reincarnated) ہی لئے جائیں گے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے اور اللہ کا فرمان کسی کی ذاتی رائے یا کسی بات کے ڈر سے تبدیل نہیں ہوسکتا۔ یوم المبعوث یعنی دوبارہ پیدا ہونے کا دن بھی اسی سے ماخوذ ہے جسے ہم نے عیسائیوں کی تقلید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کے بعد قبروں سے نکل کر مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے دن سے تعبیر کر رکھا ہے۔ مگر کمال **کی بات تو یہ ہے کہ اگر یوم المبعوث کو ہمارے علماء کی تفسیر کے مطابق قیامت برپا ہونے کے بعد ریسرکشن (Resurrection) یعنی ہمیشہ کے لئے دوبارہ پیدائش کا دن مان لیا جائے تو پھر انبیاء علیہ السلام کی بعثت قیامت برپا ہونے سے پہلے کیسے ہوگئی؟**

ترجمہ اور تفسیر کوئی کیسے بھی کرے مگر قرآن تو روایتی یوم المبعوث کے آنے سے پہلے ہی انبیاء علیہ السلام کو مبعوث کر رہا ہے! قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات کا متن ملاحظہ فرمائیے:

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ (۱۰:۷۴) ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ (۱۰:۷۵) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (۱۶:۳۶)

ان آیات کے تراجم اس لئے نقل نہیں کئے گئے کیونکہ سبھی مترجمین و مفسرین نے اپنے روایتی نظریے کے مطابق ان آیات میں ''بَعَثْنَا'' کا ترجمہ ''ہم نے دوبارہ پیدا کیا'' کی بجائے ''ہم نے بھیجا'' (sent) کیا ہے جبکہ قرآن حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق مندرجہ ذیل آیت میں **بَعْثُ** اور **وُلِد** کا فرق دوٹوک انداز میں واضح کر چکا ہے۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا۔

''اور اس پر سلام ہو جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن مرا اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا گیا۔'' (۱۹:۱۵)

شیطان کا بیان بھی ملاحظہ فرمائیے:

قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ (۷:۱۴)

''بولا کہ مجھے مہلت دے دوبارہ زندہ کئے جانے کے دن تک۔'' (۷:۱۴)

لہٰذا ''بَعَثْنَا'' کا مطلب پہلی بار پیدا ہونا یا بھیجنا نہیں لیا جا سکتا کیونکہ پیدائش کے لئے قرآن میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ **وُلِدَ** ہے اور بھیجنے کے لئے رسل سے ماخوذ ''ارسلنا'' استعمال ہوا ہے یعنی ہم نے بھیجا۔ قرآن کی یہ آیت ملاحظہ فرمائیے جس میں رسولوں کو بھیجنے کا ذکر ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ (۱۵:۱۰)

قرآن نے رسل، ولد اور بعث تین مختلف الفاظ استعمال کئے ہیں جن کے معانی بھی یقیناً ایک دوسرے سے الگ ہیں مگر ہمارے علماء کرام نے یہ تینوں الفاظ ایک ہی معانی میں لے کر قرآن کو خاموش کر دیا اور اپنے خود ساختہ غیر قرآنی نظریات کو قرآن پر فوقیت دیتے ہوئے قرآن کے اصل بیان سے ہٹ کر من مانے تراجم اور تفسیریں گھڑ ڈالیں۔

روزمرہ کی گفتگو میں بھی کوئی یہ نہیں کہتا کہ ہمارے گھر بچہ مبعوث ہوا۔ سبھی لوگوں کو یہی کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ ہمارے یہاں بچے کی ولادت ہوئی یا فلاں کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی۔ لہٰذا، مبعوث ہونے کا مطلب دوبارہ پیدا ہونا قرآن سے بھی ثابت ہوتا ہے اور عام بول چال سے بھی۔

قارئین کرام غور فرمائیے حضرت عزیر علیہ السلام کے بیان میں قرآن ''بعث'' کا مطلب دوٹوک اور قطعی الفاظ میں دوبارہ زندہ ہو نا لیتا ہے۔

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ۔ (۲:۲۵۹)

''ان کو اللہ نے ان کے مرنے کے سو برس بعد دوبارہ زندہ کر دیا۔'' (۲:۲۵۹)

اس آیت میں بھی ''بَعَثَهٗ'' سے اس کی یعنی حضرت عزیر علیہ السلام کی موت کے بعد دوبارہ پیدائش مردوں کے رینگ کر قبروں سے نکلنے والی روایتی قیامت سے پہلے بتائی جا رہی ہے۔ تفسیروں میں یہ بتایا گیا کہ یہ استثنائی واقعہ تو صرف حضرت عزیر علیہ السلام کی حیرانی دور کرنے کے لئے پیش آیا تھا کیونکہ وہ ایک تباہ شدہ بستی میں سے گزرتے ہوئے اس مخمصے میں پڑ گئے تھے کہ اللہ مرنے کے بعد کیسے زندہ کر سکتا ہے؟ دراصل مخمصے میں تو ہمارے علماء خود پڑے ہوئے ہیں جن کے نظریات قرآن سے مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ انہیں خود بھی ایمان کی کمزوری کے باعث مردوں کے زندہ ہونے پر یقین نہیں آتا۔ ملاحظہ فرمائیے اللہ تبارک تعالیٰ نے اسی آیت میں یہ بھی فرمایا ہے:

وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ۔ (۲:۲۵۹)

''تمام بنی نوع انسان کے لئے حضرت عزیر علیہ السلام کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کی نشانی بنا کر پیش کیا۔'' (۲:۲۵۹)

تاکہ لوگوں کا ایمان پختہ ہو جائے۔ مگر ہم اتنے ہٹ دھرم نکلے کہ قرآن کی واضح نشانیاں دیکھ کر بھی ہمیں پیدائش نو پر یقین نہیں آتا۔ اس کے بعد اسی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا۔ (۲:۲۵۹)

''اور ہڈیوں کی طرف دیکھو کہ ہم انہیں کس طرح ابھار کر جوڑ دیتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔'' (۲:۲۵۹)

So, We can make you a Sign for all mankind. Look at the

bones-how We raise them up and clothe them in flesh." (Qur'an, 2:259)

یہ سب ہماری روایتی قیامت کے آنے سے پہلے کی مثالیں ہیں اور دنیا میں شب و روز یہی کچھ ہو رہا ہے جس پر ایمان لانے کے لئے اللہ نے قرآن میں بارہا تاکید فرمائی ہے مگر ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے اور آخرت پر ایمان لانے کے حکم کے باوجود ہم گھوم پھر کے آخرت پر ایمان کو اسی روایتی تصور میں دیکھتے ہیں جو ہمارے علماء سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔

دیگر انبیاء علیہم السلام کی پیدائش نو کو بھی واضح کرتے ہوئے قرآن ان کی ولادت کے لئے لفظ ''وُلِـدَ'' کو استعمال کرنے کی بجائے ان کا پیدائش نو کے عمل کے ذریعے دنیا میں دوبارہ تشریف لانا بعثت سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر بعثت کا مطلب دوبارہ پیدائش کی بجائے نبوت کے مقام پر تقرری مانا جائے جیسا کہ ہمارے کچھ علماء نے اپنی تفسیروں اور تراجم میں لکھا ہے تو ان علماء کے اس غیر قرآنی نظریئے کی رو سے یوم المبعوث یعنی فرضی قیامت والے دن جب سب لوگ مبعوث کئے جائیں گے تو گویا انہیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا بلکہ زمینی قبروں میں مدفون ان متوفین کا بھی کسی مقام پر تقرر ہوگا ! ہمارے نام نہاد علماء کی یہ بات ایسے ہی ہے جیسے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے خواہ سو جھوٹ بول دیئے جائیں مگر جھوٹ پھر بھی جھوٹ ہی رہتا ہے۔ اسی طرح کسی لفظ کے غلط معانی غلط ہی ثابت ہوں گے خواہ تفسیر و تراجم میں کتنا ہی ہیر پھیر کر لیا جائے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ.

''پھر اللہ نے انبیاء بشارت دینے والے اور آگاہ کرنے والے مبعوث فرمائے اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل کیں۔'' (۲:۲۱۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے قرآن کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

وَالَّذِىْ يُمِيْتُنِىْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ۔ (۲۶:۸۱)

''اور وہی مجھے موت دیتا ہے پھر وہی مجھے دوبارہ زندہ کرتا ہے۔'' (۲۶:۸۱)

اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ۔ (۲:۲۵۸)

''جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔'' (۲:۲۵۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حوالہ بھی قرآن میں دیکھ لیجیے:

قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا۔ (۱۹:۳۰)

''کہا بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔'' (۱۹:۳۰)

اس آیت میں دو الفاظ ''**جَعَلَنِىْ نَبِيًّا**'' نسِ مضمون سمجھنے میں اہم ہیں۔ یہاں پر ''**نَبِيًّا**'' کے ساتھ مبعوث کی بجائے بنیادی حروف ج ع ل سے ماخوذ مرکب ''**جَعَلَنِىْ**'' یعنی ''مجھے بنایا گیا'' آتا ہے جو فعل ''**جَعَلَ**'' اور ذاتی ضمیر واحد حاضر کی مفعولی حالت سے مل کر بنا ہے۔ ''**جَعَلَ**'' کسی چیز کو بنانے (manufacturing) اور کسی چیز کو ایک شکل سے دوسری شکل میں ڈھالنے (recycling) کے معانی میں آتا ہے۔ جو حضرات سعودی عرب کے مصنوعات بنانے والے کارخانوں میں کام کر چکے ہیں وہ عمل صناعی میں ''**جَعَلَ**'' کے لفظ کے استعمال سے یقیناً واقف ہوں گے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ پیدائش کا ذکر بھی کر دیا گیا جس کے تراجم میں ہمارے علماء کرام نے نہایت شاطرانہ انداز میں ''روزِ قیامت'' کے الفاظ کا اپنی طرف سے اضافہ بھی کر دیا تا کہ روزِ قیامت مردوں کے زندہ کئے جانے والے ان کے غیر قرآنی نظریئے کو کوئی آنچ نہ آئے۔ اس آیت کا اصل متن ملاحظہ فرمائیے جس میں قیامت کا کوئی ذکر ہی نہیں:

وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ يَوْمَ اَمُوْتُ وَ يَوْمَ اُبْعَثُ۔

''اور سلام ہے میری پیدائش کے دن اور موت کے دن اور دوبارہ پیدا ہونے کے دن پر۔'' (۱۹:۳۳)

غور فرمائیے، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام نے خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے ہوئے کیا دعا فرمائی اور وہ کیسے قبول ہوئی؟

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

''اے ہمارے رب اور ان میں ایک رسول انہیں میں سے مبعوث فرما جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انہیں کتاب اور دانائی سکھائے اور انہیں پاک کرے بے شک تو ہی غالب حکمت والا

ہے۔" (۲:۱۲۹)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔

"بیشک اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہیں میں سے رسول مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور دانش سکھاتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔" (۳:۱۶۴)

قارئین کرام دوبارہ پیدا ہونے پر یقین رکھنا ہی دراصل قرآن کی بتائی ہوئی آخرت (The Hereafter) پر ایمان ہے۔ اگر ہم پیدائش نو میں یقین نہیں رکھتے تو ہمارا ایمان مکمل نہیں خواہ ہم کتنے ہی بڑے صاحب علم کیوں نہ ہوں بلکہ ہم قرآن کے مطابق منکر، سرکش اور متکبر ہیں۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۔

"تمہارا معبود، معبودِ یکتا ہے، پس جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ سرکش و متکبر ہیں۔" (۱۶:۲۲)

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۱۶:۳۸)

"یہ لوگ اللہ کے نام کی کڑی سے کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ کسی مرنے والے کو دوبارہ زندہ کر کے نہیں اٹھاتا۔ کیوں نہیں، یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔" (۱۶:۳۸)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ۔ (۲۲:۵)

"اے لوگو اگر تمہیں دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے؟" (۲۲:۵)

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۔

"(تو وہ) مردے ہیں زندہ نہیں، اور شعور نہیں رکھتے دوبارہ زندہ کئے جانے کے سلسلے کا۔" (۱۶:۲۱)

نوٹ: بالائی آیت (۱۶:۲۱) کے لفظ "اَيَّانَ" کا ترجمہ مروجہ تراجم میں "کب" (when) کیا گیا ہے جبکہ اس لفظ "اَيَّانَ" کا صحیح ترجمہ نیٹ ورک (network) یعنی ایک باہم مربوط سلسلے کا مقرر کردہ نظام ہے۔ "اَيَّانَ" کے معانی تکنیکی لحاظ سے ایسے ہی ہیں جیسے آج کل کمپیوٹر کا نیٹ ورک یا بجلی اور ٹیلی فون کی تاروں کا بچھایا ہوا نظام ہوتا ہے۔ لہٰذا، آپ کے مطالعے کے لئے اس آیت (۱۶:۲۱) کا ترجمہ درست کر کے لکھ دیا گیا ہے۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ۔

"جس روز اللہ ان کو اکٹھا کر کے دوبارہ زندہ کرتا ہے، وہ اس کے سامنے بھی اسی طرح قسمیں کھاتے ہیں جس طرح تمہارے سامنے کھاتے ہیں اور اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کا کچھ کام بن جاتا ہے۔ خوب جان لو، وہ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔" (۵۸:۱۸)

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔

"جس دن اللہ ان کو اکٹھا کر کے دوبارہ زندہ کرتا ہے تو انہیں ان کے اعمال سے آگاہ فرماتا ہے، اللہ نے ہر عمل کو شمار کر رکھا ہے حالانکہ وہ اسے بھول چکے ہیں، اور اللہ ہر چیز پر مطلع (اور آگاہ) ہے۔" (۵۸:۶)

نوٹ: بالائی آیات کے متن میں آنے والے لفظ جَمِيْعًا (put together) کے معانی بھی ہمارے مروجہ تراجم و تفسیر میں غلط ہیں جو ہمارے علمائے کرام نے روز قیامت سب لوگوں کے جم غفیر کو حشر کے فرضی میدان میں اکٹھا کئے جانے سے تعبیر کئے ہیں۔ جبکہ قرآن جَمِيْعًا کو کسی بکھری ہوئی شے کو جوڑ کر اکٹھا کرنے کے معانی میں لیتا ہے اور یہ لفظ جَمِيْعًا دراصل روح اور جسم کو اکٹھا کرنے کے معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ۔ (۳۶:۷۹)

"فرما دیجئے: انہیں وہی زندہ کرتا ہے جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، اور وہ ہر چیز کو تخلیق

کرنے کاعلم رکھتا ہے۔'' (۳۶:۷۹)

اَوَ لَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ بَلٰی وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ۔

''اور کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے اس بات پر قادر نہیں کہ ان جیسی تخلیق دوبارہ کردے، کیوں نہیں، اور وہ بڑا پیدا کرنے والا خوب جاننے والا ہے۔'' (۳۶:۸۱)

انسانی شعور کے ارتقا اور ترقی کے فطری تقاضوں کے لحاظ سے جس شخص کا شعور اس کی زندگی کے ایک دور میں جتنی ترقی کرکے آگے بڑھتا ہے اگلی زندگی میں وہ اس ترقی یافتہ شعور کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور ہر نئی زندگی میں وہ اس سے آگے ترقی کرتا ہے۔ انسانی شعور کو ترقی دینے کیلئے ایک معینہ مدت کے بعد موت، اس کے فوراً بعد حساب کتاب اور اعمال کے مطابق (recompensed) اگلی زندگی دی جاتی ہے تاکہ شعور کی ترقی کا سلسلہ آگے سے آگے بڑھتا رہے۔ اس اگلی زندگی کو قرآن آخرت (Hereafter) کہتا ہے اور آخرت بھی کوئی ایک نہیں۔ بلکہ ہر ایک زندگی کے بعد موت اور ہر موت کے بعد آنے والی آخرت ہمارا انتظار کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس کا اطلاق کسی شخص پر اس وقت تک ہوتا رہتا ہے جب تک اس کے شعور کی وہ ترقی مکمل طور پر نہیں ہو جاتی جس کے لئے انسان کو تخلیق کرکے دنیا میں بھیجا گیا۔ لہٰذا، عام حالات میں انسان کی دوبارہ پیدائش بطور انسان ہی ہوتی ہے تاکہ اس کی شعوری ترقی کا ارتقائی تسلسل قائم رہے۔ ذرے ذرے کا حساب ہوتا ہے اور اچھے برے اعمال کی مناسبت سے انسان کو موت کے بعد اچھی یا بری انسانی زندگی مل جاتی ہے جہاں سے آگے کا سفر انسان اپنی خود مختاری (free will) کو استعمال کرتے ہوئے اچھے یا برے اعمال کے ساتھ کرتا ہے۔ راست بازی اور اچھے اعمال کی بدولت شعور میں مثبت ترقی ہوتی رہتی ہے جس سے موجودہ زندگی بھی اچھی گزرتی ہے اور آنے والی زندگی بھی گزشتہ زندگی سے بہتر ہوتی جاتی ہے۔ اگر انسان اپنی خود مختاری کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے بداعمالیوں میں گھر کے گم گشتہ راہ ہو جائے تو نا صرف شعور کی ترقی رک جاتی ہے بلکہ موجودہ اور آنے والی زندگی بھی تباہی اور بربادی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ بعض درندہ صفت انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے بہیمانہ جرائم، شرک اور اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں کچھ حاصل نہیں کرپاتے۔

فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَةِ۔

''تو ایسے لوگوں کے اعمال موجودہ دنیا اور آنے والی دنیا میں برباد ہو جاتے ہیں۔'' (۲:۲۱۷)

لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ وَ لَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ۔ (۳۹:۶۵)

''جس سے تمہارا عمل ضائع ہو جاتا ہے اور عین گھاٹا پانے والوں میں سے ہو جاتے ہو'' (۳۹:۶۵)

نَحۡنُ قَدَّرۡنَا بَیۡنَکُمُ الۡمَوۡتَ وَ مَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ۔ (۵۶:۶۰)

''ہم نے اپنی منصوبہ بندی کر رکھی ہے تمہارے درمیان موت کی، اور کیا ہم یہ کام پہلے سے کرنا نہیں جانتے؟'' (۵۶:۶۰)

عربی زبان کے لفظ قَدَّر کے معانی اختیار، طاقت (authority-control) اور منصوبہ بندی (planning) ہیں قَدَّر سے ہی قَدَّرت کا لفظ بھی نکلا ہے۔ یہی لفظ قَدَّر فارسی زبان میں بھی موجود ہے جس کے معانی مقدار، قیمت، تخمینہ اور اندازہ (cost, value, quantity and magnitude) ہیں۔ مگر ہمارے علمائے کرام نے قرآن کے تراجم و تفسیر میں قرآن کے اس لفظ قَدَّر کے عربی معانی لینے کی بجائے فارسی معانی لئے جس سے قرآن کا سارا مفہوم بگڑ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک تقدیر کا مسلہ بھی حل نہیں ہو سکا کیونکہ ہم نے قرآنی الفاظ کا مفہوم لینے کی بنیاد ہی غلط ڈال رکھی ہے تو پھر صحیح معانی کیسے ملیں گے؟ اسی طرح عربی کے لفظ مَسۡبُوۡق کی مفعولی حالت (passive) میں آنے والے قرآن کی اس آیت کے عربی لفظ مَسۡبُوۡقِیۡنَ کے معانی (unprecedented) ہیں یعنی جس نے پہلے کوئی کام نہ کیا ہو یا جو پہلے نہ جانتا ہو یا جو پہلے موجود نہ ہو۔ مگر فارسی زبان کے اسی لفظ مَسۡبُوۡق کے معانی آگاہ ہونا (aware) اور مطلع ہونا (informed) ہیں جو اگرچہ مَسۡبُوۡق کے عربی معانی سے ملتے جلتے دکھائی دیتے ہیں مگر پھر بھی یہ فارسی معانی قرآن کس مفہوم ادا کرنے کے قابل نہیں۔

بہر حال جن لوگوں کی بات قرآن کی بالائی آیات میں بیان کی گئی ہے یہ انسان نما بھیڑیئے

انسانیت پر ظلم وستم روا رکھنے کے بعد جب موت کے شکنجے میں آتے ہیں تو وہ دوبارہ بطور انسان پیدا نہیں ہوتے۔کوئی مانے یا نہ مانے مگر قرآن کے مطابق وہ انسان کی بجائے کسی اور صورت میں پیدا ہوکر پروان چڑھتے ہیں۔یعنی سائنسی لحاظ سے اللہ کا قانون ان کی حیاتیاتی درجہ بندی (Biological Classification) انسانوں سے یکسر مختلف کردیتا ہے۔

عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔(۵۶:۶۱)

"کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔"(۵۶:۶۱مودودی)

اس بات سے کہ بدل دیں ہم تمہارے وجود ہی کو اور پیدا کردیں تمہیں ایسی شکل وصورت میں جس کو تم جانتے ہی نہیں۔(۵۶:۶۱۔شبیر احمد)

کہ تم جیسے اور بدل دیں اور تمہاری صورتیں وہ کردیں جس کی تمہیں خبر نہیں۔(۵۶:۶۱۔احمد رضا خاں)

کہ تمہاری طرح کے اور لوگ تمہاری جگہ لے آئیں اور تم کو ایسے جہان میں جس کو تم نہیں جانتے پیدا کردیں۔(۵۶:۶۱۔فتح محمد)

اس بات سے کہ ہم تم جیسے لوگ بدل کر لے آئیں اور تمہیں ایسی صورت میں بنا کھڑا کریں جو تم نہیں جانتے۔(۵۶:۶۱۔دیگر تراجم)

ن ش أ کے بنیادی حروف سے اسم نَّشَــأَةٌ بنتا ہے جس کا مطلب ہے "پروان چڑھنا" انہیں بنیادی حروف سے فعل "أَنْشَأَ ، إِنْشَآء اور يُنَشَّؤُا" بھی اخذ کئے جاتے ہیں۔اس آیت کے لفظ "نُنْشِئَكُمْ" میں "نُنْشِءَ" بھی کسی ذی حیات کو پروان چڑھانے، پیدا کرکے نکالنے، اگانے، جان ڈالنے اور نئے سرے سے تخلیق کرنے کے معانی میں آتا ہے۔

بالائی آیت کے بیان کی توثیق کرتے ہوئے ارشادِ عالی ہوتا ہے:

عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ۔(۷۰:۴۱)

"اس پر کہ بدل کر لے آئیں بہتر لوگ ان سے اور نہیں ہے کوئی ہم سے سبقت لے جانے والا۔"(۷۰:۴۱۔مروجہ تراجم)

کہ ان کی جگہ اِن سے بہتر لوگ لے آئیں اور کوئی ہم سے بازی لے جانے والا نہیں ہے۔(۷۰:۴۱۔مودودی)

اس پر کہ ہم بدل کر ان سے بہتر لوگ لے آئیں، اور ہم ہرگز عاجز نہیں ہیں۔(۷۰:۴۱۔طاہر القادری)

عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ۔(۷۰:۴۱)

بالائی آیت میں آنے والے عربی زبان کے لفظ خَيْرًا کے حقیقی معانی فلاح وبہبود، رفاہیہ، اصلاح اور ترقی وخوشحالی ہیں جو فارسی زبان کے لفظ خیر کے معانی میں عربی سے یکسر مختلف ہیں۔اس آیت ۷۰:۴۱ کے مفہوم کو بدلنے کے لئے ایک تو عربی کے لفظ خَيْرًا کے فارسی معانی لئے گئے دوسری ہیرا پھیری مِّنْهُمْ کا مفہوم بدل کر کی گئی۔کسی عالم نے مِّنْهُمْ کا ترجمہ "ان کی جگہ ان سے" اور کسی نے "لے آئیں ان سے" کردیا جو مِّنْهُمْ کا ترجمہ ہی نہیں اور قاعدے کے بھی خلاف ہے۔اس کے علاوہ مَسْبُوْقِيْنَ کے معانی (unprecedented) یعنی جس نے پہلے کوئی کام نہ کیا ہو یا جو پہلے نہ جانتا ہو یا جو پہلے موجود نہ ہو بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔لہٰذا بالائی آیت ۷۰:۴۱ کا صحیح ترجمہ آپ کے مطالعہ کے لئے حاضر ہے۔

ان پر ہونے والی فلاح وبہبود/رفاہیہ/اصلاح/ترقی وخوشحالی کا رخ ان سے تبدیل ہوجاتا ہے اور کیا یہ کوئی ایسا نیا کام ہے جو ہم پہلے سے کرنا نہیں جانتے؟(۷۰:۴۱صحیح ترجمہ)

فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ(۸۲:۸)

بے شک جس صورت میں چاہے تجھے جوڑ دیا جاتا ہے۔(۸۲:۸)

82. 8. In whatever form (image)He willed, He put you together (assembled you).

ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر کی جلد چہارم کے صفحہ ۲۶۷-۲۶۸ میں اس آیت کے لفظ "رَكَّبَكَ" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عربی کے مصدر "رَكَّبَ" سے مراد یہ ہے کہ زرخیز تخم میں بشمول آدم ابتدائی تخلیقات کی تمام جینیاتی خصوصیات (genetic characteristics) پائی جاتی ہیں۔عکرمۃ، اَبوصالح اور قتادۃ اس میں اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کچھ لوگ جانوروں کے مشابہ ہو جاتے ہیں اور ان کے خدوخال اور چہرہ بندر، خنزیر، کتے یا گدھے جیسا ہوجاتا ہے۔لہٰذا، انسان کی

پیداوار مختلف النوع جینیات کے طویل موروثی خط (long line of genetic traits) سے جاملتی ہے جس کی تصدیق آج کی حیاتیاتی سائنس بھی بخوبی کرتی ہے۔ اگر جنیٹک انجینئرنگ میں خلیات کو الٹا پھیرنے کے کامیاب تجربات آج کے سائنسداں کر سکتے ہیں تو اللہ کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ کسی بھی انسان کے اعمال بد کے جرم میں اس کے جین میں پائی جانے والی کسی بھی شکل (traits) کو منتخب کرکے اسے پست سے پست اور بری سے بری حالت میں الٹا پھیر کے انسان کو کیا سے کیا بنا دے؟ جبکہ ہم مندرجہ ذیل آیت کا سائنسی مطالعہ بھی کر چکے ہیں۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ۔(۹۵:۵)

''پھر اسے الٹا پھیر کے ہم نے پست سے پست تر حالت میں لوٹا دیا۔''(۹۵:۵)

فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (۸۲:۸) ''پھر جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔'' میں استعمال کئے جانے والے فعل ''رَكَّـــبَ'' کے سائنسی معانی دیگر حیاتیاتی اجسام کے جنیاتی مادوں (genetic material from other organisms) کو استعمال کر کے انسان کو دوبارہ جوڑنا یا اکٹھا کرنا (put together or assembling) ہے۔ یہ موت کے بعد انسان کا وہی دوبارہ اکٹھا کیا جانا یعنی انسانی روح اور جسم کے اعضاء کی اسمبلی (assembly) ہے جسے قرآن میں ''حشر'' بھی کہا گیا ہے۔ مگر ہم نے انسانی زندگی کے کل پرزے دوبارہ جوڑنے والی اسمبلی یعنی قرآن کی زبان میں حشر کو اسکول، کالج اور اسمبلی حال میں ہونے والی قومی اسمبلی اور مسلم لیگ یا کانگرس کے جلسے جلوسوں کی اسمبلی سے تعبیر کر کے انہیں خطوط پر حشر کے میدان میں جم غفیر کی اسمبلی قائم کر دی۔ روزِ حشر میں لوگوں کا میلہ لگنے کا غیر قرآنی تصور دینے والے نالائق علماء کی بجائے اگر حشر (assembly) کا مطلب کسی معمولی اہلیت کے مستری، کاری گر (fitter) یا مکینک سے پوچھ لیا جاتا تو وہ بھی جھٹ سے بتا دیتا کہ اسمبلی (عربی میں حشر) کا مطلب کسی چیز کے پرزے جوڑ کر اسے چلتی حالت میں لانا ہے۔ جیسے آج کل جاپانی کاروں کی اسمبلی پاکستان میں ہو رہی ہے۔ امریکی کمپیوٹروں کی اسمبلی سویڈن میں ہوتی ہے۔ دنیا بھر کے موبائل فون چائنہ اور کوریا میں اسمبل ہوتے ہیں۔ لہٰذا، انسان کو موت کے بعد اکٹھا کرنا حشر کہلاتا ہے۔

اللہ نے صرف اناٹومی (Anatomy) میں ہی جینیاتی انجینئرنگ کا استعمال کر کے انسانوں کی امثال بدلنے کا نظام قائم نہیں کیا بلکہ باٹنی (Botany) میں درختوں اور پھل پودوں کی اشکال بدلنے کی مثال بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کی آیت ملاحظہ فرمائیے:

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَىْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّشَىْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ. (۳۴:۱۶)

''پھر انہوں نے (اطاعت سے) منہ پھیر لیا تو ہم نے ان پر زوردار سیلاب بھیج دیا اور ہم نے ان کے دونوں باغوں کو دو (ایسے) باغوں سے بدل دیا جن میں بدمزہ پھل اور کچھ جھا اور کچھ تھوڑے سے بیری کے درخت رہ گئے تھے۔''(۳۴:۱۶)

نوٹ: سبھی تراجم میں ''سِـــــدْرٍ'' کا مطلب بیری کا درخت لیا گیا ہے جو درست نہیں۔ ہیجان (excitement)، جوش و خروش (enthusiasm)، تحریک (stimulation)، محرک، حوصلہ افزائی (motivation)، منبع (source)، جڑ (root)، نشان علامت (sign)، نکتہ آغاز، نکلنے کی جگہ، الاصل (origin)، جوہر، مادۃ الاصلی (substance)، خلاصہ (abstract)، شیء (object) اور شعور کی فہم ادراک اور تحیر والی حالتوں کو ''سدر'' کہا جاتا ہے۔

لہٰذا بالائی آیت کے ترجمے میں آپ ''سِـدْرٍ'' کے دیئے گئے معانی میں سے جو بھی مناسب سمجھیں لگا سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس آیت کے آخری حصے ''وَشَـــىْءٍ مِّـنْ سِـدْرٍ قَلِيْلٍ'' کا ترجمہ اور تھوڑی سی جڑیں یا نشانی ہونا چاہیے۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَهَلْ نُجٰزِىٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ۔

''یہ ہم نے انہیں ان کے کفر و ناشکری کا بدلہ دیا، اور ہم بڑے ناشکر گزار کے سوا (کسی کو ایسی) سزا نہیں دیتے۔''(۳۴:۱۷)

یہاں یہ بات بھی واضح کر دی گئی جو ہم اپنے مضمون میں بھی بیان کر چکے ہیں کہ عام طور پر ہر ایک کے حشر میں ایسی تبدیلی نہیں ہوتی کہ ان کی زندگی کی شکل ہی بدل دی جائے مگر جن لوگوں کے جرم حد سے بڑھ جائیں اور وہ معافی کے قابل نہ ہوں ان کو سزا دینے کے لئے یہ تبدیلی ناگزیر بھی ہے۔ یعنی قرآن کا نظام ہندوؤں کے روایتی عقائد کی بھی نفی کرتا ہے جو ہر ایک انسان کو موت کے بعد مختلف اقسام کی ان گنت جونوں میں سے گزارے جانے کا تصور رکھتے ہیں لیکن جن بد

بختوں کے جرائم اس زمرے میں آتے ہیں انہیں یہ سنگین سزا بھی مل کے رہتی ہے۔ منطقی طور پر بھی اگر دیکھا جائے تو جن لوگوں نے زمین میں فساد کر کے ناحق خون بہایا، انبیا علیہ السلام کو اذیت پہنچائی، اللہ کے دین میں روڑے اٹکائے، اللہ اور اس کے رسولوں پر جھوٹے بہتان باندھے کیا وہ اس قابل ہیں کہ انہیں دوبارہ بحیثیت انسان ہی اٹھایا جائے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں سارے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں! اور ان درندۂ صفت لوگوں کی نشونما پھر سے جانور یا اس سے بھی نچلے طبقے میں شروع کر کے انہیں درجہ بدرجہ اوپر لایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ اعمال ضائع ہونے کا مطلب گزشتہ زندگی اور اس سے پہلے کی سب شعوری ترقی ختم ہو کر خاک میں مل جا نا ہی ہے۔ اور شعور ہی کسی انسان اور جانور میں تفریق کرتا ہے۔ قرآن اگلی زندگی میں آنے والی کمتر تبدیلیوں کو ہندوؤں کی طرح ہر ایک مرنے والے کے لئے بطور ایک مستقل نظام کے نہیں لیتا بلکہ آنے والی کمتر زندگی سزا کے طور پر صرف اسی کو دی جاتی ہے جو اپنے اعمال کی وجہ سے اس کا مستحق ہو۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے۔

وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ۔(۵٦:۴٦)

''وہ بڑے بڑے گناہ کرنے پر بضد تھے۔''(۵٦:۴٦)

عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔(۵٦:٦۱)

''کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے۔''(۵٦:٦۱)

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ۔

''پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے جنہوں نے سبت کا قانون توڑ کے زیادتی کی تھی۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے۔''(۲:٦۵)

Imam al-Ghazali and Allama Iqbal perceive death as a transformation from one state to another.

امام غزالی اور علامہ اقبال بھی موت کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی کا نام دیتے ہیں۔ گویا موت کے بعد زندگی ختم نہیں ہوتی بلکہ گزشتہ زندگی میں کئے ہوئے اعمال کے مطابق آنے والی زندگی ترتیب پاتی ہے جس پر عمل درآمد کے لئے مرنے کے بعد انسانوں کو ان کی کارکردگی کے حساب سے تین الگ الگ طبقات (categories) میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

وَ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً۔

''اور تم لوگ تین قسموں میں بانٹ دیئے جاتے ہو۔''(۵٦:۷)

(۱)وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ۔

''سب سے اول سب سے آگے ہوتے ہیں۔''(۵٦:۱۰)

اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ۔

''وہ جو اللہ کے مقرب ہیں۔''(۵٦:۱۱)

النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

''انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین ہیں اور یہ رفیق کیسے اچھے ہیں۔''(۴:٦۹)

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔

''نعمتوں والی جنتوں میں۔''(۵٦:۱۲)

یعنی اللہ کے مقربین کو چین اور سکون والی ایسی خوشگوار زندگی عطا ہوتی ہے جس میں ان کو رزقِ کثیر عطا کرنے کے ساتھ ساتھ نعمتوں کی بہتات اور ان کے شایانِ شان زندگی کے دیگر لوازمات بھی بہم پہنچائے جاتے ہیں۔

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ۔

''مرصع تختوں کے۔''(۵٦:۱۵)

مُّتَّكِئِيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ۔

''مقابل نیم دراز (Recline) ہوتے ہیں۔''(۵٦:۱٦)

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ۔

''پھیر کر بچپن ان پر انہیں ٹھہرا دیا جاتا ہے (انہیں بچے کی صورت میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ آ جاتی ہے ان پر بچپن کی زندگی۔)(۵٦:۱۷)

بِاَكۡوَابٍ وَّ اَبَارِيۡقَ وَكَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِيۡنٍ۔

''کپ اور جار، اور گلاس انہیں تفویض کئے جاتے ہیں۔'' (۵۶:۱۸)

لَّا يُصَدَّعُوۡنَ عَنۡهَا وَ لَا يُنۡزِفُوۡنَ۔

''ان میں نہ دراڑ ہوتی ہے اور نہ ہی ان سے بہہ کر کچھ باہر نکلتا ہے۔'' (۵۶:۱۹)

وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوۡنَ۔

''اور پھل جو وہ منتخب کرتے ہیں۔'' (۵۶:۲۰)

وَ لَحۡمِ طَيۡرٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ۔

''اور پرندوں کا گوشت جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔'' (۵۶:۲۱)

نوٹ: بالائی آیات کے مروجہ غلط تراجم نقل کرنے کی بجائے انہیں عربی متن سے آسان فہم اردو زبان میں ترجمہ کرکے لکھ دیا گیا ہے تاکہ آپ ان آیات کو بآسانی سمجھ سکیں۔ ان آیات کے مروجہ تراجم میں مترجمین کے استعمال کردہ واہیات الفاظ ''لونڈے'' اور ''شراب'' صرف ہمارے علماء کے پراگندہ خیالات کا نتیجہ ہیں جو قرآن کے عربی متن کا حصہ نہیں۔ یہ بے ہودہ الفاظ خاص طور پر مغرب کے ہم جنس پرست معاشرے میں قرآن کا غلط پیغام دیتے ہیں جہاں لونڈے اور شراب کا مطلب کچھ اور لیا جاتا ہے۔ **يَطُوۡفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ** (۵۶:۱۷) کے جس لفظ ''وِلۡدَانٌ'' کو ہمارے علماء نے ''لونڈوں'' سے تعبیر کیا ہے اسے قرآن انسانی خلیے کی دوبارہ جنین میں تحویل اور کسی بچے یا بچپن کی زندگی کہتا ہے۔

ط و ف کے بنیادی حروف سے نکلنے والا مصدر ''طوف'' پھرنا (turn)، لوٹنا (return)، کسی حالت کا پیدا ہونا (become-be fall)، کسی چیز کا ہونا (turn into-turn on)، تحویل convert-transform-switch کسی ایک مقام سے چل کر دوبارہ وہیں پہنچنا، تیرنا (floating)، کسی چیز کو گھمانے اور پلٹنے کے معانی دیتا ہے۔ کسی خودکار نظام کو بھی طوف کی مد میں ہی لیا جاتا ہے مثلاً جدید گاڑیوں کو اگر کروز کنٹرول (Cruise Control) پر لگا دیا جائے تو ایکسیلیٹر (excelerator) کو پاؤں سے دبائے بغیر جس رفتار پر چاہیں گاڑی خود بخود چلتی رہتی ہے۔ اس کروز کنٹرول (cruise control) کو عربی میں ''**التحكم في التطواف**'' کہا جاتا ہے۔ ہوائی اور بحری جہاز بھی انہیں اصولوں پر چلائے جاتے ہیں۔ طوف کے معانی سمجھنے کے لئے کسی چیز کو پھیرنے اور آنے کے پس منظر میں قرآن مجید کی یہ آیات بھی ملاحظہ فرمایئے۔

فَطَافَ عَلَيۡهَا طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّكَ وَهُمۡ نَآئِمُوۡنَ۔

''رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی۔'' (۶۸:۱۹ مودودی)

''تو پھر گئی اس باغ پر ایک آفت تیرے رب کی طرف سے جبکہ وہ سو رہے تھے۔'' (۶۸:۱۹ شبیر احمد)

فَاَصۡبَحَتۡ كَالصَّرِيۡمِ۔

''تو وہ ایسا ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔'' (۶۸:۲۰ فتح محمد)

اِنَّ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ۔

''بے شک جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں جب انہیں کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔'' (۷:۲۰۱ احمد علی)

''جو لوگ پرہیزگار ہیں جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو چونک پڑتے ہیں اور (دل کی آنکھیں کھول کر) دیکھنے لگتے ہیں۔'' (۷:۲۰۱ فتح محمد)

جیسے فعل الماضی (past tense) فَعَلَ کو مصدر کے شروع میں 'ی' کا اضافہ کرکے فعل مضارع (present tense) يَفۡعَلُ بنایا جاتا ہے یا كَتَبَ یعنی اس نے لکھا کو يَكۡتُبُ یعنی وہ لکھتا ہے بناتے ہیں بالکل اسی طرح بالائی آیت ۵۶:۱۷ میں طوف سے ''يَطُوۡفُ'' مضارع (present) فعل بنا ہے جس کا مطلب ''وہ پھیرتا ہے۔ وہ لوٹاتا ہے۔ وہ واپس لاتا ہے۔ وہ گھماتا ہے۔ وہ تحویل کر دیتا ہے'' وغیرہ بنتا ہے۔ مگر علماء نے اپنی آتما کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کا مطلب خدمت گار کر دیا۔ **عَلَيۡهِمۡ** کا مطلب آپ جانتے ہیں ''ان پر'' یا ''ان کو''۔ وِلۡدَانٌ میں مذکر و مؤنث کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ وِلۡدَانٌ کو عبرانی میں انسانی بیج ([illegible]) کہا گیا ہے اور عبرانی کا یہ لفظ ([illegible]) عہد نامہ قدیم اور جدید کے صحیفوں بشمول تورات، زبور اور انجیل میں موجود ہے جسے

انسانی خلیہ یعنی نطفہ (seed of men-sperm) اور ''زرع''کہا جاتا ہے۔

חֲזַיְתָ פַּרְזְלָא מְעָרַב בַּחֲסַף טִינָא מִתְעָרְבִין לֶהֱוֺן בִּזְרַע אֲנָשָׁא וְלָא־לֶהֱוֺן דָּבְקִין דְּנָה עִם־דְּנָה הֵא־
פַרְזְלָא לָא מִתְעָרַב עִם־חַסְפָּא׃ (دانیال کی آیت ۲:۴۳ کا ارامی زبان میں اصل متن)

Daniel 2:43New King James Version (NKJV)

As you saw iron mixed with ceramic clay, they will mingle with the seed of men; but they will not adhere to one another, just as iron does not mix with clay.

آپ نے مٹی سے ملا لوہا دیکھا! وہ انسانوں کی بیج کے ساتھ مل جائیگا؛ لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ نہیں ہوں گے، جیسے لوہا مٹی کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ (دانیال ۲:۴۳ نسخہ شاہ جیمز)

احبار کی آیت ۱۹:۱۹ میں بھی ''وِلْدَانٌ'' کو انسانی بیج ''تَـزْرَعْ حَقْلَکَ'' کہا گیا ہے۔اس کا عربی ترجمہ حاضر ہے:

اَحْـفَـظُ شَـرَائِعِي. لَا تُهَـجِّـنْ حَيْـوَانَـاتِکَ مِنْ حَيْوَانَيْنِ مُخْتَلِفَيْنِ. لَا تَزْرَعْ حَقلَکَ بِنَوعَيْنِ مِنَ الْحُبُوْبِ. لَا تَرْتَدِ ثِيَاباً مَصْنُوْعَةً مِنْ مَادَّتَيْنِ مُخْتَلِفَتَيْنِ.

تثنیۃ کی آیت ۲۲:۹ کا عربی ترجمہ بھی ذیل میں ملاحظہ فرمائیے جس میں ''وِلْدَانٌ'' کو ''تَزْرَعْ کَرْمَ'' کہا گیا ہے۔

لا تَزْرَعْ کَرْمَ الْعِنَبِ بِالْحُبُوْبِ، لِأَنَّکَ تَخْسَرُ بَذَلِکَ غَلَّةَ الْعِنَبِ وَمَحْصُوْلَ الْحُبُوْبِ کِلَيْهِمَا.

ارمیاء ۳۱:۲۷، استثنا ۱۶:۱۵، یوحنا ۹:۳، یوحنا ۸:۱، استثنا ۲۱:۱۸، ابتداء ۲۵:۴، ابتداء ۱۵:۳، 1 سیموئیل ۱:۱۱، 2 ملوک ۱:۱۱، 2 الفصل ۷:۲۰، عزریر ۲:۹، استیر ۳:۱۰، عہد نامہ قدیم ملاکی ۲:۱۵، اور یسعیاہ (بنی اسرائیل) ۴:۱، ۴:۵۷ میں بھی یہی بات دھرائی گئی ہے۔

لوقا چونکہ یونانی (Greek) زبان میں نازل ہوئی تھی لہٰذا، وِلْـدَانٌ یعنی انسانی بیج کو یونانی متن میں (σπόρος) سپورس (sporos) کہا جاتا ہے جسے لاطینی میں سیمن (semen) کہتے ہیں۔لوقا: میں اس انسانی بیج (σπόρος) سپورس کو خدا کے الفاظ کہا گیا ہے۔

ὁσπόροςἐστὶνὁλόγοςτοῦΘεοῦ. (لوقا کی آیت ۸:۱۱ کا یونانی زبان میں اصل متن)

بیج خداوند کا حکم ہے (لوقا ۸:۱۱)۔The seed is the word of God(Luke 8:11)

و ل د کے بنیادی حروف سے نکلنے والے لفظ ''وِلْـــدَانٌ'' کو قرآن کی دیگر آیات میں بھی ملاحظہ فرمائیے:

وَالْـمُسْتَـضْـعَـفِيْـنَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِهٖ عَلِيْمًا.

''اور بےبس بچوں کے بارے میں ہے کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر قائم رہا کرو، اور تم جو بھلائی بھی کرو گے تو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔'' (۴:۱۲۷)

فَکَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ کَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا۔

''اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاوَگے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔'' (۷۳:۱۷)

وَمَـا لَکُمْ لَا تُـقَـاتِـلُـوْنَ فِـىْ سَبِيْـلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ۔

''اور کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بےبس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو۔'' (۴:۷۵)

معزز قارئین کرام قرآن سے پہلے صحیفوں کے ساتھ ساتھ ہم قرآنی آیات میں بھی دیکھ چکے ہیں کہ ''وِلْـدَانٌ'' مدارس میں علماء کے اشاروں پر ناچنے والے خدمت گزار لونڈے نہیں بلکہ جنس کی تمیز کے بغیر انسانی بیج، جنین اور چھوٹے بچے ہیں۔مولود اور ولادت بھی اسی بنیادی لفظ ''ولـد'' سے ہی نکلے ہیں جس کا ترجمہ بچے کی پیدائش ہوتا ہے نہ کہ خادم لونڈے کی پیدائش۔ویسے بھی نوکر خادم اور خدمت گزار کے لفظ اس آیت میں موجود نہیں مگر پھر بھی تراجم اور تفسیروں میں خادم اور خدمت کرنے والوں کے الفاظ جڑ دیئے گئے۔اس آیت کا آخری لفظ ''مُّخَلَّدُوْنَ'' بھی دیکھ لیتے ہیں جس کا مطلب ہمیشہ رہنے والے لیا گیا ہے۔ہم نے شائید کبھی غور نہیں کیا کہ ہمیشہ رہنے والا کسی کو کہنا بذاتِ خود شرک ہے کیونکہ ہمیشہ رہنے والی تو صرف اللہ تبارک تعالی کی ذاتِ بابرکات

ہے۔مُّخَلَّدُوْنَ خَلَد سے لیا گیا ہے جس کا مطلب سکونت اختیار کرنا,(abide) زندہ رہنا (to live)،مکین ہونا، قیام کرنا،ٹھہرنا(to stay)، اور کسی چیز کا وجود ایک معینہ اور مقررہ مدت تک برقرار رکھنا(to remain) یعنی کسی چیز کی عمر یا مدت(term time) ہے جو کسی زندگی کے عرصۂ حیات سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔اگر کہا جائے کہ جنتی ہمیشہ جنت میں رہیں گے تو ہمیشہ کا لفظ جنتیوں کے جنت میں قیام کے دورانیئے یعنی ان کی جنتی زندگی کے عرصۂ حیات تک ہی جنت میں ٹھہرنے کا حوالہ ہے۔البتہ اگر وہ راہِ راست پر رہیں گے تو کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتیں جنتیوں کو دیئے جانے والے تحفے کے طور پر ان کی آنے والی زندگیوں میں بھی جاری رہیں گی۔اسی طرح ہمیشہ جہنم میں رہنے کا مطلب بھی زندگی کا ایک عرصہ ہے جس میں اصلاح نہ ہوئی تو ہر آنے والی زندگی میں جہنم بھی جاری رہے گی اور دوزخی اس میں سے کبھی بھی نکل نہیں پائیں گے۔یہ قرآن کی زبان کی خوبصورتی ہے کہ اس میں ایسے مرکب الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے ایک ہی لفظ میں عین گرائمر کے مطابق فاعل، فعل، مفعول اور زمانۂ بیان کے ساتھ جملہ مکمل ہوجاتا ہے۔لہٰذا، مُّخَلَّدُوْنَ میں ''م''ان لوگوں پر رجعت کرتا ہے جن کا بیان چل رہا ہے، خَلَّدُ فعل(verb) کے ساتھ ''وْنَ'' کا اضافہ اس فعل کو مفعولی حالت میں تبدیل کرکے اس میں چھپے ہوئے فاعل کے ذریعے اس فعل کو سرانجام دینے پر دلیل رکھتا ہے اور فاعل اللہ تعالیٰ خود ہیں۔ایسے جملوں کو انگریزی میں passive wise sentenses کہا جاتا ہے۔گویا ''مُّخَلَّدُوْنَ'' کا مکمل مطلب کچھ ایسے بنتا ہے کہ ''انہیں ٹھہرایا جاتا ہے''۔''ان کو رکھا جاتا ہے''۔انہیں بسا دیا جاتا ہے یا وہ بستے (live) ہیں۔

قارئینِ کرام بالائی سطور میں دی ہوئی معلومات کی روشنی میں **یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ**۔(۵۶:۱۷) کا صحیح ترجمہ کچھ ایسے بنے گا:''پھیر کر بچپن ان پر انہیں ٹھہرادیا جاتا ہے۔انہیں بچے کی صورت میں لوٹا کے ٹھہرایا جاتا ہے۔ان کو دوبارہ بچہ بنادیا جاتا ہے۔ان کو انسانی خلیے میں تحویل کرکے رکھا جاتا ہے۔آجاتی ہے ان پر بچپن کی زندگی۔یعنی بات دائیں ہاتھ والے لوگوں کی ہی ہورہی ہے اور اس بیان میں کسی باہر سے آئے ہوئے تیسرے شخص خادم اور لونڈے وغیرہ کو جڑنے کی کوئی گنجائش نہیں۔کوئی مانے نہ مانے قواعد کی رو سے اس بیان کی حقیقت یہی ہے۔

منکرینِ وحی کی لکھی ہوئیں تمام غیر قرآنی تفسیریں مل کر بھی اللہ کے کلام کے حقیقی حوالوں کو نہیں جھٹلا سکتیں۔قرآن سے پہلے صحیفوں میں بھی یہ وحی آچکی ہے اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں بھی بار بار فرماتے ہیں کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا پھر اس بات کو نہ ماننے میں کونسی شے مانع ہے؟ صرف یہ کہ ہمارے علماء اس بات سے متفق نہیں اس لئے ہم بھی قرآن کی بیان کردہ آخرت کو نہیں مانتے۔یہ تو صرف علماء کی ہٹ دھرمی ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہم اللہ کی وحی کو چھوڑ کر علماء کی گھڑی ہوئیں روایات کے پیچھے اندھے بہروں کی طرح چلے جارہے ہیں۔

اسی طرح آیت ۵۶:۱۸ کے عربی متن میں شراب کا لفظ موجود نہیں مگر ہمارے علماء اپنے تراجم اور تفسیروں میں بلاسوچے سمجھے شراب کے پیالے بھر بھر کے جنتیوں کو پلا رہے ہیں جنہیں کوئی یہ بھی پوچھنے والا نہیں کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے کیا یہ واقعی میں قرآن کے تراجم ہیں جن میں کہیں لونڈوں اور کہیں شراب کا ذکر کیا جارہا ہے؟۔اس کے بعد والی آیت ۵۶:۱۹ کے عربی متن میں بھی شراب پینے پلانے، شراب کی بدمستی، فتور اور سر درد کے الفاظ موجود نہیں۔مگر ہمارے علماء اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ ایسی شراب ہوگی جس کے پینے سے نہ تو سر درد ہوگا اور نا ہی بدمستی کی وجہ سے عقل میں فتور آئے گا''۔گویا ہمارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی شراب پینے کی خواہش یہاں نہیں تو آخرت میں ضرور پوری ہوجائے گی ! جبکہ قرآن کے مطابق آخرت کی زندگی حساب کتاب کے بعد پھر دوبارہ اسی دنیا میں ملے گی۔اس لحاظ سے اگر شراب ہماری موجودہ زندگی میں حرام ہے تو آنے والی زندگی میں کیسے حلال ہوجائے گی؟۔عام زندگی میں ہی دیکھ لیجیے کہ اگر آپ شراب نہیں پیتے۔اس کی بو سے بھی نفرت کرتے ہیں اور اگر کوئی آپ کی مہمان داری میں آپ کو قیمتی گلاس میں ہی شراب پیش کردے تو کیا آپ کو اچھا لگے گا؟۔اور کیا آپ اس شراب کے جام کو متبرک شے سمجھ کر چڑھا جائیں گے یا ناگواری کا اظہار کریں گے؟ کاش ایسا ہوتا کہ قرآن کے ساتھ کھلواڑ کرنے والے علماء کی اپنی بدمستی اور عقل کا فتور دور ہوجاتا اور وہ قرآن کی بتائی ہوئی آخرت کو سمجھ سکتے۔آیئے زیر بحث آیات ۵۶:۱۸ اور ۵۶:۱۹ کا تجزیہ کرتے ہیں۔

بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۔(۵۶:۱۸):''اَكْوَابٍ'' کے معنی کپ

(cups) ہیں۔''اَبَارِیْقَ'' کے معانی میں جار، کوزے، گھڑے، صراحی (pitchers) اور جگ (jug) وغیرہ شامل ہیں۔''كَاْسٍ'' عام طور پر گلاس، ٹرافی نما گلاس (goblets) اور پیالہ نما برتن کو کہا جاتا ہے۔''مِّنْ'' از، سے، کے، کے لئے (of-for)۔''مَّعِيْنٍ'' یقینی (certain)، مخصوص (specific)، متعین (specified)، مقرر (appointed)، نامزد (nominated)، مفصل، اشیاء کے حساب سے (itemised) اور واضح۔

صحیح ترجمہ: کپ اور جگ، اور گلاس ان کے لئے مخصوص کر دیئے جاتے ہیں (۵۶:۱۸) یعنی اللہ تبارک تعالیٰ نے آخرت میں کامیاب ہو کر اپنی زندگی کے نئے دور میں داخل ہونے والے ان خوش نصیبوں کے استعمال کے لئے جو خاص برتن مقرر فرمائے ہیں ان کی تفصیل اس آیت میں بتائی جا رہی ہے اور ان برتنوں کی خصوصیات اس سے اگلی آیت (۵۶:۱۹) میں بتائی جا رہی ہیں کہ وہ برتن ٹوٹے پھوٹے اور رسنے (leakage) والے نہیں ہوں گے۔مگر ہمارے علماء نے قرآن کے ان الفاظ کے معانی شراب کے فوارے، ایک دوسرے کے ہاتھوں سے چھلکتے ہوئے جام کی چھینا جھپٹی اور شراب کے کبھی نہ ختم ہونے والے چشموں سے تعبیر کر دیئے۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ (۴۵:۳۷) اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ''انہیں خاص قسم کے پیالے دیئے جاتے ہیں'' مگر اس آیت کے تراجم میں بھی ہمارے علماء نے شراب کے جام چھلکانے سے گریز نہیں کیا جو آپ کی توجہ کے لئے ذیل میں ہو بہو نقل کئے جا رہے ہیں۔ ''يُطَافُ'' اور ''مَّعِيْنٍ'' کے الفاظ کو دیکھ کر گڑبڑانے کی ضرورت نہیں۔ہم ''ط و ف'' کے بنیادی حروف کا بخوبی مطالعہ کر چکے ہیں ''يُطَافُ'' بھی انہیں بنیادی حروف سے ماخوذ ہو کر شروع میں ''ی'' کے اضافے کے ساتھ زمانۂ حال کا جاری فعل بنتا ہے یعنی کسی چیز کا آنا (return-given) اس کو ایسے پڑھیں گے ''وہ لاتا ہے۔وہ دیتا ہے'' وہ لانے والا، دینے والا اور بہم پہنچانے والا کوئی تیسرا شخص نہیں فقط اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے۔اسی طرح ''مَّعِيْنٍ'' کسی چیز کو مقرر (appoint) کرنے اور متعین کرنے کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔وفود کے آنے جانے کو بھی طائفہ ہی کہا جاتا ہے جو ''ط و ف'' کے بنیادی حروف سے ہی ماخوذ ہے۔

مروجہ تراجم کی نقول ملاحظہ فرمائیے کہ اللہ کے کلام کو کیسے بگاڑا گیا؟

ان پر چھلکتی ہوئی شرابِ (طہور) کے جام کا دور چل رہا ہوگا۔(طاہر القادری ۴۵:۳۷)

پھرائے جائیں گے ان کے درمیان جام (شراب کے) چشموں سے بھر بھر کر۔(شبیر احمد ۴۵:۳۷)

شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے۔(مودودی ۴۵:۳۷)

قرآن کی آیت ۷۶:۶ میں تو ہمارے علماء شراب کے ان چشموں کو اٹھا کر اپنے گلی محلوں اور گھروں میں بھی لے گئے۔ان کے تراجم ملاحظہ فرمائیے:

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا۔(۷۶:۶)

یہ ایک بہتا چشمہ ہوگا جس کے پانی کے ساتھ اللہ کے بندے شراب پئیں گے اور جہاں چاہیں گے بسہولت اس کی شاخیں لیں گے (مودودی)۔لا حول ولا قوۃ۔

جس میں سے اللہ کے نہایت خاص بندے پئیں گے اپنے محلوں میں اسے جہاں چاہیں بہا کر لے جائیں گے۔(احمد رضا خاں)۔

قرآن تمثیلی انداز میں اپنی بات سمجھاتا ہے مگر ہماری موٹی عقل قرآن کی بتائی ہوئی مثال کو کسی اور معانی میں لیتی ہے۔ملاحظہ فرمائیے۔

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ۔(۵۲:۲۴)

اور لوٹ آتا ہے ان پر شباب جیسے سیپ میں بند موتی کا (راقم الحروف کا کیا ہوا صحیح ترجمہ)

بنیادی حروف طوف سے نکلنے والے قرآنی لفظ ''يَطُوْفُ'' پر ہم بالائی سطور میں سیر حاصل بحث کر چکے ہیں جسے یہاں دہرانے کی قطعی ضرورت نہیں لیکن اس لفظ کے استعمال کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ لفظ اپنے معانی کے ساتھ ساتھ کسی عمل کو دہرانے (repeat) یا کسی کام کے دوبارہ ہونے پر بھی دلیل رکھتا ہے۔یعنی بالائی آیت میں جن لوگوں پر شباب اور نوجوانی آنے کی بات ہو رہی ہے ان پر شباب اور نوجوانی پہلے بھی آئی تھی۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب یہ لوگ پہلی بار پیدا کئے گئے تھے تب بھی ان پر یہی عمل کیا گیا تھا اور موت کے بعد جب یہ لوگ دوبارہ پیدا ہوئے تو یہی عمل دوبارہ کیا گیا۔گویا ''طُوْفُ'' میں ہر پیدائشِ نو کے بعد بچوں کو

کسی سیپ میں بند موتیوں کی طرح خوبصورتی اور شباب دینے کی بات کی جا رہی ہے۔

اس آیت میں کسی ایک جنس کی بات نہیں کی گئی بلکہ اللہ کے اس قانون کا اطلاق لڑکے اور لڑکی دونوں جنس کے بچوں پر ہوتا ہے مگر لونڈوں کے شباب اور خوبصورتی کے قائل علمائے کرام نے اس آیت ۵۲:۲۴ کے تراجم اور تفسیر قرآن کے الفاظ کی بجائے اپنے دل سے کئے ہیں۔! آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

وَیَطُوْفُ عَلَیْھِمْ غِلْمَانٌ لَّھُمْ کَاَنَّھُمْ لُؤْلُؤٌ مَّکْنُوْنٌ۔(۵۲:۲۴)

اور نوجوان (خدمت گزار) ان کے اِردگرد گھومتے ہوں گے، گویا وہ غلاف میں چھپائے ہوئے موتی ہیں۔(۵۲:۲۴۔طاہر القادری)

اور دوڑتے پھریں گے ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے جوان ہی کے لیے مخصوص ہوں گے گویا کہ وہ چھپا کر رکھے ہوئے موتی ہیں۔(۵۲:۲۴۔شبیر احمد)

اور ان کی خدمت میں وہ لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو انہی کے لیے مخصوص ہوں گے ایسے خوبصورت جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔(۵۲:۲۴۔مودودی)

اور پھرتے ہیں انکے پاس چھوکرے انکے گویا وہ موتی ہیں اپنے غلاف کے اندر۔(۵۲:۲۴۔محمود علی حسان)

اسد، یوسف علی، سرور اور دیگر مترجمین کے تراجم میں بھی یہی کچھ ہے۔اہلِ سنت سے لے کر اہلِ تشیع اور اہلِ حدیث سے لے کر اہلِ قرآن تک کے علماء کی تفسیریں آپ خود پڑھ لیں کیونکہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے پر راقم الحروف کو ڈر ہے کہ غلاف کے اندر موتی جیسے حسین و جمیل لونڈے چھپانے کی تفصیل اور مخصوص کئے جانے والے لونڈوں کے لئے استعمال کی جانے والی عام اصطلاح یعنی ''فلاں کا لونڈا'' منظرِ عام پر آنے سے اس کے معزز اساتذہ کرام کہیں برہم نہ ہو جائیں۔البتہ راقم الحروف کو اگر اجازت مل جائے تو وہ حفظِ قرآن اور تجوید کی تعلیم کے دوران مدرسے میں گزرے ہوئے اپنے سولہ سال کے شب و روز سے پردہ اٹھاتے ہوئے مدرسے کے لونڈوں پر ایک مفصل مضمون لکھنے کا ارادہ ضرور رکھتا ہے۔

مدارس میں تو لونڈے مخصوص تھے ہی مگر جنت میں بھی اپنے لئے خوبصورت لونڈے مخصوص کر لینا قرآن کا ترجمہ نہیں لگتا!۔لہٰذا فی الحال ہم اگلی آیت ۵۶:۱۹ کا تجزیہ کرتے ہیں:

لَّا یُصَدَّعُوْنَ عَنْھَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ ۔(۵۶:۱۹) ''لَّا'' No، Neither، نہ، نہی۔

''یُصَدَّعُوْنَ'' بنیادی حروف ''ص د ع'' سے بننے والے مصدر ''صَدَّ عُ'' سے ماخوذ ہے جس کے معانی ہیں درز Crack، دراڑ، شگاف Rift، کٹا پھٹا Split، نقص Fault اور عیب دار۔

''عَنْھَا'' میں عَنْ کو کسی چیز ''پر'' یا کسی چیز کے ''متعلق'' بات کرنے کے معانی میں لیا جاتا ہے جو اس سے پہلی آیت میں دیئے ہوئے برتن یعنی پیالے، گلاس اور صراحی وغیرہ کی اسمِ ضمیر ھا کے ساتھ مل کر اس آیت میں کہی گئی ہر بات کو گزشتہ آیت میں بتائے ہوئے برتنوں کی طرف منسوب کرتا ہے۔یعنی وہ برتن جو گزشتہ آیت میں بتائے گئے ہیں وہ ٹوٹتے پھوٹے، درزوں والے اور عیب دار نہیں ہوں گے۔''وَلا'' Nor اور نہ ہی۔''یُنْزِفُوْنَ'' بنیادی حروف ن ز ف سے بننے والے مصدر ''نزف'' سے نکلا ہے جس کا مطلب پھوٹ کر بہنا ہے۔تکنیکی اعتبار سے نزف کے معانی Bleed یعنی ''بہہ کر نکلنا'' لئے جاتے ہیں مگر یہ صرف خون نکلنے والا Bleed یعنی haemorrhage ہی نہیں بلکہ ہر مائع شے یعنی کسی بھی طرح کے fluid اور liquid کے بہہ کر نکلنے کو Bleed کہا جاتا ہے۔ہائیڈرالک مشینوں پر کام کرنے والے، مکینک اور انجینئر حضرات Bleed کی اصطلاح سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔جب ہائیڈرالک پمپ یا ہائیڈرالک مشین کا تیل کم ہو جائے تو دوبارہ تیل بھرنے کے بعد Bleeding Point والا نٹ ڈھیلا کر کے تھوڑا سا تیل پریشر سے نکالا جاتا ہے تاکہ مشین میں ہوا بھرنے کی وجہ سے ہونے والا ایرلاک کھل جائے۔ جن لوگوں کے پاس گاڑیاں ہیں وہ بھی اپنی گاڑیوں کی ڈھیلی بریکوں کو کسنے کے لئے گاڑی کا بونٹ کھول کر بریک آئیل والی کپی میں بریک آئیل ڈالتے ہیں اور پھر Hub کے اوپر آنے والے بریک آئیل کے پائپ میں Bleeding کے شگاف پر لگے ہوئے نٹ کو کھول کر لمحے بھر کے لئے بریک آئیل کو بہنے دیتے ہیں تاکہ تیل کے پریشر کے ساتھ نکلنے سے بریک کے نظام کی نالیوں میں موجود ہوا بھی نکل جائے۔اس شگاف کو دوبارہ کس کے بند کر دیا جاتا ہے اور کار کی بریکیں پوری طرح کام کرنے لگتی ہیں۔لہٰذا ''لَا یُنْزِفُوْنَ'' ایسے معیاری برتنوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جن میں ڈالی جانے والی اشیاء بہہ کر باہر نہ نکلیں۔

لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ۔(۵۶:۱۹)

''نہ تو وہ شگاف دار ٹوٹے پھوٹے ہوتے ہیں اور نا ہی ان میں سے کچھ بہہ کر باہر نکلتا ہے۔''(۵۶:۱۹۔صحیح ترجمہ)

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّ لَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ۔(۳۷:۴۷)

مروجہ تراجم:

نہ اس میں کوئی ضرر یا سر کا چکرانا ہوگا اور نہ وہ اس (کے پینے) سے بہک سکیں گے۔(طاہر القادری ۳۷:۴۷)

نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی۔(مودودی۔ ۳۷:۴۷)

نہ اس میں خمار ہو (سر درد) گا اور نہ وہ اسے پی کر بہکیں گے۔(شبیر احمد۔۳۷:۴۷)

''غَـوْلٌ'' کے معانی گندا، برا، قلاش، دج، مکروہ اور عیب دار ہونے کے ہیں۔ نـزف کے بنیادی حروف سے نکلنے والے لفظ ''يُـنْـزَفُوْنَ'' کے بہہ کر نکلنے والے معانی ہم تفصیلاً دیکھ چکے ہیں۔ فیصلہ آپ خود کر لیجیے کہ اس آیت کے مروجہ تراجم جو بالائی سطور میں نقل کئے گئے ہیں وہ کہاں تک درست ہیں۔ اصل متن میں نہ تو سر چکرانے کا لفظ ہے اور نہ ہی خمار چڑھنے یا بہکنے اور عقل کے خراب ہونے کا۔

معزز قارئینِ کرام ہم بالائی آیات کے تجزیاتی مطالعے میں دیکھ چکے ہیں کہ ان آیات میں شراب پینے پلانے اور نشے کے تاثرات کی کوئی بات نہیں کی گئی اور اللہ تبارک تعالیٰ نے ان آیات میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ آخرت میں کامیاب ہونے والوں کو آنے والی معیاری زندگی کی ضمانت دیتے ہیں۔ مگر ان آیات کے تراجم میں ہیر پھیر کر کے اللہ پر آخرت میں شراب پلانے کا بہتان باندھنے والے نالائق علماء نے آخرت میں پلائی جانے والی شراب کو قرآن سے ثابت کرنے کے لئے اس شراب کے پینے والوں کو سر درد، بدمستی اور فتور نہ ہونے جیسی خرافات بھی قرآن کے تراجم اور تفسیروں میں جڑ دیں۔ یعنی بخاری کے سے گھٹیا روایتی انداز میں اللہ پر بہتان بھی باندھ دیا اور اس حرکت کو کسی نے گستاخی بھی نہ سمجھا۔ گویا اللہ آخرت میں شراب تو ضرور پلائے گا مگر ایسے کہ اس کے بدمستی، فتور اور سر درد والے اثرات پینے والوں پر نہیں ہوں گے۔ اگر قرآنی الفاظ کے تراجم میں ہیر پھیر کر کے اللہ پر بہتان باندھنے والی اس گھنانی حرکت پر آپ کا خون نہیں کھولتا اور سچائی جاننے کے بعد بھی آپ ان نالائق علماء کی غیر قرآنی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتے ہیں تو یہ آپ کا اپنا ایمان ہے۔

ہاتھ میں ''تبویب'' پکڑے درسِ قرآن دیتے چلے آرہے ہیں کہ اس غیر قرآنی کتاب میں سے کچھ ڈھونڈ کر خالص قرآن کا درس دیں گے۔ اور کچھ نہیں ملا تو مفہوم اور اس کی جڑواں بہن تفہیم کو پکڑ کے ان سے درس قرآن دینا شروع کر دیا۔ قرآن کے کسی موضوع پر بات کرنی ہے تو ردی کتب و رسائل اور ناکارہ ضخیم کتابوں کی ورق گردانی میں لگے ہوئے ہیں۔ کھانا بار بار گرم ہو کر ٹھنڈا ہوتا رہا۔ نہ کھانا سب کے ساتھ بیٹھ کر کھایا اور نا ہی ضروری کرنے والے کام کئے۔ بیوی نے تھک ہار کے چائے پانی کتابوں کے دسترخوان پر جگہ بنا کے زبردستی رکھ دیا تو یخ پا ہو گئے۔ دکھائی نہیں دیتا کہ میں قرآن پڑھانے کی تیاری کر رہا ہوں! اپنی علمی قابلیت جتانے کے لئے ان کتابوں سے نوٹ پے نوٹ لکھے جا رہے ہے۔ فون کر کے انہیں نالائقوں کے ٹولے میں سے کسی استاد سے مشورہ بھی لے رہے ہیں کہ فلاں لفظ کا مطلب کیا ہوگا اور فلاں آیت کی تفسیر کیسے کریں گے؟ قرآن فہمی پر تقریر کر رہے ہیں تو ہاتھ میں فہم سے خالی ''تفہیم'' پکڑی ہوئی ہے۔ ممبر پر بیٹھے خطبہ دے رہے ہیں تو اللہ اور اللہ کے رسول کے گستاخ ''بخاری'' کی جھوٹی کتاب ہاتھ میں اٹھا کے اس کی قسمیں کھا رہے ہیں۔ اللہ کے بندو! قرآن کہاں گیا؟ اگر تبویب و تفہیم لکھنے والے دورِ جدید کے ''بخاریوں'' کو اتنی عقل ہوتی تو نہ وہ اپنی کتابوں میں اللہ پر بہتانِ عظیم نہ باندھتے اور نہ ہی اپنے مخصوص علمی انداز میں ایسی خرافات لکھتے جن کا نمونہ بالائی سطور میں آپ کے گوش گزار کیا جا چکا ہے۔ ان غیر قرآنی کتابوں سے قرآن پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھیں گے تو آخرت بھی یقیناً خراب ہوگی اور وہ قرآن بھی آپ کو سمجھ نہیں آئے گا جو اپنے بیان کی تفسیر کے لئے اپنے علاوہ کسی اور کتاب کا محتاج نہیں۔

(۲) فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ۔(۵۶:۸)

''پھر دائیں جانب والے۔''(۵۶:۸)

وَ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ۔(۵۶:۲۷)

''اور دائیں جانب والے کیا کہنے دائیں جانب والوں کے۔''(۵۶:۲۷)

فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ۔(۵۶:۲۸)

''وہ خوشی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے نسبی سلسلے میں داخل ہوجاتے ہیں۔(۵۶:۲۸)

وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ۔(۵۶:۲۹)

''اور انہیں زندگی کے نئے قالب دیئے جاتے ہیں۔''(۵۶:۲۹)

وَّ ظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ.(۵۶:۳۰)

''پھر ان کو پروان چڑھا کے ایک مقررہ مدت تک زندہ رکھا جاتا ہے۔''(۵۶:۳۰)

''سِدۡرٍ'' کے معانی میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب ہیجان(excitement)، جوش و خروش(enthusiasm)، تحریک(stimulation)، محرک، حوصلہ افزائی(motivation)، منبع(source)، جڑ(root)، نکتۂ آغاز، نکلنے کی جگہ، سلالہ، نسب(origin)، اصل مقام اور شعور کی فہم، ادراک اور تحیر والی حالت ہے۔ مگر تراجم میں یہ معانی استعمال نہیں کئے گئے۔

''مَّخۡضُوۡدٍ'' خ ض د کے بنیادی حروف سے نکلنے والے مصدر خضد سے ماخوذ ہے جو جانچ پڑتال کے بعد داخلے کی اجازت دینے والے نظام(Entry Clearance) کا حوالہ دیتا ہے۔ لہٰذا کمپیوٹر یا کسی رجسٹر (logbook) وغیرہ میں جو شخص logged in ہو جائے وہ ''مَّخۡضُوۡدٍ'' کہلاتا ہے۔ کمپیوٹر، نیٹ(net) یا کسی رجسٹر(logbook) میں log in کرنے کو بھی خضد کہا جاتا ہے۔ لاگ ان(log in) خواہ ای میل پر جانے کے لئے کریں یا کمپیوٹر سے متعلقہ کسی بھی نظام پر جانے کیلئے کریں آپ کو ایک پاس ورڈ(password) ڈالنا پڑتا ہے جس کی جانچ پڑتال کے بعد ہی آگے بڑھنے کی اجازت ملتی ہے۔ اسی طرح ہماری زیر مطالعہ آیت میں ''مَّخۡضُوۡدٍ'' اعمال نامے(logbook) کی جانچ پڑتال کے بعد دائیں ہاتھ والوں کو اگلے مقام ''سدر'' یعنی ان کے اصل مقام پر بغیر کسی رکاوٹ کے جانے کی اجازت دیتا ہے۔ اس لحاظ سے ''فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ''(۵۶:۲۸) کا صحیح مفہوم یہ بنتا ہے کہ جن لوگوں کو ان جانچ پڑتال کے بعد ان کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں دیئے جاتے ہیں وہ بغیر کسی رکاوٹ کے خوشی سے نعرہ لگاتے ہوئے جنت یعنی اپنی آنے والی انعام یافتہ زندگی کی راہ لیتے ہیں۔ خضد کیونکہ کارکردگی کی کتاب یا اس رجسٹر کو بھی کہا جاتا ہے جس میں کسی مشین کی کارکردگی کا مکمل اندراج ہوتا ہے اس کتاب کو تکنیکی اصطلاح میں لاگ بک (logbook) بھی کہا جاتا ہے۔ بڑی بڑی کمپنیوں کی گاڑیوں کی لاگ بک ہوتی ہے جس میں گاڑی کتنا چلی، اس میں کتنا ایندھن لگا اور اس کی دیکھ بھال اور سروس کا سارا ریکارڈ لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح دیگر مشینوں کی کارکردگی، مرمت اور دیکھ بھال بھی لاگ بک میں درج کی جاتی ہے۔ فلم ساز جب فلم بناتے ہیں تو ہر سین فلم کی لاگ بک میں لکھا جاتا ہے۔ انہیں خطوط پر انسان کی کارکردگی کی لاگ بک خضد کہلاتی جسے ہم نامۂ اعمال بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''مَّخۡضُوۡدٍ'' بھاری(heavy) ہونے کو بھی کہا جاتا ہے۔ ۱۸۸۳ء میں لندن سے شائع ہونے والی ولیم اور نور گیٹ (Williams & Norgate) کی عربی-انگریزی معجم (Arabic-English Lexicon)، امریکی محکمہ تعلیم کے خصوصی تحقیقاتی ادارے دی میکس پلانک سوسائٹی(The Max Planck Society)، ورلڈ کی لغت (world dictionary)، اکیسویں صدی کے معجم (21st Century Lexicon) اور زبانیات(etymology) کے مطابق خضد لاگ ان(log in) اور لاگ بک(logbook) کے علاوہ فرض کی ادائیگی یا ذمہ داری کے احاطے (Area Of Responsibility-AOR)، کسی سرکار کے ریکارڈ کی ایجنسی(Agency Of Record-ARO) اور توثیقی سند کی وصولی (Acknowledgement Of Receipt-ARO) کے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ''فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ '' دراصل نامۂ اعمال میں درج فرائض اور ذمہ داریوں سے با عزت طور پر عہدہ براں ہونے کی توثیقی سند کی وصولی بھی ہے۔ لیجئے ان اعمال کی بات بھی کر دی گئی ''جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ''(۵۶:۲۴) جو اپنے اعمال کے بدلے میں ''فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ '' اگلی منزل کی طرف لاگ ان(log in) کر کے جوش و خروش سے پیش رفت کرتے ہیں۔ عبرانی کے بنیادی حروف ''הדד''(HDD) سے ماخوذ(hedad) سے نکلنے والے عربی لفظ خضد کے معانی خوشی اور جوش و خروش سے نعرہ بلند کرنے کے ہیں۔ خضد کو قرآن سے پہلے

صحیفوں یسعیاہ(۹:۱۶-۱۰)، یرمیاہ(۴۸:۳۳)اورحزقیال(۷:۷) میں shouted cheer یعنی خوشی منانے کا زوردار نعرہ بتایا گیا ہے۔اس عظیم کامیابی پر خوشی کے نعرے بلند کرنا ایک فطری عمل ہے کیونکہ قرآن خود اس مرحلے کو عظیم کامیابی مانتا ہے:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔(۳۷:۶۰)

''بیشک یہی تو عظیم کامیابی ہے۔''(۳۷:۶۰)

وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

''اوران پر نہ کچھ خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔''(۲:۶۲، ۲:۱۱۲، ۲:۲۶۲، ۲:۲۷۴، ۲:۲۷۷، ۳:۱۷۰)

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَ لَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۔(۴۳:۶۸)

''اے میرے اطاعت گزار بندو تم پر آج نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو۔''(۴۳:۶۸)

مگرافسوس کہ ہمارے علماء نے ''فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ'' کے سبق آموز اور نہایت فنی نوعیت والے بیان کو کانٹوں کے بغیر بیری کے درخت میں بدل دیا۔جس سے پڑھنے والے کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اس کے بعد آنے والی آیت ''وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ''(۵۶:۲۹) کو تہہ بہ تہہ کیلوں کے درختوں میں چھپا دیا۔جبکہ ''طَلْحٍ''صرف کیلے ہی کو نہیں کہا جاتا بلکہ یہ بھی فنی نوعیت کا بیان ہے جس کی تفصیل ذیل میں آپ کے گوش گزار کی جا رہی ہے لیکن پھر بھی اگر آپ ''طَلْحٍ''کو کسی شجر سے ہی منسوب کرنا چاہتے ہیں تو کیلا ہی کیوں؟ باٹنی میں سے ڈھونڈ کر ''طَلْحٍ''کو (Acacia) ''ببول''یعنی کانٹے دار درخت کیوں نہیں لیتے؟ جی ہاں ''طَلْحٍ''کو اگر درختوں کے زمرے میں لیا جائے تو وہ صرف کیلے ہی کا نہیں بلکہ کانٹے دار ببول (Acacia) کا درخت بھی کہلاتا ہے۔اور اس لحاظ سے ۵۶:۲۸ کا ترجمہ ہوگا ''کانٹوں کے بغیر بیری میں'' اور ۵۶:۲۹ ''کانٹوں والے ببول میں''مطلب کیا بنا کہ بیری کے کانٹے تو صاف کر دیئے مگر جنتیوں کو ببول کے کانٹوں والے درختوں میں پھنسا دیا۔گویا آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔یہیں سے تو پتہ چلتا ہے ہمارے نابلد علماء کے ناقص علم کا۔اگر آپ کو کسی چیز کا علم نہیں تو کون کہتا ہے کہ آپ قرآن جیسی دقیق علمی کتاب کے تراجم اور تفسیریں کرتے پھریں؟ مگر کیا کریں کوئی اور کام آتا بھی نہیں مفت کی روٹیاں توڑنے، لونڈوں سے بیگار لینے اور ضعیف العقیدہ لوگوں پر رعب جمانے کی بری عادت پڑ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ ''وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ''(۵۶:۲۹) میں کیا فرمایا جا رہا ہے؟

لغت المعانی، رینڈم ہاس کرنر مین، کولین، آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعہ لغات اور امریکہ کی ہیری ٹیج ڈکشنری میں ''طلح''کو Heave کہا گیا ہے جس کے تفصیلی معانی کی نقل اوران کا اردو ترجمہ آپ کے مطالعہ کے لئے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

''طلح''Heave: بڑی بڑی لغات میں ''طلح''(heave) کو سکون کا سانس لینے کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے(heave a sigh of relief)۔اس کے علاوہ ''طلح''کے معانی میں قالب(cast) پوری قوت سے اٹھا کر کھڑا کر دینا (to raise or lift with great effort or force)، پوری قوت سے اٹھا کے باہر پھینکنا، کھینچ کے باہر نکالنا، باہر الٹانا، پیدا کرنا، بڑھانا (to make rise or swell) کسی خاص سمت یا کسی خاص مقام کی جانب متحرک رکھنا (move in a certain direction or into a certain position)، باری سے آنے والے یعنی ایک کے بعد ایک نشیب و فراز (to rise a fall in turn)، بڑے بڑے نشیب وفراز پیدا کرنا(cause to rise and fall heavily) مخصوص راستہ، ہدایتِ خاص یا کسی خاص موقف پر قائم رکھنا(cause to move in a specified way, direction, or position)، منظّم اضافہ اور کمی اور بے قاعدہ متبادل نقل وحمل (to rise and fall in rhythmicallyor spasmodically alternate movements) جیسے لہروں کے نشیب وفراز اور سمندروں کا ابھرنا(the rise and fall of the waves or swell of a sea)، کسی خاص صورتحال سے دوچار کر دینا(to move into a certain situation)، کسی پہلے سے بنی ہوئی چیز کو ختم کر کے اسی مادے(material) سے اس چیز کی نئی شکل وصورت وقالب(casting) میں ڈھال کر تشکیل نو دینے کے لئے اطراف میں منتقلی اور آگے پیچھے کی جانب حرکت دیتے ہوئے (move or cause to move from side to side or back and forth) کسی چیز کو پھینکنا



(a throw , toss, or cast)۔

1- The American Heritage(R) Dictionary, Published by Houghton Mifflin Company.

2- Collins English Dictionary(C) HarperCollins Publishers

3- Collins English 2009(C) William Collins Sons & Co. Ltd.

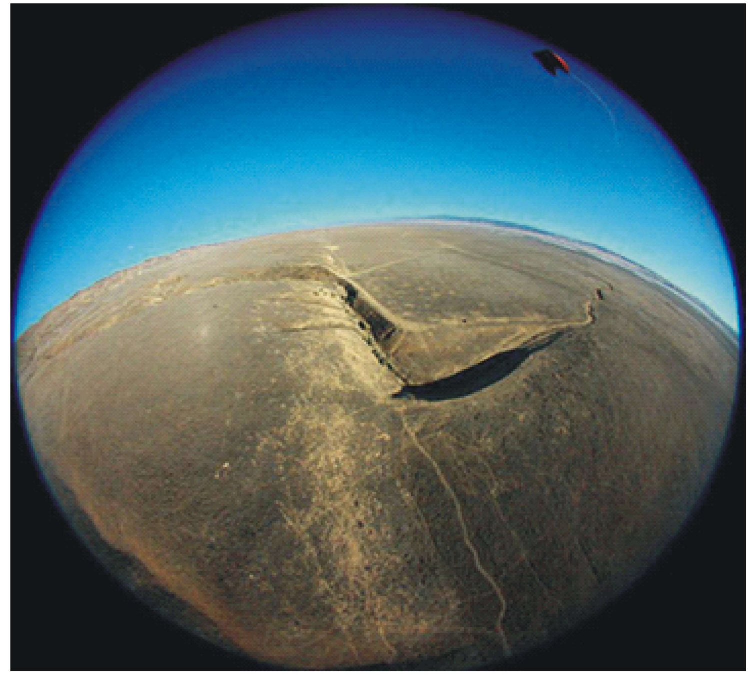
4- Random House Kernerman Webster's College Dictionary,(C) 2010 K Dictionaries Ltd.

5- Medical Dictionary

6- Oxford Dictionary

7- Cambridge Dictionary

"طلح" کی تعریف زمینی سائنس یعنی جیالوجی (Geological Science) میں "کسی فالٹ (Fault) میں سے نقل مکانی کے راستے یا مواقع" (a sideways displacement in a fault) ملنا بتائی گئی ہے۔ فالٹ (Fault) زمین پھٹ کر پڑنے والی ایسی کشادہ دراڑ کو کہا جاتا ہے جس میں اتر کر لوگ اس کے اندر گھوم پھر کے زمین میں حرکت ہونے سے پڑنے والے پھاڑ (torn) کا مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں۔ امریکی ریاست کیلیفورنیا میں ایک ہزار تین سو کلومیٹر تک بڑھ جانے والے سان اینڈریا (San Andreas fault) کے فالٹ کی تصاویر حاضرِ خدمت ہیں:





اگر آپ کسی بھی لغت میں فالٹ (fault) کے مترادفات (synonyms) دیکھیں تو آپ کو غلطی (mistake)، خود کی کرنی (doing)، فرض (responsibility-obligation)، ذمہ داری (liability)، مجرمیت (culpability) یعنی کسی غلطی یا غلط کام کا الزام لگنے کے بعد ہونے والے احتساب میں اخلاقی ذمہ داری کی تکمیل کرتے ہوئے اعترافِ گناہ اور کئے جانے والے گناہ کا بوجھ اور ذمہ داری اٹھانے کے الفاظ کے ساتھ ساتھ احتساب (accountability) کا لفظ الگ سے بھی ملتا ہے۔ اگر فالٹ (fault) کے اس مترادف لفظ احتساب کو جیالوجی میں دی ہوئی "طلح" کی بالائی تعریف میں فالٹ کی جگہ لگا دیا جائے تو "طلح" کی تعریف کچھ اس طرح بنے گی۔ "کسی احتساب (accountability) میں سے نقل مکانی کے راستے یا مواقع" (a sideways displacement in the accountability)۔ یعنی احتساب کے حساب سے ملنے والی زندگی کی طرف جانے والے راستے یا مواقع۔ "طلح" کی اس تعریف کے اطلاق کا مشاہدہ ہم روز کرتے ہیں۔ اسی دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں ایک وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑے رہتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں بے بہا رزق عطا کیا جاتا ہے۔ کسی کو اب بھی ٹوٹے پھوٹے برتن نصیب ہیں اور کوئی سچی چینی کے قیمتی برتنوں میں کھاتا پیتا ہے۔ کسی کو بنیادی ضروریاتِ زندگی بھی میسر نہیں اور کوئی ایسا ہے کہ اس کی رسائی میں دنیا کی ہر اعلیٰ سے اعلیٰ نعمت تک ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اگر غور کریں تو یہ احتساب کے بعد دی جانے والی نئی زندگی کی طرف جانے والے راستوں کا نتیجہ ہی تو ہے۔ جو لوگ اس فرق کو معاشرتی ناانسافی یا معاشرتی ناہمواری سے تعبیر کرتے ہیں انہیں غور و فکر کی دعوت کے ساتھ ایک سوال کا جواب دینے کی درخواست کی جاتی ہے کہ کیا اس معاشرتی ناہموار زندگی میں کوئی انسان اپنی مرضی (choice) سے بھی پیدا ہوتا ہے تاکہ وہ در در کے دھکے کھائے یا وہ لوگ جو تمام تر وسائل کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں کیا ان کے بس میں تھا کہ وہ اپنی مرضی سے وہاں پیدا ہوئے جہاں نام نہاد معاشرتی ناہمواری اور ناانصافی ان کے پاس سے بھی نہیں گزرتی؟ حقائق تو یہ بتاتے ہیں کہ کسی کو اپنے پیدا ہونے پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا مکافاتِ عمل کا وہ نظام ہے جس میں کوئی اپنی گزشتہ زندگی میں کی ہوئیں بداعمالیوں کی وجہ سے اگلی زندگی میں راندہ درگاہ ہو جاتا ہے اور کوئی اپنی راستبازی کے صلے میں فلاح پا کے پھل پھول جاتا ہے۔ اگر ہم جیالوجی کی تعریف میں فالٹ (fault) کو احتساب (accountability) سے نہیں بدلتے تو بھی فالٹ (fault) کا مطلب نقص، خامی اور غلطی لیا جاتا ہے۔ لہٰذا، اس لحاظ سے بھی ہمارے نقائص، ہماری خامیوں اور ہماری غلطیوں سے نکلنے والا راستہ ہی ہمیں طلح یعنی نئی زندگی میں لے کر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نئی زندگی کا راستہ ہی ہماری غلطیوں، خامیوں اور نقائص میں سے نکلے گا تو ذرے ذرے کا حساب ہو کے احتساب خود بخود ہوتا چلا جائے گا اور اسی نسبت سے ہماری نئی زندگی بھی مرتب ہو گی۔ دراصل یہی اونچ نیچ اور معاشرتی ناہمواری کہلاتی ہے جو قدرت کی طرف سے نہیں بلکہ ہماری اپنی کرنی کی بھرنی ہوتی ہے۔ یعنی جو بیج ہم نے کل بویا تھا اسے آج کاٹ رہے ہیں۔ یہی مکافاتِ عمل ہے اور انصاف کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ لہٰذا زمینی سائنس (جیالوجی) نے "طلح" کے معانی کو عملی صورت میں دکھا دیا کہ "طلح" دراصل نئی زندگی مرتب ہونے کو کہا جاتا ہے۔ جس کی توثیق دنیا بھر کی مستند لغات نے بھی پیکر بندی، نئی شکل و صورت اور جسم کی بناوٹ، پوری قوت سے اٹھا کر

کھڑا کر دینے، مخصوص راستوں پر خروج، نشیب وفراز، اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقام کی جانب مزید ارتقائی ترقی کرنے کے لئے اگلی زندگی کی مدت کے الفاظ میں کردی۔ اس لحاظ سے "طـــلـــح" دائیں جانب والے کامیاب لوگوں کو ان کی اگلی زندگی میں ترقی کے مزید مواقع فراہم کئے جانے پر دلیل رکھتا ہے۔ چونکہ قدرت کے نظام میں ہر چیز ہر وقت رواں دواں ہے اور اگر اللہ تبارک تعالیٰ بذاتِ خود فارغ نہیں بیٹھتے تو آخرت میں کامیاب ہونے والے یعنی جنتیوں کی فارغ البالی کا تصور بھی ہمارے دیگر تصورات کی طرح غلط ہے۔

تکنیکی طور پر "طلح" پیکر بندی (Form, shape, Figure, Formation, Image, Configuration)، قالب، شکل وصورت، اوصاف اور وضعیت (configuration)، جسم کی بناوٹ (physique-the form, size, and development of a person's body) جسمانی ساخت (anatomy) کے نظام (system)، طریقہ (method) اور ترتیب (order) کے معانی دیتا ہے۔ عبرانی میں اسے مدت اور شرائط "טווח" (term) بھی کہا جاتا ہے اور اسی عبرانی لفظ "טווח" طوخ کو عربی میں مصطلح کہا جاتا ہے جس کا مطلب ضابطہ، قانون، کلمۃ اللہ (word of God)، اُمر (command-order-decree-ordinance-instruction)، تجلی، مظہر (manifestation)، ظہور (appearance)، اظہار (show)، مظاہرہ (demonstration)، اسلوب التعبیر (Styleof expression)، اسلوب (expression)، عبارت (phrase)، ترکیب تعبیری (Installation ofexpressive)، اندراج، قوانین، قول اور شرائط ہیں۔ عبرانی میں "طـــلـــح" کو "הטווח" Range بھی کہا جاتا ہے جس کا مطلب احاطۂ عمل، الـمـنـطـقـة (Zone)، دائرہ (circle)، دسترس (reach)، رسائی (approach)، علاقہ، میدان، سطح (level-surface)، زنجیر (chain)، تفریحات کا سلسلہ (amusements)، سرگرمیاں، قـطـار الـمـلاهـي (roller-coaster)، تسلسل (Sequence)، سلسلہ (series)، منزل یا اس سے بھی آگے بڑھنے کے لئے تحریک اور درجہ بدرجہ مراحل میں ترقی (progression) کرنا ہے۔ عام طور پر یہ ترقی جونیئر سے سینئر کے رتبے میں لانے کے لئے ہوتی ہے۔ "طـــلـــح" کو ارتقاء، نمو اور ترقی کی جانب پیش قدمی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

باٹنی کے لحاظ سے "طـلـح" کو ببول (Acacia) بھی کہا جاتا ہے۔ عبرانی میں ببول کے لئے "אקקיה" أكـاكي کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ببول کے کانٹے دار درختوں پر جو بیر لگتے ہیں وہ دنیا بھر میں اکیشیا (Acacia) کی بیریوں کے نام سے مشہور ہیں جن کو مغربی ممالک کی خواتین اپنا وزن کم کرنے اور نوجوان دکھائی دینے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔

بیالوجی میں درجہ بندی (taxonomic classification) کے لحاظ سے موسیٰ سی (Musaceae) خاندان کی تین نسلوں میں سے ایک نسل موسیٰ جینس (Musa Genus) کے تحت کیلوں سے مشابہ خودرو جنگلی سبزی پلین ٹائن (plantains) کو بھی طلح کہا جاتا ہے۔ مگر یہ وہ مزے دار کیلے نہیں جنہیں ہم درخت سے اتار کر کھاتے ہیں بلکہ شکل وشباہت میں کیلوں سے ملتی جلتی یہ خام سبزی پکائے بغیر استعمال نہیں جاسکتی۔ طلح یا پلین ٹائن (plantains) کو دو جنگلی انواع موسیٰ اکومینا تا (Musa acuminata) اور موسی بلبی سیانا (Musa balbisiana) کی پیوندکاری سے کاشت کر کے ۱۹۵۵ء میں موسیٰ سی (Musaceae) خاندان کے جینوم کی بنیاد پر نام رکھنے کے نظام Simmonds اور Shepherds کے تحت پیوندکاری سے اگائی ہوئی اس خاندان کی دیگر پیداوار کے ساتھ Musa paradisiaca کا سائنسی نام دیا گیا۔

ہندوؤں میں اس کیلے نما سبزی کو مقدس خیال کر کے اسے پوجا پاٹ اور مورتیوں پر چڑھانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ تامل میں اس کیلا نما سبزی کے بڑے بڑے پتوں کو مقدس مان کے ان میں کھانا پلیٹ کر خود کھانے سے پہلے کوؤں کو ڈالا جاتا ہے۔ اس رسم کو "کاکا شدھم" کہتے ہیں جس کے ذریعے کھانے کا ایک حصہ قدرت کو واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان پتوں پر ڈالا ہوا کھانا دائیں ہاتھ سے پونچھ کر کھایا جاتا ہے اور آخری نوالے پر سنسکرت کی قدیم کہاوت "انا داتا سکھی بھوا" یعنی جس نے یہ کھانا دیا ہے وہ خوش اور تندرست رہے کے شبد کہہ کر اس رسم کا اختتام کیا جاتا ہے۔ ۲۵ فروری سے شروع ہو کر ۵ مارچ تک دھوم دھام سے چلنے والی اتساوابلی درشن کی دس روزہ سالانہ مذہبی تقریبات میں شری ولابھ کے مندر میں موجود بتوں پر ہر سال بارہ ہزار ایک "طـــلـــح" (کیلے نما کچی سبزی) چڑھائے جاتے ہیں۔ جو پالی وتا کی رسوم اور کتھا کلی کے بعد

مورتیوں کے چرنوں سے اٹھا کر زائرین میں پرشاد کے طور پر تقسیم کر دئے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ بنگال میں ہر جمعرات کے دن یعنی گرو وار (جو ہندوؤں کے گروؤں، بھگوان وشنو اور بر یہاسپتی سے منسوب ہے) ہندو پیلے کپڑے پہن کر مشہور بھجن اوم جے جگدیش ہری گاتے ہوئے پیلے رنگ کے طلح مورتیوں پر چڑھاتے ہیں تاکہ ان کے کاروبار میں خیر و برکت ہو اور انہیں کامیابی، دولت، شہرت اور خوشیاں ملیں۔اسی طرح ہندوؤں میں کلاسہ پوجا بھی پیلے رنگ کی کیلے نما اسی سبزی سے کی جاتی ہے۔یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ شادی بیاہ میں ہندو اسی کیلے نما سبزی یعنی "طلح" کے تنوں کو گھر یا منڈپ کے مرکزی دروازے پر دائیں بائیں گاڑتے ہیں تاکہ ہونے والی شادی مضبوط رہے اور دلہا دلہن خوش وخرم زندگی بسر کریں۔ہم بھی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی شادی بیاہ پر کیلوں کے درخت دائیں بائیں گاڑ کر بارات آنے اور جانے کا راستہ سجاتے ہیں۔ہندو تو براہمی دیوتا کو خوش کرنے کے لئے رمبھا پھلم یعنی ہمارے "طلح" کے تنوں کو دائیں بائیں گاڑ کر دروازے اور راستے بناتے ہیں۔مگر ہم تو بالکل بھی نہیں جانتے کہ ہم اپنی تقریبات میں کیلوں کے دروازے اور کیلوں کے درختوں سے بنی ہوئی گزرگاہیں کس نسبت سے بناتے ہیں؟

سنسکرت میں ان کیلوں کو کڈالی کہا جاتا ہے جسے ہندی میں کالا کہا گیا جو بگڑتے بگڑتے اردو میں آ کر کیلا بن گیا۔کڈالی یا کالا یعنی کیلے کے درخت دراصل ہندوؤں کے دیوتا ویلر (ولارا راما لنگا) کا آشیرواد (blessing) لینے کے لئے کسی تقریب کے مقام کے مرکزی دروازے پر لگائے جاتے ہیں۔مگر ہمارے علماء نے مرنے کے بعد دائیں ہاتھ والے کامیاب لوگوں کو بغیر سوچے سمجھے ان کچے کیلوں "طلح" کے درختوں میں بھیج دیا! یہ "طلح" تامی پکانے والے کیلے (cooking banana) ضروری نہیں کہ ہر ایک کو پسند ہوں۔آپ نے بھی یہ کیلے کیلے شاذ ہی کھائے ہوں گے۔اگر انہیں کھانے کا اتفاق ہو بھی جائے تو شائید بار بار ان کی طلب کا شوق نہیں رکھیں گے۔اگر "طلح" کو عام کیلا بھی لیا جائے تو کچھ لوگوں کو کیلے سرے سے ہی پسند نہیں یعنی وہ کیلے کھا تو لیتے ہیں مگر کیلا ان کا پسندیدہ پھل نہیں ہوتا۔راقم الحروف کا بھی یہی حال ہے کہ نہ کیلا پسند ہے اور نہ ہی مردوں کو لگائی جانے والی کافور کی تیز بو مگر علمائے کرام کی معرفت یہ جان کر اس کی جان ضرور ہوا ہوتی ہے کہ اگر اتفاق سے دائیں ہاتھ والوں میں شمار ہو بھی گیا تو اس عظیم کامیابی کے بدلے میں سب سے پہلے تو نہ چاہتے ہوئے بھی کچے کیلے چبانے کے لئے اسے کیلوں کے درختوں میں چھوڑا جائے گا پھر اس کے بعد کافور والی شراب سے استقبال اور خاطر تواضع ہوگی......!

வள்ளற்பெருமான்வள்ளலார்வாக்குLord vallar Live vote

A pair of plantain trees tied at the main entrance of the venue of the function:

"வாழையடி வாழை என வந்த திருக்கூட்ட மரபினின் தான் ஒருவன்"

Vallalar Ramalinga Adigal said that he had born in a tribal group whose generation is like that of plantain after plantain in a sequence.

ولارا راما لنگا ادیگال نے کہا تھا کہ اس کا جنم جس قبیلے میں ہوا تھا اس کی نسل سبزی نما کیلوں پر بعد میں آنے والے کیلوں یعنی کیلوں کی تہوں کے سلسلے کی طرح ہے۔اس لحاظ سے ولارا راما لنگا ادیگال کا بیان قرآنی بیان "وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ"(۵۶:۲۹) کے بھی قریب تر ہے۔

مگر ہر مذہب میں یہی کچھ ہوتا رہا یعنی کسی نے بات کچھ کہی مگر مذہب کے ٹھیکے داروں نے اسے اپنی مرضی سے کسی اور رنگ میں لے لیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ولارا راما لنگا نے Plantain یعنی ان کچے کیلوں کو کسی نسل کے بچوں کی پیدائش کے پے در پے سلسلوں کے مطلب میں لیا تھا جو قرآن میں بیان کئے ہوئے "طلح" کا صحیح مفہوم ہے۔شادی کے موقع پر لگائے جانے والے "طلح" کے درختوں کے علامتی نشان بھی اس شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچوں کے سلسلے کا حوالہ دیتے ہیں۔مگر ولارا کے آشیرواد اور ان کیلوں کے پوجا پاٹ میں غلط استعمال نے ولارا کے اصل بیان کو دبا دیا جو اس نے طلح کے ضمن میں دیا تھا۔گویا جو اصل بات سمجھائی گئی تھی لوگ اسے چھوڑ کر بے بنیاد رسومات اور توہم پرستی کی طرف مائل ہو گئے۔یہی حال ہمارے یہاں بھی ہوا۔بجائے اس کے کہ یہ سمجھا یا جاتا کہ اس آیت میں طلح سے کیا مراد ہے فقط کیلوں کے درخت کہہ کر ہمارے علماء آگے بڑھ گئے جس سے قرآن پڑھنے والے قارین کو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔قرآن پر اتنی ضخیم کتابیں لکھنے کے باوجود ہمارے تمام مکاتبِ فکر کے قدیم وجدید

علماءمل کربھی اس دولفظی آیت ''وَطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ''(۵۶:۲۹) کاوہ مطلب نہیں سمجھا پائے جو غیروں نے طـلـــح(Plantain) کی صرف ڈیڑھ سطر کی مختصرسی تعریف میں سمجھا دیا۔ملاحظہ فرمائیں:

வாழையடி வாழையாக குடும்பம் செழிக்க வேண்டும் என
வாழ்துவதற்காக வாழையை முன்னிலை படுத்துகின்றனர்!

پلین ٹین (قرآنی طـلـــح جسے ہندو''ولائتی'' بھی کہتے ہیں) کیلے کاایک ایسادرخت ہے جو پھل دینے کے سونپے گئے کام کومکمل کرنے کے دوران اگراپنی زندگی کھودےتو وہ اپنی بنیاد کی سطح پر موجودکئی پرتوں کی وجہ سےفوری طور پردوبارہ اگنےلگتاہے۔

Plantain is a plant which grows many folds at the root level immediately when the main tree loses life by completing the task of giving plantain fruits, Bananas.

لہٰذا،''وَطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ''(۵۶:۲۹) کاحقیقی مفہوم بھی یہی ہے کہ انسان کیلوں کی طرح اپنے اندرموجودقدرتی نظام کی وجہ سے دوبارہ زندہ کردیئے جاتے ہیں۔یعنی انہیں مرنے کے بعد زندگی کے نئے قالب دیئے جاتے ہیں۔

''طلح'' کےقرآنی مفہوم کوسمجھنے کے بعد''مَنۡضُوۡدٍ'' کامفہوم سمجھنے کے لئے اس کے بنیادی حروف''ن ض د'' سے بننے والےمصدرنضدکےپس منظرمیں ''مَنۡضُوۡدٍ'' کےدرجِ ذیل معانی کا مطالعہ کرنا ہوگا: حصے اکٹھا کرنا، اجزاء جوڑنا(compose)،تخلیق کرنا(to create)،جمع کرکے جوڑ دینا(to combine)، یکجا کرنا(unite)، باہم ملانا(put together)،تشکیل دینا، تصنع، خوشنمابنانا (make up)،قائم کرنا، شکل دینا (constitute)، شامل کرنا، مشتمل ہونا (comprise)، پہلے سےلکھا ہوا(set type)،ازنوع،تعین نوع(arrange)،انتظام، مجموعہ (array)، ترتیب دینا (put in order)، جمع (accumulate)، نظم (organise)، نظام (discipline)، پیش کرنا(presentation)، گھاٹ (embankment)، پشتہ (stack)، تودہ(pile)اورڈھیر(heap)۔

بالائی سطورمیں درج کئے گئےمعانی کےعلاوہ''مَـــنۡـــضُـــوۡدٍ'' کااصل بنیادی مطلب (primary meaning) کمپوز کرنا(compose) ہے۔کتابت اور طباعت میں کمپوز کرنے کا لفظ عام استعمال ہوتا ہے۔موسیقی بھی کمپوز کی جاتی ہے۔شاعراپنے خیالات اورتصورات کوکمپوز کرتے ہیں۔لکھاری اپنے الفاظ سے جملے کمپوز کرتے ہیں۔دوا کی بھی کمپوزیشن ہوتی ہے۔ سائنس میں کمپوز اور ڈی کمپوز کی اصطلاحات عام استعمال ہوتی ہیں۔کمپوز کا لفظ جہاں جہاں استعمال ہوتا ہے اگراس پرغورکیا جائے تو اس کی تعریف میں ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ ''اجزاءکوترکیب سے جوڑکرکسی شےکووجود دینا۔کسی شے کے وجودکوتشکیل دینااورکسی شےکوتخلیق کرنا'' ہے۔اگر یہاں انسان کوکمپوز کرنے کی بات ہورہی ہےتو یقیناً اللہ تعالیٰ انسان کوڈی کمپوز (موت) ہونے کے بعدپھرسےکمپوزکرتے ہیں۔

لہٰذا،''وَطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ''(۵۶:۲۹) کامفہوم کچھ ایسا بنے گا''اورانہیں مقررہ مدت کی زندگی کے نئے قالب دیئے جاتے ہیں۔مقررہ مدت کے لئے انہیں جوڑکرزندہ کردیاجاتاہے۔ اوراعمال کے حساب سےان کی اگلی زندگی ترتیب دی جاتی ہے۔اوران کے اجزاباہم ملاکرانہیں ازسرِنوتشکیل کیا جاتا ہے۔اورایک مدت کے لئے انہیں اکٹھا کردیا جاتا ہے۔اوران کوایک مقررہ وقت کے لئے زندگی کا نیا پیکرعطا کیا جاتا ہے۔اورموت کے بعد ایک معینہ مدت کے لئے انہیں دوبارہ زندہ کردیا جاتا ہے۔اوروہ نئ زندگی میں سکون کا سانس لیتے ہیں۔'' بالائی سطور میں دیئے ہوئے تمام معانی لگاکرترجمہ کریں گےتو اس آیت کا مفہوم آپ پرواضح ہوتا چلا جائے گا۔

''وَطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ''(۵۶:۲۹) میں جس نئ زندگی کے ملنے کی بات کی جارہی ہےاس میں دو باتیں اوربھی سمجھنابہت ضروری ہیں اول یہ کہ یہ زندگی خالصتا جسمانی ہوگی روحانی یابغیرجسم کے نہیں ورنہ اس زندگی کی مشابہت کے لئے ''طـلـح'' کالفظ ہی استعمال نہ کیا جاتا جس کا پس منظر بذاتِ خودنرم گودہ یعنی انسانی جسم اورمرنے کے بعداسی درخت کی تہہ سے دوبارہ پیدا ہوکر بڑھنا انسان کی انسان سے پیدائش اوراس کے بعدنشوؤنما پانے کےعمل کی مکمل وضاحت ہے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگلی زندگی بھی ہمیشہ(eternal) کے لئےنہیں بلکہ موجودہ زندگی کی طرح ایک معینہ مدت کے لئے ہی دی جائے گی جو''طـلـح'' اوراس کےمتبادل عبرانی لفظ طوخ کے بنیادی معانی(primary meaning)مدت(term) سےمشروط ہےیعنی ہمیشہ کے لئےنہیں بلکہ صرف

محدود متعین وقت تک کے لئے ہے۔

قارئینِ کرام جب قرآن مجید کے مرکب الفاظ کو ترجمہ کرنے کی غرض سے کھولا جاتا ہے تو ترجمے کے الفاظ قرآنی الفاظ سے یقیناً زیادہ ہو جاتے ہیں جن سے پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اکثر اوقات قرآن کے ایک ہی مرکب لفظ میں پوری گرائمر یعنی فاعل (subject)، فعل (verb)، امدادی فعل (helping verb)، مفعول (object)، حروفِ جر (prepositions)، حروف ربط (conjunctions)، صفت (adjective)، اسم (noun) اور اضمائر (pronouns) وغیرہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتے ہیں جو تراجم میں الگ کر کے لکھنے کی وجہ سے الفاظ میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ''مَنْضُوْدٍ'' میں بھی شروع کا ''م'' اس مختصر سے جملے میں موجود ضمیر کا اشارہ دیتا ہے اور مصدر نضد کی مفعولی حالت (passive wise) سے اس جملے میں چھپے ہوئے فاعل کے ذریعے اس فعل کو سرانجام دیئے جانے کی بات بھی کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ''مَنْضُوْدٍ'' کے معانی میں ان کو جمع کرنا اور اکٹھا کرنا قرآنی لفظ ''حشر'' کے معانی میں ہے جس میں روح اور جسم کا مجموعہ یعنی انسان اپنی اجزائے ترکیبی کے ساتھ اکٹھا کر کے یا جمع کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمایئے جن میں ''حشر'' سے مراد اکٹھا کر کے دوبارہ زندہ کرنا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ. (۲:۲۰۳)

''اور تمہیں اس کی طرف جمع کیا جاتا ہے۔'' (۲:۲۰۳)

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ. (۳:۱۵۸)

''اور اگر تم مر جاؤ یا مارے جاؤ تو اللہ کے حضور اکٹھے کئے جاتے ہو۔'' (۳:۱۵۸)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔

''اور اللہ پر پکا ایمان رکھو جس کی طرف جمع کیے جاتے ہو۔'' (۵:۹۶)

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا۔

''اور اگر ہم ان پر فرشتے بھی اتار دیں اور ان سے مردے باتیں بھی کریں اور ان کے سامنے ہم ہر چیز کو زندہ بھی کر دیں تو بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں۔'' (۶:۱۱۱)

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى۔

''کہا کہ اے میرے رب تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا۔'' (۲۰:۱۲۵)

اس سے اگلی آیت ''وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ'' کے تراجم اور گھنی چھاں میں، اور لمبے سایوں میں، اور ہمیشہ کے سائے میں، اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں میں بیان کئے جاتے ہیں جو منطق اور بیان دونوں اعتبار سے غلط ہیں۔ منطق کی رو سے اس لئے غلط ہیں کہ جب سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی بلاتخصیص ہر ایک پر پڑتی ہے خواہ کوئی خدا کو مانے یا نہ مانے۔ آسمان سے پانی برستا ہے تو اس میں بھی یہ نہیں دیکھا جاتا کہ پانی کس پر برسے اور کس پر نہ برسے۔ ہوا چلتی ہے تو سب پر چلتی ہے۔ جب بادل آتے ہیں تو وہ سب کو دھوپ سے سایہ فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح درختوں اور وجود رکھنے والی دیگر اشیاء کا سایہ بھی سب کے لئے برابر ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمایئے:

ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا۔

''اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔'' (۱۶:۵۸ اور ۴۳:۱۷)

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ۔

''ان کے اوپر بھی آگ ہوتی ہے اور نیچے بھی ہوتی ہے۔'' (۳۹:۱۶)

بالائی آیات میں ظل کے معانی ''بدلنا'' (turn) اور کسی چیز کے ''ہونے'' (become) کے ہیں۔

اس کے علاوہ رہنا (reside) باقی رہنا (remain) اقامہ (stay) توقف (halt) رکھنا (keep) برقرار رکھنا (retain) تشکل من جدید (retrain) شکل، وضع اور حالت بھی ظَلَّ کے معانی میں آتے ہیں جو "ظ ل ل" کے بنیادی حروف سے ماخوذ ہے۔ مگر ہمارے علمائے کرام نے قرآن کے عربی لفظ ظل کو فارسی ظل سبحانی اور ظل ہما سے اٹھایا اور قرآن کے تراجم غلط کر دیئے۔

"م د د" کے بنیادی حروف سے نکلنے والے لفظ ''مَّمْدُوْدٍ'' کے معانی دراز (Elongated)،

توسیع (extension)، رہائی، چھوٹ (release)، پروانہ (license)، اجازت نامہ (permit)، اطلاق (application)، منتقلی، گزارنا (pass) جگہ لینا (take place)، مظبوطی، تقویت (reinforce)، نگہداشت (sustain) مدد (support)، سامنا (withstand)، بلند کرنا (amplify)، پھیلانا (spread)، مدت (term) اونچا کرنا بڑھانا اور نشوونما دینا ہیں۔

فَاَتِمُّوْآ اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰی مُدَّتِهِمْ۔

''سوان کا عہد مقررہ مدّت تک پورا کرو۔'' (۹:۴)

وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا۔

''اور اس کو بڑھنے والا مال دیا۔'' (۷۴:۱۲)

فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ۔

''اونچے ستونوں میں۔'' (۱۰۴:۹)

وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (۵۶:۳۰) ان کو پروان چڑھایا جاتا ہے ایک مقررہ مدت تک باقی رکھنے کیلئے۔ یعنی اس آیت میں بھی ایک بار پھر مقررہ مدت کی بات کردی گئی جو ہمیشہ کی زندگی والے تصور کی نفی کرتی ہے۔ قرآنی آیات، مستند لغات اور بیان کے تسلسل کی روشنی میں اس آیت کا صحیح مفہوم قریب قریب ایسا ہی بنتا ہے۔ لمبا سایہ اور گھنی چھاؤں والے تراجم قرآن کی اس آیت کے اصل مفہوم کو واضح نہیں کرتے۔

(۳) وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ۔ ''اور بائیں طرف والے۔'' (۵۶:۹)

وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ۔ (۵۶:۴۶)

''بڑے سے بڑے گناہوں میں ملوث۔'' (۵۶:۴۶)

فِیْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ۔

''پریشان حال در بدر زہر آلود زندگی اور خراب انجام۔'' (۵۶:۴۲)

سَمُوْمٍ: زہر (Toxins)، سڑنا، بوسیدگی، زوال (Decay)، تباہ و برباد ہونا (Destroy)، گلنا اور درہم برہم ہو جانا (Decompose)، الجھن، پریشانی (Chaos)، بے ترتیبی، افراتفری (Clutter)، سمجھ کی کمی، پریشانی، تذبذب (Confusion)، اضطراب (Mess up)، پنگا (Jumble) خراب، بدعنوان، فاسد (Corrupt)، مہلک زہر (Poison)، جس پر زہر ڈالا جائے (Envenom)، نشئی (Intoxicate)، زہر آلود کرنا (Empoison)۔

حَمِيْمٍ: مقرب (Close)، سینہ (Bosom)، گود (Lap)، ضرب (Hit)، کوڑے مارنا، کوڑا (Whip)، نشاط (Take-off)، اٹھا (Rise)، چڑھنا، سوار ہونا (Embarkation)، نسب، نسل سے آنا، اترنا (Descent)، اتارنا، (Landing)، اصول (Principle)، بنیاد (Base)، نسب، سلالہ، صل (Origin)، شجرالعائلہ (Root)، ماں باپ (Parents)، سلالہ (Seed)، ذری (Offspring) نسل (Lineage, Generation, Parentage) پرورش کرنا (Breed)، اولاد (Progeny)، نسل، تخم، جنین، بچے، ذری، سلال (Strain, Race, LineProgeny, Genealogy)، (Seed, Offspring, Children, Breed, Lineage)، نتیجہ (Result)، انجام (Consequence, Outcome)، حاصل (Score)، عاقبت (Conclusion)۔

وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ۔

''اور ان کا نسب بدل دیا جاتا ہے۔'' (۵۶:۴۳)

''ظِلٍّ'' کے تفصیلی معانی بالائی سطور میں ملاحظہ فرمایئے جو نئی شکل میں اور نئے ماحول میں زندہ کر کے اٹھانے پر دلیل رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کی آیات ۳۹:۱۶، ۱۶:۵۸ اور ۱۷:۴۳ بھی اوپر نقل کی گئی ہیں جن میں ''ظِلٍّ'' کے معانی بدلنا (turn) اور کسی چیز کے ہونے (become) کے ہیں۔ ''يَّحْمُوْمٍ'' بھی ''حَمِيْمٍ'' کی طرح ''ح م م'' کے بنیادی حروف سے ماخوذ ہے۔ بالائی سطور میں ''حَمِيْمٍ'' کے معانی کا اطلاق ''يَّحْمُوْمٍ'' پر بھی بعینہٖ ہوتا ہے۔ ''يَّحْمُوْمٍ'' کے شروع میں ''ی'' کے ساتھ المضارع (present) کی مفعولی (passive) حالت میں بذریعہ فاعل (اللہ) اس عمل کو سرانجام دینے کا بیان ہے۔ اس آیت کے بھی ''سیاہ دھوئیں کے سائے'' والے سبھی تراجم غلط ہیں۔

لَّابَارِدٍ وَّ لَا كَرِيْمٍ۔ (۵۶:۴۴)

''جس میں نہ ذہنی سکون ہوتا ہے اور نہ کوئی عزت۔'' (۵۶:۴۴)

''بَـارِدٍ'' ٹھنڈک اورراحت کوبھی کہاجاتا ہے جومعانی کےلحاظ سےمروجہ تراجم میں غلط نہیں بالکل درست ہےمگر''بَــارِدٍ'' کےسائنسی معانی جوعلم حیاتیات(Biology) میں(pituitary) کی نسبت سے pituitary body کے دیئے گئے ہیں وہ بیان اور سیاق وسباق کے اعتبار سے یہاں زیادہ موضوں معلوم ہوتے ہیں۔ pituitary وہ مرکزی endocrine غدود ہے جو نہ صرف پورے جسم کی نشوؤنما کو قابو(control) میں رکھتا ہے بلکہ جسمانی صحت (physical health)، دماغی صحت(mental health)اورنفسیاتی حالت (psychological condition) کا تعلق بھی اسی غدود(gland) کے ساتھ جڑا ہے۔جب صدمے، مصیبت اور پریشانیاں وارد ہوتی ہیں تو اس گلینڈ کی کارکردگی(function) میں فرق آنے سےجسم کی نمومیں بھی فرق پڑتا ہے جو نا صرف کئی طرح کی جسمانی بیماریوں کو دعوت دیتا ہے بلکہ ذہنی بیماریوں مثلاً ڈپریشن اور ذہنی تناوغیرہ کا راستہ بھی کھول دیتا ہے جس سے لڑائی جھگڑے اور کشیدگی جیسے کئی معاشرتی مسائل پیدا ہوکرزندگی کوعذاب بنادیتے ہیں اورانسان زندہ درگور ہوجاتا ہے۔

اس سے اگلی آیت اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ (۵۶:۴۵)''بےشک وہ اس سے پہلےخوش حال تھے۔'' پہلے آنے والی آیت وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ۔(۵۶:۴۳)''اوران کا نسب بدل دیا جاتا ہے۔'' میں ان کا نسب اور خاندان بدلنے کےمفہوم کی تصدیق کرتی ہے۔یعنی خوشحال خاندان سے آئے ہوئے بداعمال لوگوں کواگردوبارہ پیدا کرکےاسی خاندان میں اسی نسب کےساتھ واپس بھیج دیا جائے تو نہ انہیں ان کی بداعمالی کی کوئی سزا ملے گی اور نا ہی ان پر کچھ خاص فرق پڑیگا۔گویا اگر وہ آسودہ حال خاندان سے آئے تھےدوبارہ اسی میں واپس جا کرآسودہ زندگی گزاریں گے۔دوسرے الفاظ میں جوعیش وعشرت اورآسودہ حالی چھوڑ کر وہ مرے تھے وہی انہیں دوبارہ مل گئی۔فرق صرف اتنا پڑا کہ ان کا خطاب(title) بدل گیا۔یعنی اگر پہلے وہ کسی کے باپ تھےاور مرنے کے بعد اپنا سارا مال ومتاع اپنی اولاد کے لئے چھوڑ گئے تو دوبارہ اسی اولاد کے گھر پیدا ہوکےاس مال ومتاع اورخوشحالی کے پھر سے وارث بن گئے۔لہٰذا،۵۶:۴۳ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ بداعمال لوگوں کےنسب تبدیل کرکےاسی خوشحالی اورآسودگی میں ان کے واپس جانے کا راستہ بند کردیا جاتا ہے جہاں سے وہ آتے ہیں۔قرآن انہیں لوگوں کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ موت کے بعد واپس نہیں جاسکیں گے۔اگر ہم ۵۶:۴۳ میں سلسلۂ نسب تبدیل ہونے کا مفہوم نہیں لیتے تو پھر ۵۶:۴۵ کے اس بیان کا کوئی جواز نہیں کہ مرنے سے پہلے یہ لوگ خوشحال زندگی گزار رہے تھے کیونکہ خوشحالی تنگدستی کی ضد ہےاوراگرکسی کوسزا کےطور پر مفلس قلاش، بوسیدہ، زہرآلود اوردربدر کے دھکے کھانے والی زندگی دینا مقصود ہوجیسا کہ فِـــىْ سَـمُــوْمٍ وَّ حَـمِيْـمٍ۔(۵۶:۴۲)''پریشان حال دربدر زہرآلودزندگی اورخراب انجام۔'' میں بتایا گیا ہےتو اس کا سلسلۂ نسب بدل کر اسے کسی ایسے نچلے طبقے کے گھر میں پھینکنا ناگزیر ہے جہاں خوشحالی اور آسودگی کا نام بھی نہ ہو۔اگرسلسلۂ نسب نہیں بدلا جاتا تو گرم ہوا، کھولتا ہوا پانی اور سیاہ دھوئیں کا سا یہ اس شخص کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ ان سب باتوں کا تعلق مفلسی سے ہےخوشحالی سے نہیں۔لہٰذا، اس عنوان کی تمام آیتوں کے سبھی تراجم اور تفسیریں سو فیصدی غلط ہیں۔خیال تو تھا کہ باقی کی آیات کے تراجم بھی درست کر کے لکھ دیئے جائیں مگر اس مضمون کی طوالت یہاں اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔زندگی رہی تو پورے قرآن کا صحیح ترجمہ اورحقیقی مفہوم مرتب کر کے آپ کی خدمت میں پیش کردیا جائیگا تا کہ قرآن کی حقیقی تعلیمات منظرعام پرلائی جاسکیں۔اس کام کے لئے آپ کے اخلاقی تعاون اورحوصلہ افزائی کی اشد ضرورت ہے۔

ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کو اس کے اعمال کے مطابق تین اقسام (categories) میں تقسیم کیا گیا ہےاورموت کی گھڑی ہی وہ قیامت کی گھڑی ہے جوہم سے زیادہ دور نہیں۔اس گھڑی کے آتے ہی انسان بلا تاخیر ایک ایسے احتسابی نظام کی سپرداری میں چلا جاتا ہے جو مقربینِ اللہ یعنی اعلیٰ مرتبے والی جلیل القدر شخصیات،''اَصْـحٰبُ الْمَيْمَنَةِ''یعنی دائیں طرف والے نیکوکاروں اور''وَاَصْـحٰـبُ الْـمَشْـئَمَةِ''یعنی بائیں طرف والے بڑے گناہ گاروں کی نشاندہی کر کے انہیں الگ کرتا ہے۔

مقربین میں وہ لوگ آتے ہیں جن کا شعور ترقی کی تمام منازل طے کر کے اس مقام تک پہنچ جائے جس کے بعد زمین پر واپسی کی بجائے لا مــکــان اور لا بــعــاد سے اگلی منزل **البعدالقادم**(next dimension) کی طرف پرواز کرتے ہوئے انسان اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ہم غیرقرآنی نظریات کی رو میں بہہ کرخواہ اس حقیقت کوتسلیم کریں یا نہ کریں مگر قرآن تو

یہی کہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ۔

''اے انسان تو یقیناً اپنے رب کے پاس پہنچنے کی تگ ودو کر کے اس سے جا ملتا ہے۔'' (۸۴:۶)

کوئی خصوصی فریضہ سرانجام دینے کے لئے مقربین میں سے اگر کسی ہستی کو استثنائی طور پر کسی مقررہ مدت کے لئے دنیا میں بھیج دیا جائے تو اس کے ساتھ دنیا میں بھی جنتیوں والا سلوک ہی کیا جاتا ہے اور وہ مقرب ہستی اپنے فریضے کی ادائیگی کے بعد سیدھی اعلیٰ سطح (Upper Dimention) میں چلی جاتی ہے۔ جو نظام مقربین کو اپنی سپرداری میں لیتا ہے اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخصیات اس سطح پر پہنچ جائیں ان کا حساب کتاب نہیں ہوتا! جی ہاں...... یقیناً حساب کتاب یعنی احتساب سے کوئی مبرا نہیں اور واقعی میں ذرے ذرے کا حساب ہوگا۔ مگر مقربین کو انعام و اکرام والے اگلے مقام پر ترقی دینے سے پہلے باقی کے دونوں زمروں (categories) میں شمار کئے جانے والے لوگوں کی طرح ان کے حساب کتاب اور نامہِ اعمال کی جانچ پڑتال کرنے کا کوئی حوالہ بھی نہیں ملتا۔ یعنی اللہ تبارک تعالیٰ کا مقرر کردہ احتسابی نظام دائیں اور بائیں جانب والوں کے حساب کتاب کے بعد ان کے نامہِ اعمال سامنے سے دائیں جانب سے اور پیچھے سے بائیں ہاتھ میں دے کر انہیں اچھی یا بری اگلی زندگی میں بھیج دیتا ہے مگر مقربین کا حساب کتاب کون کرتا ہے اور ان کے نامہِ اعمال کہاں جاتے ہیں اور ان کو کیسے دیئے جاتے ہیں؟

ان معقول سوالوں کے جواب ہمارے علماءِ کرام کے بس کی بات نہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت ایک ہی بار حشر کے میدان میں عدالتِ عالیہ لگا کر سب کا اکٹھا حساب لیں گے اور ان کے اعمال کے مطابق جزا اور سزا کا تعین فرما دیں گے۔ جنتیوں کو ہمیشہ کے لئے جنت میں بھیج دیا جائے گا اور دوزخیوں کو آگے پیچھے سے ہانکتے ہوئے ہمیشہ کے لئے دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا۔ گویا ہم نے اللہ تعالیٰ کو بالکل فارغ کر دیا۔

ان سوالوں کے جواب قرآن کی روشنی میں نہایت شفاف اور واضح انداز میں ملتے ہیں۔ مقربین کے مقام تک پہنچنے کے لئے کئی زندگیوں کا سفر اور ہر زندگی کے اختتام پر حساب کتاب کے بعد جب شعور ترقی کرتے کرتے احتسابی نظام کی مقرر کردہ اقدار (default values) سے آگے نکل جاتا ہے تو وہ شعور اس نظام سے بھی آزاد ہو جاتا ہے جو اعمال کی جانچ پڑتال کے بعد نامہِ اعمال انسان کے ہاتھ میں پکڑا کے اسے اپنے شعور کی مزید ترقی کے لئے واپس دارالعمل یعنی دنیا میں بھیجتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظام بھی ان جلیل القدر مقربین کو بخوبی پہچانتا ہے کیونکہ وہ خود اس نظام کا حصہ ہوتے ہیں۔ ویسے تو مقربین میں فرشتے بھی آتے ہیں لیکن اگر فی الحال اس مقام پر پہنچنے والے انسانوں کی بات ہی کی جائے تو انبیاء علیہ السلام اور ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے والے سچے مصلحین اس زمرے میں آتے ہیں جو اپنے شعور کی انتہائی ترقی یافتہ منزل پانے کے بعد خود اس نظام کا حصہ بن کر دوسرے لوگوں کو شعور کی ترقی کے راستے پر گامزن کرنے میں ہمہ تن گوش مصروف رہتے ہیں۔ لہٰذا مقربین جو السابقون السابقون بھی ہیں وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اعلیٰ مقام (higher dimension) کی طرف ترقی کرتے ہیں جس کو قرآن **فَمُلٰقِیْہِ۔** (۸۴:۶) کہتا ہے۔ جبکہ مقربین کے علاوہ باقی کی دونوں اقسام (categories) یعنی دائیں اور بائیں اطراف والوں کو ان کے شعور کی مزید ترقی کے اہداف (targets) کے ساتھ دنیا میں واپس بھیج دیا جاتا ہے جن میں سے ایک ہم بھی ہیں اور ہر وہ شخص جو آج دنیا میں دکھائی دے رہا ہے درحقیقت دائیں اور بائیں اطراف ''**اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَۃِ**'' اور ''**وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَۃِ**'' میں سے ہی ہے۔ قرآن مجید کی آیات ملاحظہ فرمائیے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیْنِہٖ۔ (۸۴:۷)

''پھر جس کا نامہ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جاتا ہے۔'' (۸۴:۷)

فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ (۸۴:۸) اس آیت کے سبھی تراجم میں کچھ ایسے لکھا ہے:

''تو عنقریب اس سے آسان سا حساب لیا جائے گا۔'' (طاہر القادری)

''تو اس سے آسانی کے ساتھ حساب لیا جائے گا۔'' (احمد علی)

''اس سے عنقریب سہل حساب لیا جائے گا۔'' (احمد رضا خان)

''سو ضرور حساب لیا جائے گا اس سے آسان حساب۔'' (شبیر احمد)

''اس سے حساب آسان لیا جائے گا۔'' (فتح محمد جالندھری)

''تواس سے حساب لیں گے آسان حساب۔'' (محمود الحسن)

''اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔'' (مودودی)

تراجم، تفسیر اور قرآنی لغات ترتیب دینے والے زیادہ تر لوگ وہ ہیں جنہیں ضَـــرَبَ کے معانی مارنے کے علاوہ کچھ اور نہیں آتے۔ ان کے بعد آنے والے لوگ وہ ہیں جنہوں نے خالص قرآنی تعلیم کے نام پر قرآنی الفاظ کے معانی اور ان کی تفسیر کیموزنم سے مستعار لے کر لوگوں کو خوب بے وقوف بنایا۔ قرآن کے مفہوم کو بگاڑ کے پیش کرنے میں سب سے زیادہ ہاتھ انہیں کا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے نام نہاد علمی اندازِ بیاں سے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں پر قرآن کے نام پر ڈاکہ ڈالا۔ یہی بات بالائی آیت ۸۴:۸ کے تراجم اور تفسیروں میں دکھائی دیتی ہے جن میں (ح س ب) کے بنیادی الفاظ سے نکلنے والے مصدر حســب سے ماخوذ اس آیت کے دونوں لفظوں یُـحَـاسَـبُ اور حِسَـــابَـا کا ترجمہ ''حساب'' کیا گیا اور تفسیر میں اسے روزِ قیامت کامیاب ہونے والے لوگوں کی کامیابی کے بعد ان کا دوبارہ اس سے بھی بڑا حساب کتاب ہونے سے تعبیر کیا گیا۔ ان لوگوں کی نیت پر اگر شک نہ بھی کیا جائے تو پھر دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ ان نام نہاد عالموں نے انتہا درجے کی لاعلمی اور قرآن سے ناواقفیت ہونے کی وجہ سے یہ سب کچھ لکھا۔ کسی کو اچھا لگے یا برا مگر یہ حقیقت ہے کہ جو علم انسان کے پاس آج ہے وہ ماضی میں نہیں تھا اور یہی حال مستقبل میں بھی ہوگا لیکن قرآن کے فیصلے اٹل ہیں جو نہ کبھی بدلے ہیں اور نہ ہی بدلیں گے خواہ ان کی کتنی ہی الٹی سیدھی تعبیر کر دی جائے۔ اس آیت کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے حســب کے معانی پر غور کرنے کی ضرورت ہے پھر اس آیت میں استعمال ہونے والے الفاظ کی تشکیل (formation of the sentence)، گرائمر اور سیاق و سباق کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس آیت کا مفہوم کھل کر ہمارے سامنے آ سکے۔ حسب کے لغوی معانی مندرجہ ذیل ہیں:

پر (on)، تخصیص (customisation)، ضرورت کے تحت، (حسبِ ضرورت)، کسی چیز کے مطابق، عملاً (pursuant to)، شمار کرنا (Numerate)، گننا (count)، درج کرنا (to register)، پابند (restriction)، حد (limit)، قید، زنجیر، بیڑی، پیدا کرنا (pique)، شکل (figure)، عذاب (Chastise)، اذیت دینا، صعوبت (panalise)، چابک (horsewhip)، پٹائی (thrash)، کوڑے لگانا (flog)، سزا دینا (to punish)، عائد کرنا (charge)، عمل درآمد (administer)، تخمینہ لگانا (guess)، تفکر میں (excogitate)، معائنہ (inspect)، آزمائش (trial)، امتحان (test)، باز پرسی، جانچ پڑتال (checkup)، جائزہ لینا (review)، انداز، اسلوب، مروجہ طریقہ کار، پکڑ، جوابی کاروائی، انتقام (relatiation)، جواب دہی (accountable)، عناصر (elements)، خیال کرنا، دھیان رکھنا (consider)، سمجھنا، کسی بات کا گمان کرنا۔ غور کرنا (think)۔ توقع کرنا (to expect)، کافی ہونا (enough)، کافی (sufficient)، آفت، مصیبت (calamity)، مقدار، پیمائش (measure)، بقایا جات (dues)۔ معاملات (accounts)، کارکردگی (performance)۔

تصریفِ آیات سے یُحَاسَبُ اور حِسَابَا کے معانی سمجھنے کیلئے قرآن مجید کی چند آیات بھی حاضرِ خدمت ہیں:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ۔ (۲:۲۱۴)

''کیا تم جنت میں داخل ہو جانے کے گمان میں ہو؟۔'' (۲:۲۱۴)

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ۔ (۲:۲۷۳)

''غلط خیال کرنا۔'' (۲:۲۷۳)

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ۔

''اور بیشک ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبانوں کو مروڑ لیتے ہیں تاکہ تم ان کی الٹ پھیر کو بھی کتاب کا حصہ (سمجھو)۔'' (۳:۷۸)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ۔ (۳:۱۴۲)

''کیا تم یونہی جنت میں داخل ہونے کے گمان میں ہو؟۔'' (۳:۱۴۲)

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا۔

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں ہرگز مردہ خیال نہ کرو۔'' (۳:۱۶۹)

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔

''اور کافر یہ گمان ہرگز نہ کریں۔'' (۳:۱۷۸)

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ۔

''اور وہ نہ خیال کریں۔'' (۳:۱۸۰)

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ۔

''پس آپ انہیں ہرگز عذاب سے نجات پانے والا نہ سمجھیں۔'' (۳:۱۸۸)

وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔

''اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔'' (۷:۳۰)

وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔

''وہ یہ خیال کرتے رہے کہ کوئی خرابی نہیں آئی۔'' (۵:۷۱)

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا۔

''سو کیا تم نے یہ خیال کر لیا تھا کہ ہم نے تمہیں بے کار (و بے مقصد) پیدا کیا ہے۔'' (۲۳:۱۱۵)

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ۔

''پس اس کے لئے جہنم کافی ہے۔'' (۲:۲۰۶)

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔

''کافی ہے ہمارے لیے اللہ اور وہی بہترین کارساز ہے۔'' (۳:۱۷۳)

وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا۔

''اور اس پر مصیبت بھیج دے۔'' (۱۸:۴۰)

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

''اور اللہ جس کو چاہتا ہے بیشمار رزق دیتا ہے۔'' (۲:۲۱۲)

فَوَفّٰهُ حِسَابَهٗ۔

''بقایاجات چکا دیتا ہے۔'' (۲۴:۳۹)

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۔(۸۴:۸) کے شروع میں لگا ہوا لفظ ''**فَسَوْفَ**'' (will) گرائمر کے لحاظ سے مستقبل قریب میں ہونے والے عمل کا حوالہ دیتا ہے۔ جبکہ اس سے پہلی آیت **فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ** (۸۴:۷) میں ان لوگوں کا نامۂ اعمال حساب کتاب کر کے دائیں ہاتھ میں دیا جا چکا ہے۔ پھر مستقبل قریب میں اور کونسا حساب کتاب ہونا باقی ہے؟ اگر ان لوگوں کے ہاتھ میں جنت میں داخلے کا گرین کارڈ تھمایا جا چکا ہے تو دوبارہ حساب کتاب والی بات تو ایسی ہی ہوگی جیسے امتحان کا نتیجہ نکلنے کے بعد کسی امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبا کو کہہ دیا جائے کہ انہیں دوبارہ امتحان دینا ہوگا۔ وہ اس غیر منصفانہ اعلان سے خوش ہوں گے یا غمگین؟ جبکہ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ انہیں کوئی غم نہیں ہوتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے علماء کی عقل کے دانے بک جاتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے قرآن کو سمجھا ہی نہیں۔ اور پھر عنقریب آسان حساب کتاب ہوگا سے کیا مراد ہے؟ وہ حساب کتاب جس میں ذرے ذرے کا شمار کیا جاتا ہے اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے کیا رکھا اور کیا چھوڑا جائے گا؟ حساب کتاب کو اگر امتحان مانا جائے تو اس میں آسانی صرف نقل مار کے یا ''بوٹی'' چلا کے ہو سکتی ہے اگر یہ دونوں کام نہیں ہوتے تو پھر رشوت یا وہ سفارش چلتی ہے جسے کچھ علماء شفاعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جی ہاں!......شفاعت کا دروازہ کھولنے کے لئے عنقریب ہونے والے حساب کتاب میں آسانی کا نظریہ گھڑا گیا۔ مگر افسوس کہ جو لوگ شفاعت کو نہیں مانتے ان کی بھی عقل ماری گئی اور انہوں نے بھی اسی غلط ترجمے کی بنیاد پر اپنی طرف سے عین غیر قرآنی تفسیر لکھ دی جس کے بعد ان کے پیروکاروں نے اپنی عاقبت خراب کرنے کے لئے اس کی اشاعت و تبلیغ بھی شروع کر دی۔ گویا غلطی در غلطی ہوئی جسے سدھارنے پر نہ تو کوئی ناشر راضی ہے اور نہ ہی ان غیر قرآنی نظریات کو عین قرآن بنا کر ان کا درس دینے والے صحیح بات لوگوں کو بتانے پر تیار ہیں۔ اگر کسی کو بات سمجھ آ بھی جائے تو جواب دیا جاتا ہے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں ہم اسے مانتے ہیں کہ وہ صحیح ہے مگر لوگوں کو سمجھائیں کیسے؟ کیا ہمارے نبی ﷺ نے بھی یہی کہا تھا کہ بات تو ٹھیک ہے مگر لوگوں تک پہنچاؤں کیسے؟

حسب کے معانی جو بالائی سطور میں درج کئے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اطلاق ہماری دنیاوی زندگی پر ہوتا ہے۔ یعنی حسب کے پس منظر میں حساب کتاب کے علاوہ اور بھی بہت سے معاملات آتے ہیں جنہیں ہم اپنی کم علمی کی وجہ سے نظر انداز نہیں کر سکتے ورنہ ایک

لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہونے کا کوئی مطلب نہیں مثلاً حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ۔(۳:۱۷۳) میں حساب کتاب کی بات نہیں کی جارہی بلکہ کہا جارہا ہے کہ معاملات کو استوار کرنے میں اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر (sufficient) کوئی اور نہیں۔اگر حسب کو account بھی کہا جائے تو settle the account کا مطلب معاملات طے کرنا ہوتا ہے حساب کتاب کرنا نہیں۔اسی طرح کسی بات کو توجہ میں لانے اور کسی بات پر غور کرنے کو بھی عام زبان میں taking into account کہا جاتا ہے حساب کتاب کرنا نہیں کہتے۔ اسی لفظ کو کسی کے کھاتے (account) میں کوئی چیز ڈالنا کسی پر بوجھ ڈالنے یا کسی کے سر پر کوئی چیز مڑھنے کے معانی میں لیا جاتا ہے نہ کہ حساب کتاب کی مد میں جبکہ کھاتہ بھی حساب (account) سے ہی ماخوذ ہے۔منطقی طور پر بھی زیرِ مطالعہ آیت میں حساب کتاب کرنے کا بیان نہیں کیونکہ حساب کتاب ہونے کے بعد ہی نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا گیا۔اگر حساب کتاب نہیں ہوا یا مستقبل قریب میں ہوگا تو بغیر حساب کتاب کے دائیں ہاتھ یا بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دینے کی تخصیص اور اس بات کا تعین کیسے ہوگیا کہ کون جنتی اور کون دوزخی ہے یعنی کون آخرت میں کامیاب رہا اور کون ناکام رہا؟

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَهْ۔

”جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا وہ کہتا ہے کہ آ ؤ میرا نامہ اعمال پڑھو۔“(۶۹:۱۹)

اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ۔(۶۹:۲۰)

”مجھے یقین تھا کہ مجھے ضرور میرا حساب ملے گا۔“(۶۹:۲۰)

فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ۔

”وہ خوشگوار زندگی بسر کرتا ہے۔“(۶۹:۲۱)

فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ۔(۶۹:۲۲)

”بلند و بالا جنت میں۔“(۶۹:۲۲)

قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ۔(۶۹:۲۳)

”جس کے خوشے جھکے ہوئے۔“(۶۹:۲۳)

كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ۔(۶۹:۲۴)

”کھاؤ اور پیو ان کاموں کے بدلے میں جو تم نے گزشتہ دنوں میں آگے بھیجے تھے۔“(۶۹:۲۴)

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَهْ۔(۶۹:۲۵)

”اور جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو کہے گا اے کاش میرا اعمال نامہ نہ ملتا۔“(۶۹:۲۵)

وَ لَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ۔(۶۹:۲۶)

”اور مجھ کو خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے۔“(۶۹:۲۶)

یٰلَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ۔(۶۹:۲۷)

”ہائے کسی طرح موت ہی قصہ تمام کر دیتی۔“(۶۹:۲۷)

مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ۔(۶۹:۲۷)

”میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔“(۶۹:۲۸)

هَلَکَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ۔(۶۹:۲۹)

”مجھ سے میری حکومت (طاقت) بھی جاتی رہی۔“(۶۹:۲۹)

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ۔(۶۹:۳۰)

”اس کو پکڑو پھر طوق ڈالو۔“(۶۹:۳۰)

ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ۔(۶۹:۳۱)

”پھر اسے جہنم میں جھونک دو۔“(۶۹:۳۱)

قرآن کی بالائی آیات ثابت کرتی ہیں کہ نامۂ اعمال دائیں اور بائیں ہاتھ میں پکڑانے سے پہلے حساب کتاب کیا گیا اور نامۂ اعمال پکڑاتے ہی جزا و سزا کا تعین ہوا یعنی دائیں ہاتھ والوں کو انکی انعام یافتہ زندگی میں بھیج دیا گیا اور بائیں ہاتھ والوں کی بداعمالیوں پر انہیں جہنم رسید کر دیا گیا۔اس کے بعد بھی فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۔(۸۴:۸) کے تراجم اور تفسیر میں اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ جن کو نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا گیا ان کا عنقریب ایک اور آسان

حساب کتاب ہوگا تو وہ عالم نہیں احمق اور جاہل ہے جو خود بھی قرآن سے انحراف کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کا درس دیتا ہے۔

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۔(۸۴:۸) کا مزید تجزیہ کیا جائے تو ''**فَسَوْفَ**'' کے شروع کا حرف ''ف'' کسی شے پر زور دینے (emphasis)، تاکید اور انتہائی اہمیت کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے ضرور (must) اور یقیناً (certainly) کے معانی میں لیا جاتا ہے۔ ''**سَوْفَ**'' مستقبل قریب کا صیغہ (helping verb) ہے جو ''**يُحَاسَبُ**'' کے مستقبل یعنی اس کی آنے والی زندگی میں کچھ ہونے کا حوالہ دیتا ہے۔ ''**يُحَاسَبُ**'' جوابدہ کو کہا جاتا ہے یعنی جس کی حال ہی میں جواب دہی یا حساب کتاب ہوا ہے۔ اس آیت میں اسے ''**يُحَاسَبُ**'' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔

''**حِسَابًا**'' کھڑا ہونا (standing)، حالت (state-condition-situation) ساخت (building-construction)، چوکھٹا (frame)، حدود اربع، باقی بچی ہوئی شے سے کسی حالت میں کچھ قائم کرنا (enumeration)، جدول (table)، کیلنڈر (calendar)، فہرست (listing)، کھاتہ (accounts) اور شکل وصورت (face) کے معانی میں آتا ہے جس کی مزید تفصیل قاموس کے الفاظ میں ایسے دی گئی ہے: چھلانگ لگا کر یا چلتی دوڑ میں شامل ہوکر آغاز کرنا۔ of a jump or a start in a running race، کارکردگی کی ساکن یا مستقیم (راست۔ نیکوکار) حالت۔ performed from rest or an upright position

''**حِسَابًا**'' کی تشریح اگر سائنس کی نظر سے کی جائے تو انسانی جسم کی سائنس علم الاعضاء (anatomy) میں ''**حِسَابًا**'' کو انسانی ڈھانچہ (skeleton-chassis-shell)، جسم کی بنیاد، تعمیر اور سہارا (bodywork-support-foundation) کہا جاتا ہے۔ علمِ حیاتیات (biology) میں ''**حِسَابًا**'' کو حیات کی تبویب (classification) کہا جاتا ہے جس سے کسی کے خاندانی جنیات یعنی حسب نسب مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے ہم گفتگو میں یا لکھنے میں نسب کے ساتھ حسب لگاتے ہیں بعینہ اللہ نے بھی ان کامیاب لوگوں کو ان کے اپنے ہی نسب میں واپس بھیجنے کے لئے ''حب نسب'' کے الفاظ استعمال کر لئے تو اس میں عنقریب دوبارہ حساب کتاب والی بات کہاں سے آ گئی؟ اس سے اگلی آیت ۸۴:۹ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنے اہلِ خانہ میں یعنی اپنے حسب نسب میں واپس بھیجنے کی واضح الفاظ میں توثیق بھی کر دی۔

وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا۔(۸۴:۹)

''اور وہ اپنے اہلِ خانہ کی طرف خوشی سے مسرور واپس آئے گا۔''(۸۴:۹)

Andturnedto his familyhappy (84:9)

لہٰذا، زیر مطالعہ آیت **فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا** ۔(۸۴:۸) میں عنقریب دوبارہ حساب کتاب ہونے کی بات نہیں کی گئی بلکہ یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ عنقریب یعنی ان کی آنے والی زندگی میں پیش آنے والے معاملات کا خیال رکھا جائے گا تاکہ انہیں طے کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے علاوہ جس کی جواب دہی یعنی حساب کتاب کیا جا چکا ہو وہ بھی ''**يُحَاسَبُ**'' کہلائے گا۔ عنقریب یعنی آنے والے حالات ''**حِسَابًا**'' کہلائیں گے اور ''**يَّسِيْرًا**'' ان میں آسانی پیدا کرنے کے معانی میں استعمال کیا جائے گا۔

سائنسی توضیع (ScientificDistributoion) اور حیاتیاتی تبویب (biological classification) کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بھی اس آیت کا رواں مفہوم کچھ ایسے بنے گا: خیال رکھا جائے گا کہ اس کی اگلی منزل آسان ہو جائے۔ خیال رکھا جائے گا کہ اسے مستقبل میں کافی آسانی ہو۔ مستقبل میں اس کی آسانی کو ملحوظ خاطر رکھا جائیگا۔ اس کی اگلی زندگی کافی آسان ہوگی۔ اس کی آسانی کا خیال کیا جائے گا۔ اسکی ضروریات کا خیال رکھا جائیگا۔ اس کے اعمال کے مطابق آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کا دنیاوی بوجھ آسان ہو جائے گا۔ اس کی آنے والی زندگی کے معاملات بآسانی طے ہو جائیں گے۔ قرآن مندرجہ ذیل آیات میں ان سہولتوں اور آسانیوں کی تصدیق بھی کرتا ہے۔

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ۔(۸۳:۲۴)

''پہچان لئے جاتے ہیں سہولتوں میں پلنے والے ان کے صحت مند چہرے۔''(۸۳:۲۴)

You will see from their faces pleasure and ease (83:24)

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ۔(۸۲:۱۳)

''بیشک نیکوکار ضرور چین میں ہوتے ہیں۔''(۸۲:۱۳)

Surely the righteous are in ease (82:13)

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۔(۸۴:۸) کا سائنٹیفک مفہوم:

اس کی تشکیل اس کے خاندانی جینیات سے کی جائے گی اسکی آسانی کے لئے۔اس کی زندگی کا ڈھانچہ کھڑا کیا جائے گا اس کے خاندانی سلسلۂ نسب کی تبویب سے تاکہ اسے موروثی سہولت مل سکے۔اسے اپنے حسب ونسب سے اٹھایا جائے گا تاکہ اسے خاندانی سہولیات میسر ہوسکیں۔

غور فرمایئے! انجینئر جس نے اپنے ہاتھ میں ایک پرزہ پکڑا ہوا ہے کبھی پرزے کو دیکھتا ہے تو کبھی سامنے پڑی مشین کو۔اس کا ساتھی پاس سے گزرتے ہوئے اس انجینئر سے پوچھتا ہے کیا کر رہے ہو؟ انجینئر برجستہ جواب دیتا ہے، ''میں حساب لگا رہا ہوں کہ یہ پرزہ کیا اسی مشین کا ہے؟''

گتے کے کٹے ہوئے ٹکروں پر مشتمل آدھی بنی ہوئی نامکمل پہیلی (jigsaw puzzle) سامنے میز پر پڑی ہے جس کے بچے ہوئے ٹکڑوں کو ابھی جوڑنا باقی ہے۔ان ٹکڑوں کو جوڑنے والا بغور دیکھ رہا ہے۔پوچھنے والا اگر پوچھے کہ کیا کررہے ہو تو جواب ہوگا کہ حساب لگا رہا ہوں کون سا ٹکڑا جوڑا جائے۔گویا وہ انجینئر جو مشین اور اس میں لگنے والے پرزے کا حساب لگا رہا ہے یا پہیلی کو مکمل کرنے کے لئے جو شخص اس کے بچے ہوئے ٹکڑوں کا حساب لگا رہا ہے وہ دراصل اس مشین کے پرزے اور اس پہیلی کے ٹکڑوں کو پہچاننے کی کوشش کررہا ہے۔لہٰذا ''**حِسَابًا**'' کا مطلب یہاں پر پہچاننا لیا جائے گا۔اس لحاظ سے ''**حِسَـابًـا يَّسِيْرًا**'' کا صحیح ترجمہ ہوگا پہچاننے میں آسانی کیلئے اور پوری آیت ''**فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا** ''(۸۴:۸) کا صحیح ترجمہ ہوگا ''اس کی تشکیل نو اپنی خاندانی شکل وصورت کے حساب سے کی جائے گی تاکہ اسکی پہچان میں آسانی رہے۔''

تبویب لکھنے والوں کو بھی شائید یہ علم نہیں تھا کہ علم الاعضاء (anatomy)، علم الحیاتیات (biology) اور **علـم الورا ثـه** (genetics) میں حسب کو انسان کی تبویب کہا جاتا ہے ورنہ وہ بھی اپنی تفسیروں میں نام نہاد علمی قابلیت جھاڑنے اور ادھر ادھر کی ہانکنے کی بجائے سیدھی بات لکھ جاتے۔مگر تعجب کی بات ہے کہ یہ تبویب اہلِ قرآن کے یہاں ایسے پڑھی جاتی ہے جیسے اہلِ حدیث کے یہاں قرآن کی بجائے بخاری۔

یہی مسلمہ حقیقت بھی ہے کہ بچہ اپنی خاندانی شکل وصورت پاتا ہے اور اسی سے وہ پہچانا جاتا ہے۔یہی اس کا حسب نسب، یہی اس کی اناٹومی (anatomy) یعنی جسمانی ساخت اور اسی طریق پر اس کی حیات (biology) یعنی جینیات اور خلیات تشکیل پاتے ہیں۔موجودہ دور میں اگر کسی کے بچے کی پہچان کرنی ہو تو ڈی این اے (D.N.A) ٹسٹ کیا جاتا ہے جو یہ سب کچھ تفصیل سے کھول کر رکھ دیتا ہے جو اس عظیم الشان آیت میں اللہ تبارک تعالیٰ فرمارہے ہیں۔اس کے علاوہ کسی خاندان میں عام طور پر سب کی شکلیں اور عادت واتوار کسی حد تک ایک دوسرے سے ملتے ہیں جو ان کی پہچان ہوتے ہیں۔جس میں یہ بات نہیں ہوتی وہ اس خاندان سے باہر کا آیا ہوا معلوم ہوتا ہے جس کی تفصیل پہلی آیات میں دی جا چکی ہے کہ وہ لوگ جن کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جاتا ہے وہ اپنے اہل خانہ کے پاس واپس نہیں لوٹتے۔**وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ**۔''اور ان کا نسب بدل دیا جاتا ہے۔''(۵۶:۴۳) مگر ایمان والے لوگ اپنے اہلِ خانہ سے ملا دیئے جاتے ہیں۔**وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَابِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ**۔''اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ہم نے ان کی اولاد ان سے ملا دی۔''(۵۲:۲۱)

معزز قارئینِ کرام آخرت پر ایمان لائے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا اور آخرت پر ایمان وہ نہیں جو ہمارا موجودہ نظریہ ہے۔آخرت پر ایمان اس بات پر کامل یقین رکھنا ہے کہ انسان موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔اس کا حساب کتاب ہوگا اور اس نے اپنی گزشتہ زندگی میں جو اعمال کئے تھے ان کے مطابق اس کی اگلی زندگی مرتب ہوگی۔کسی بھی وجہ سے، کسی مصلحت کی بنا پر یا اس خیال سے کہ اگلے اور پچھلے جنم پر ایمان رکھنے سے کوئی کیا کہے گا اگر ہم قرآن کی بتائی ہوئی آخرت یعنی پیدائش نو پر ایمان نہیں رکھتے تو ہمارا ایمان مکمل نہیں اور اگر ایمان ہی نہیں تو ہم مسلمان کیسے؟

کھانے پینے کے لئے مادی اشیا استعمال کے لئے برتن، پہننے کے لئے کپڑے، زیبائش کے لئے زیورات، بیٹھنے کے لئے آرام دہ صوفے کیا آخرت میں ملنے والی جنسی تذکیر وتانیث کے بغیر خود کار روحانی زندگی کی ضروریات ہیں یا ان تمام اشیائے صرف کی تفصیل سے ایک مکمل جیتی جاگتی جسمانی زندگی کی پیدائش نو کی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے؟

اُولٰٓئِکَ لَھُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْھَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَھَبٍ وَّ یَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّکِئِیْنَ فِیْھَا عَلَی الْاَرَآئِکِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا۔(۸۱:۳۱)

''انہیں لوگوں کے لیے نیچے بہتی ہوئی نہروں والے باغ آباد کئے گئے ہیں جن میں وہ سونے کے کنگن اور ریشم ومخمل کے قیمتی خوبصورت لباس پہن کر صوفوں پر دراز ہوتے ہیں کیا ہی اچھا بدلہ ہے اور کیا ہی اچھی آرام گاہ ہے۔''(۸۱:۳۱)

عٰلِیَھُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ وَّ حُلُّوْآ اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّۃٍ وَسَقٰھُمْ رَبُّھُمْ شَرَابًا طَھُوْرًا.

''ان کو ساٹن اور مخمل کے زیبائشی کپڑے اور چاندی کے کنگن پہنائے جاتے ہیں اور ان کا رب انہیں پاکیز مشروب پلاتا ہے۔''(۷۶:۲۱)

قرآن کی سو فیصد اور صحیح تعلیم یہی ہے جس کا انکار کرنے والے بھی اسی دنیا میں دوبارہ پیدا ہوں گے مگر ان کے تن پر آگ کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

فَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَھُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ۔

''پھر جو منکر ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے تراشے گئے ہیں۔''(۲۲:۱۹)

موت کے بعد آنے والی زندگی کا ہمارا روایتی تصور قرآنی تعلیمات کے برعکس یہوواہ کے گواہوں (Jehovahs Witnesses) کے تصور سے بہت زیادہ قریب ہے۔ جو ہماری تبلیغی جماعت کی طرح انگلستان کے گلی کوچوں میں گھر گھر جا کر یہ پرچار کرتے پھرتے ہیں کہ موت کے بعد ہم قیامت تک کے لئے سکون کی نیند سو جائیں گے، روزِ قیامت ہم قبروں سے اٹھائے جائیں گے اور اگر ہم ایمان والے (Believers) ٹھہرائے گئے تو جنت کی وسیع و عریض زمین کے وارث ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی جنت میں رہیں گے جس کے دامن میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوں گی۔ انگور خود آ کر منہ میں لٹکیں گے اور فراغت کے سوا جنت میں کرنے کو اور کوئی کام نہیں ہوگا۔ یہ دیومالائی تصورات یہودیوں اور عیسائیوں کی وہ پیداوار ہیں جنہیں انہوں نے روایتی انداز میں بڑی ہوشیاری سے ہمارے ایمان کا لازمی حصہ بنا دیا۔ جبکہ قرآنی تعلیمات کا ان قصے کہانیوں سے کوئی لینا دینا نہیں۔ ''تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ'' تو درحقیقت وسائل کی بہتات اور ان تک رسائی کا استعارہ ہے۔ اگر گھر میں ہی دودھ، شہد اور پانی کی نہریں بہہ رہی ہوں تو یہ اشیا باہر سے مانگ کر لانے کی کیا ضرورت ہے؟۔ گویا اگر آپ جنتی ہیں تو آپ صاحب حیثیت ہوں گے اور آپ کی زندگی اس قدر خوشحال ہوگی کہ دنیا جہان کی نعمتوں کے کثیر خزانے آپ کی پہنچ میں ہوں گے اور دنیا کی تمام تر آسائشیں، سہولیات، مال و دولت اور قیمتی اشیا آپ کے استعمال میں ہوں گی۔ قرآن آخرت (Hereafter) اور موت کے بعد کی زندگی کی وضاحت بالکل الگ اور نئے انداز میں کرتا ہے جو دیگر مذاہب یعنی ہندومت، بدھ مت، یہودیت اور عیسائیت وغیرہ سے قطعی مختلف ہے۔ ہندومت اور بدھ مت وغیرہ دوبارہ جنم کو صرف سات جنموں تک مانتے ہیں اور انسانی جون میں اِن کی واپسی ان گِنت جونوں میں سے ہوتے ہوئے ہزاروں برس کے بعد ہوتی ہے۔ جبکہ یہودیت اور عیسائیت کی تعلیمات میں آخرت کے حوالے سے پیدائشِ نو یعنی دوبارہ جنم تو موجود ہے مگر یہود و نصاریٰ اللہ کی طرف سے دی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر براہ راست نجات (direct salvation) پر یقین رکھتے ہیں۔

ہمارے علمائے کرام قرآن کو چھوڑ کر دشمنانِ اسلام کی گھڑی ہوئیں روایات کے پس منظر میں

اپنی آخرت تلاش کرتے ہیں اور اپنے غیر قرآنی خیالات کو دوام بخشنے کے لئے قرآن کے تراجم تک میں ردوبدل کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ قرآن میں جہاں کہیں بھی آخرت اور موت کے بعد دی جانے والی زندگی کی بات ہو رہی ہو وہاں ترجمے میں نہ صرف الفاظ کا مطلب تبدیل کر دیا جاتا ہے بلکہ قارئین کو حقیقت سے دور کرنے کے لئے بریکٹ میں اپنے غیر قرآنی ذاتی خیالات کی بھرمار بھی کر دی جاتی ہے تاکہ پڑھنے والا کسی طرح بھی بچ کر نکلنے نہ پائے۔ ''بعث'' سے ماخوذ ''بعثنا'' اور ''مبعوث'' جیسے قرآنی الفاظ اگر کسی آیت میں انبیاء علیہ السلام کے ذکر مبارک کے ساتھ آتے ہیں تو ترجمہ کیا جاتا ہے بھیجا (sent) یا اس لفظ کا ترجمہ کئے بغیر ہی ''مبعوث فرمایا'' لکھ دیا جاتا ہے تاکہ کوئی ان آیات کا صحیح مفہوم نہ سمجھ پائے۔ مگر جب یہی الفاظ آخرت اور موت سے متعلقہ آیات میں آتے ہیں تو ان کا ترجمہ ''قیامت''، ''قبر'' اور ''مستقبل'' کا حوالہ دے کر نہائت شاطرانہ طریقے سے ایسے کیا جاتا ہے جس سے یہ تاثر ملے کہ جو بات ان آیات میں بتائی جا رہی ہے اس پر عمل درآمد فوری طور پر نہیں بلکہ اس وقت ہوگا جب ''قیامت کے دن مردوں کو ان کی قبروں سے اٹھا کر زندہ کیا جائے گا۔'' انگریزی میں ترجمہ کرنے والے مترجمین و علما قرآن کے مذکورہ الفاظ کی جگہ اپنے تراجم میں ''ریسرکٹ'' (resurrect) لکھ کر اپنے آپ کو بری الذمہ تو کر لیتے ہیں مگر اس بات کا ہرگز خیال نہیں کرتے کہ ''ریسرکٹ'' (resurrect) انگریزی زبان کا کوئی ایسا عام لفظ نہیں جو روزمرہ کی پڑھنے لکھنے اور بولی جانے والی زبان میں استعمال کیا جاتا ہو بلکہ ''ریسرکٹ'' (resurrect) کا لفظ انگریزوں نے خاص طور پر حضرت عیسیٰ علی السلام کی دنیا میں دوبارہ آمد کے لئے مخصوص کر رکھا ہے اور اس لفظ (resurrect) کے اسم ریسرکشن (resurrection) کو روزِ قیامت قبروں سے نکل کر یسوع کو خدا ماننے والے عیسائیوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے تناظر میں ہی دیکھا جاتا ہے جبکہ انگریزی لغات میں اس کے حقیقی معنی کسی نئے جسم میں روح لوٹا کر دوبارہ زندہ کرنے کے ہیں۔ جس کے لحاظ سے قبروں سے مردے تو پھر بھی نہیں اٹھتے بلکہ اسی پرانی روح کو نئے جسم میں زندہ کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ جس کے لئے بنا بنایا تیار جسم آسمان سے نہیں اتارا جاتا اور نا ہی کسی کی روح قبض کرتے وقت ملک الموت یا کوئی اور فرشتہ مرنے والے کے لئے اس کا ہم عمر جسم اپنے ساتھ تیار رکھتا ہے بلکہ میت کی روح کو اس کے

اعمال کے مطابق نطفے میں ڈال کراس سے نیا جسم پیدا کرنے کی ابتدا کی جاتی ہے جو پیدائش سے پہلے ماں کے پیٹ میں اور پیدائش کے بعد دنیا میں اپنی نشونما کے مراحل سے گزر کر بلوغت کو پہنچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پیدائشِ نو کی تعریف سورۃ ''ق'' کی آیت نمبر 11 میں خود بھی فرما دی ہے جو روز قیامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معرفت قبروں سے مردے اٹھا کر زندہ کئے جانے والے لفظ ریسرکشن (Resurrection) کی تعریف سے بالکل الگ ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے انگریزی کے نامور مترجمین نے بنا سوچے سمجھے اللہ کی بتائی ہوئی اس قرآنی پیدائشِ نو کے تراجم بھی عیسائیوں کی نقالی میں ریسرکشن (Resurrection) کے لفظ سے ہی کر دیئے۔

رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ(۵۰:۱۱)

ام محمد، صحیح انٹرنیشنل اور حمید ایس عزیز ترجمہ کرتے ہیں:

As provision for the servants, and We have given life thereby to a dead land. Thus is the resurrection.(50/11)

پکتھل صاحب لکھتے ہیں:

Provision (made)for men; and therewith We quicken a dead land. Even so will be the resurrection of the dead

یوسف علی صاحب کا ترجمہ ہے:

As sustenance for (Allah's)Servants; and We give (new)life therewith to land that is dead: Thus will be the Resurrection(50/11)

وحیدالدین خان صاحب نے لکھا ہے:

As a provision for human beings; and by [all] this We bring dead land to life. Such shall be the Resurrection (50/11)

المنتخب نے ترجمہ کیا ہے:

And how with rain We produce victuals for the people and restore life to a dead land !and so also shall be Resurrection!.

مونوتھیسٹ گروپ کا ترجمہ ہے:

A provision for the servants, and We gave life with it to the land which was dead. Such is the resurrection(50/11)

محمد سرور صاحب لکھتے ہیں:

As sustenance for My servants. With this We have brought the dead land back to life. Thus, will also be your resurrection(50/11)

وقار احمد صاحب نے ترجمہ کیا ہے:

As sustenance for (Allahs)servants And We give (new)life with it to land that is dead.Thus the New Life (resurrection)begins(50/11)

فاروق ملک صاحب کا ترجمہ ہے:

A sustenance for the servants; thereby giving new life to dead land. That is how the resurrection will be of the dead from the earth(50/11)

بلال محمد صاحب کا ترجمہ ہے:

As sustenance for God's servants. And We give life with it to land that is dead, as will be the resurrection(50/11)

اسد صاحب ترجمہ کرتے ہیں:

As sustenance apportioned to men; and by [all] this We bring dead land to life: [and] even so will be [mans] coming-forth from death(50/11)

انگریزی کے دیگر مترجمین کا ترجمہ بھی مندرجہ ذیل ہے:

عائشہ بیولے(Ayesha Bevley):

As provision for Our slaves; by it We brought a dead land to life. That is how the Emergence will take place(50/11)

عبدل حلیم:

As a provision for everyone; how with water We give [new] life to a land that is dead? This is how the dead will emerge [from

their graves](50/11)

ٹی بی ارونگ(T.B.Irving):

As sustenance for worshippers. We have revived a dead countryside with it; thus will (your)reappearance be(50/11)

اردو کے معروف مترجمین کا ترجمہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہے:

احمد علی صاحب نے ترجمہ کیا ہے:

(یہ سب کچھ اپنے) بندوں کی روزی کے لئے (کیا) اور ہم نے اس (پانی) سے مردہ زمین کو زندہ کیا، اسی طرح (تمہارا) قبروں سے نکلنا ہوگا۔(50/11)

احمد رضا خان صاحب ترجمہ کرتے ہیں:

بندووں کی روزی کے لیے اور ہم نے اس سے مردہ شہر جِلایا یونہی قبروں سے تمہارا نکلنا ہے۔(50/11)

فتح محمد صاحب نے لکھا ہے:

(یہ سب کچھ) بندوں کو روزی دینے کے لئے (کیا ہے) اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔ (بس) اسی طرح (قیامت کے روز) نکل پڑنا ہے۔(50/11)

ابوالاعلی مودودی صاحب کا ترجمہ ہے:

یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔ اِس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں۔ (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلنا بھی اِسی طرح ہوگا۔(50/11)

شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں:

یہ انتظام ہے رزق کا بندوں کے لیے اور زندگی عطا کرتے ہیں ہم اس پانی کے ذریعہ سے مردہ زمین کو۔ اسی طرح ہوگا (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلنا۔(50/11)

غور وفکر کرنے کی بات یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں رزق کے حقیقی معنی نہ تو انگریزی مترجمین نے لئے ہیں اور نہ ہی اردو مترجمین نے اس کے معنی سمجھ کر ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی وجہ سے اس آیت کا اصل مفہوم کھل کر سامنے نہیں آ سکا۔

عربی میں رزق صرف کھانے پینے کی اشیا کو ہی نہیں کہا جاتا بلکہ غذا، وسائل، ترسیل،

ذرائع، معاش، قوت، توانائی، معیشت، سیرت، روح، زندگی اور حیات بھی رزق کے ہی معانی میں آتے ہیں- اسی طرح رزق کا انگریزی اور اردو میں ترجمہ اشیائے خورد ونوش کے علاوہ اعالت Sustenance، keeping body and soul together، کسی چیز کے مہیا کئے جانے یا عطا کئے جانے کا عمل(the action of providing or supplying something) ، توزیع یعنی بانٹنا(Allocation)، کسی چیز کی فراہمی (Provision) کسی سہولت کے دیئے جانے کا نیا معاہدہ(New contract for the provision of service) زندگی دینے کا عمل (The process of giving birth) زندگی کی آمد(Delivery)، اور زندگی (Life) بھی کیا جاتا ہے۔

رِّزْقًا کی تشریح کے بعد ہمیں اس آیت کے ایک اور لفظ "**بَلْدَةً**" پر بھی غور کرنا ہوگا۔ یہ شہر، دیش، ملک یا زمین والا "بلد" نہیں جو تمام تراجم میں استعمال کیا گیا ہے بلکہ اس کا یہاں مطلب تراب (Soil) یعنی وہ خاک ہے جس سے انسان کا مادی جسم بنا ہے۔ گویا اس آیت میں "**بَلْدَةً**" سے مراد انسانی جسم ہے نہ کہ زمین ۔ کیونکہ زمین کا ذکر تو پہلے ہی اسی سورۃ (ق) کی آیت نمبر 7 میں "**والأرض**" کے لفظ سے کر دیا گیا ہے تا کہ ہم اللہ تبارک تعالیٰ کی کاریگری پر غور وفکر کریں ورنہ سورۃ "ق" کا اصل مضمون موت اور مرنے کے بعد جزا اور سزا کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز ہے۔ اس لئے اس آیت کا ترجمہ اسی پس منظر میں کرنا بہتر ہوگا۔ اسی سورۃ کی آیت نمبر 4 میں بھی زمین کو "الارض" ہی کہا گیا ہے جبکہ آیت نمبر 3 (**ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ**) "کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے)؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے" دراصل ہمارے زیرِ نظر سورۂ ق کی آیت نمبر 11 **رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ** (۵۰:۱۱) کو ہی رجوع کر رہی ہے جو قائدے (عربی گرامر) کے لحاظ سے آگے دو جملوں میں تقسیم ہے جسے "**اثنين من بنو دسبيتش فى الجمل**" بھی کہا جاتا ہے۔ پہلا جملہ **رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا** تک کہی گئی بات مکمل کرتا ہے اور دوسرا مختصر جملہ "**الْخُرُوْجُ**" ہے جو حرف جر(preposition) **كَذٰلِكَ** کے بعد پہلے جملے میں کہی گئی بات کے ساتھ ساتھ اسی پس منظر میں اس کے ساتھ ساتھ کسی اور اہم

بات کا حوالہ بھی دے رہا ہے اور وہ ہے ''نکلنے کا راستہ'' جس کا ذکر اس سے پہلے سورہ الغافر کی آیت نمبر 11 میں ہو چکا ہے۔ اس آیت 40/11 کا تجزیہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ ''الْخُرُوْجُ'' باہر آنے، چھوٹنے، کسی جگہ سے نکل جانے اور کسی خاص حالت سے نکلنے یا آزاد ہونے کے معانی میں آتا ہے۔ انگریزی میں ''الْخُرُوْجُ'' The Exit ,To leave, Go away from a place,Way out, اور Go forth کے معانی میں آتا ہے جو ہماری تحقیق اور ہمارے نقطۂ نظر کی مکمل طور پر تصدیق کرتے ہیں۔ الخروج ہمارے زیرِ نظر سورہ غافر اور سورہ ق کے علاوہ سورہ توبہ میں بھی انہیں معانی میں آچکا ہے جو ہم نے آپ کے گوش گزار کئے ہیں۔ ہمارے زیرِ مطالعہ آیت (50/11) کے تراجم میں ''الْخُرُوْجُ'' کو اسم مرفوع بنا کر پیش کیا گیا جبکہ حقیقت میں یہ خرج کی مفعولی حالت (passive) میں جملہِ السلبیالحکمة متوترة ہے جو گزشتہ زمانے سے جاری کسی خاص عمل پر دلالت کرتے ہوئے اور پہلے جملے کے بیان کی روشنی میں اپنا بیان خود سے مکمل کر رہا ہے۔ لہٰذا پیدائشِ نو (Rebirth) کے بیان والی مندرجہ بالا آیت مبارکہ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ (۵۰:۱۱) میں ارشاد ہو رہا ہے کہ ''قوتِ حیات فراہم ہو جاتی ہے لوگوں کو اور ہم زندہ کر دیتے ہیں مردہ خاکی جسم کو، یہی ہے نکلنے کا راستہ بھی۔'' یہ ہی اس آیتِ مبا کہ کا حقیقی مفہوم ہے۔ افسوس! کہ ہم قرآنِ کریم کی آیتوں پر غور و فکر نہیں کرتے بس نقل در نقل ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کہیں قبر کا ذکر ہے نہ قیامت کا۔ قائدے (Grammar) کے نقطہ نظر سے بھی کہیں مستقبل کا حوالہ دکھائی نہیں دیتا کیونکہ یہ عمل ہر زمانے میں جاری و ساری رہتا ہے مگر پھر بھی مستقبل میں قیامت کے دن ہی قبروں سے نکل کر زندہ ہونے پر زور دیا جاتا ہے۔ دراصل کتابی روایات تو یہ کہ کر ہم رد کر چکے ہیں کہ وہ قرآن سے مطابقت نہیں رکھتیں مگر ہم نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ زبانی روایات کے دیو ہیکل بت تو ابھی تک ہمارے من مندر ہیں سمائے ہوئے ہیں جنہیں ہم توڑنا ہی نہیں چاہتے۔ بھلے وہ قرآن سے مطابقت نہ ہی رکھتے ہوں پھر بھی ہم انہیں دوام بخشنے کے لئے دن رات کوشاں ہیں۔ کبھی بریکٹ میں، کبھی حاشیئے میں، کبھی تفسیروں میں، کبھی تقریروں میں اور اکثر تحریروں میں ہم اپنے غیر قرآنی خیالات کا اظہار کرنے سے چوکتے نہیں۔ وہ دن دور نہیں

جب ان غیر قرآنی تراجم تفہیم سے خالی تفہیمات و تفاسیر اور لا معنی لغات و تبویبات کو کلی طور پر رد کر کے خالصتاً قرآنی تعلیمات کا آغاز ہوگا۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں سے نمازی بن نہ سکا

ارشادِ عالی ہے:

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ. (40/11)

کہا: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور تو نے ہمیں دو بار زندگی بخشی، سو ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، پس کیا (عذاب سے بچ) نکلنے کی طرف کوئی راستہ ہے۔ (40/11)

اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس دعوے کے تناظر میں، کہ جن و انس میں سے کوئی بھی قرآن کے ادبی اور لسانی انداز کو چیلنج نہیں کر سکتا، ہمیں اس مضمون کو سمجھنے کے لئے مندرجہ بالا آیت کریمہ کے ایک ایک لفظ کو سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ جو نفوس اپنی بداعمالیوں یا ایمان نہ لانے کی وجہ سے آخرت کی زندگی کے اعلیٰ مقام کی طرف ترقی نہیں کر سکے۔ یہ نفوس حقیقت جان لینے کے بعد اپنے گناہوں کا اعتراف بھی اس انداز سے کرتے ہیں جو سراپا خمِ تسلیم (complete submission to Allah) ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور گڑ گڑا کے عاجزانہ التجا بھی کرتے ہیں کہ انہیں وہاں سے نکالنے کا کوئی راستہ بنا۔ ادبی اعتبار سے اضافی حرف ''ف'' کے ساتھ اعترافِ گناہ ''فَاعْتَرَفْنَا'' اور نکلنے کی عاجزانہ درخواست میں ''فَهَلْ'' کسی فعل میں اِنتہاء کی دلیل ہے یعنی کسی فعل کے ساتھ ''ف'' کا اضافہ عربی ادب میں تقریر، خطاب یا گفتگو کی ایک انتہائی شق ہے۔ جس میں کسی فعل کے حوالے سے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی تقریر پیدا کرنے کے لئے انتہائی عاجزانہ درخواست کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ شروع کا اضافی ''ف'' ایک انتہائی سچا بیان بنانے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ صوتی اعتبار سے بھی اگر حرف ''ف'' کسی فعل کے شروع میں آئے تو وہ اس فعل کی ادائیگی کے عمومی انداز یعنی سر (tone) کے پیمانے کو چار درجے

انتہائی اوپر یا چار درجے انتہائی نیچے کر دیتا ہے جو کہ علم الصوت میں شعور (consciousness)، احساس (feeling)، جذبات (sentiments)، مزاج (temperament)، موڈ (mood) اور سر (tone) میں انتہاء کی دلیل ہے۔ اس لئے حقیقت سامنے آنے کے بعد اعترافِ جرم اور سزا سے بچنے کی درخواست کا انداز چار درجہ اونچا تو ہو نہیں سکتا۔ لہٰذا، اس بات کا شعور آنے پر کہ ہم یقیناً غلطی پر تھے جب احساسِ ندامت ہوا تو وہ گنہگار اللہ تعالیٰ کے حضور انتہاء کے درجے پر جھک گئے اور گڑگڑا کے فریاد کرنے لگے کہ ہمیں یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھا۔

اس مرحلے پر کوئی بھی اللہ تبارک تعالیٰ کی مہربانی اور اس کی رحیمی صفات سے انکار نہیں کر سکتا پس اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے بندوں کے مردہ خاکی اجسام کو نئی زندگی دے کر انہیں وہاں سے نکالنے کا راستہ بنا دیا جس کا تفصیلی ذکر پیدائشِ نو سے متعلقہ سورۂ ''ق'' کی گیارہویں آیت میں اوپر آ چکا ہے۔ آیئے ایک نظر مندرجہ ذیل آیاتِ مبارکہ پر ڈالتے ہیں جو اگرچہ براہ راست ہمارے موضوع کے ساتھ منسلک تو نہیں لیکن اللہ کی رحمت کے مندرجات میں اس آیتِ کریمہ کا حوالہ دیئے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہوسکتا۔

وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ۔(12/53)

''اور میں الزام سے خود کو آزاد نہیں کرتا۔ درحقیقت انسانی خود (نفس) برائی مائل ہے سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم فرما دے۔ بیشک میرا رب بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔''(12/53)

مندرجہ ذیل آیات بھی ہمارے مضمون میں غور طلب ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ قَالُوۡا فِیۡمَ کُنۡتُمۡ قَالُوۡا کُنَّا مُسۡتَضۡعَفِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَکُنۡ اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُہَاجِرُوۡا فِیۡہَا فَاُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا۔(4/97)

''بیشک جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔ وہ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور و بے بس تھے، فرشتے (جواباً) کہتے ہیں: کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر

جاتے، سو یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔''(4/97)

اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الۡوِلۡدَانِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ حِیۡلَۃً وَّ لَا یَہۡتَدُوۡنَ سَبِیۡلًا

''سوائے ان واقعی مجبور و بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کے، جو نہ کسی تدبیر پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ (وہاں سے نکلنے کا) کوئی راستہ جانتے ہیں۔''(4/98)

فَاُولٰٓئِکَ عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّعۡفُوَ عَنۡہُمۡ وَ کَانَ اللّٰہُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا۔(4/99)

''سو یہ وہ لوگ ہیں کہ یقیناً اللہ ان سے درگزر فرماتا ہے، اور اللہ بڑا معاف فرمانے والا بخشنے والا ہے۔''(4/99)

قارئینِ کرام غور فرمایئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کامیاب نہیں ہو سکے اور براہِ راست جنت میں جانے سے روک دیئے گئے۔ ان کے لئے جنت میں براہِ راست (direct entry) داخلے کی بجائے اللہ تعالیٰ نے بخشش اور مغفرت کا جو راستہ وضع کیا ہے وہ کیا ہے؟ کیا ''ذرے ذرے'' کا ہونے والا حساب معاف ہو جائے گا؟ کیا ''**النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ**'' والے اصحاب جو پہلے ہی جنت میں داخل ہو چکے ہیں وہ مفلحین اور یہ خاسرین لوگ جو پیچھے ہی روک لئے گئے ہیں برابر ہو جائیں گے؟ یہ ہی وہ مقام ہے جہاں انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق بخشش، معافی اور درگزر کا حقیقی مفہوم کھل کر سامنے آتا ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں کی بخشش اور معافی بنا کچھ کئے تو ہو نہیں سکتی اور کچھ کرنے یعنی اعمال اکٹھے کرنے کا راستہ بھی موت کے بعد بند ہو چکا ہے۔ اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے جو ان کے اعمال کے مطابق دوبارہ اور اگلی زندگی میں کئے جانے والے اعمال کی پھر سے جانچ پڑتال کے بعد براستہ حیات و ممات کے محوری نظام پر مشتمل گردشی داخلے (rotational entry) کے ذریعے ہی ممکن ہے جو بار بار موت اور زندگی کے گردشی دائرے کے عمل پذیر ہونے سے ہی ممکن ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں سے جس زندگی میں بھی ہمارے اعمال قرآن میں بیان کئے گئے ''**مُفۡلِحُوۡن**'' کے معیار پر پورے اترے اس زندگی کے بعد نہ تو ہمیں موت ہی آئے گی اور نہ ہی حیات و ممات کا کوئی سلسلہ باقی رہے گا اور ہم فلاح پا کر انسانی ارتقا کی اگلی منزل کی طرف بڑھ جائیں گے۔ اگر بخشش کے اس عین قرآنی مفہوم کو اچھی

طرح سمجھ لیا جائے تو شفاعت اور تقدیر جیسے مسائل از خود حل ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس سارے عمل میں کہیں کوئی سفارش کرنے والا دکھائی نہیں دیتا اور اللہ کا مقرر کردہ خود کار نظام ایک طرف تو گزشتہ زندگی کے اعمال کے مطابق نئی زندگی مرتب کرتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف آنے والی زندگی میں اپنے اعمال کو سدھارنے اور اچھا یا برا بنانے کی مکمل آزادی (free will) بھی دیتا ہے۔ قرآنی نظام درحقیقت براہِ راست بخشش (direct entry) اور پیدائشِ نو کی گردشوں (rotational entry by rebirth) پر مشتمل ہے جو انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق اصلاح کا پہلو لئے ہوئے ایک شفاف احتسابی نظام ہے۔ اس نظام میں نہ تو کوئی جنموں کی گنتی ہے اور نہ ہی جونوں کا کوئی شمار ہے بلکہ اس نظام کا مرکز بحیثیتِ انسان آپ خود ہیں۔ اللہ کا قانون تو فقط آپ کا پیچھا کرتا ہے وہ آپ کی فلاح کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

علامہ اقبال نے اسی بات کو اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

قارئینِ کرام اعمال اور اسکی جانچ موت اور زندگی کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ ارشادِ عالی ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ۔ (67/2)

''جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری جانچ ہو کہ تم میں کس کے کام اچھے ہیں۔ اور وہی زبردست منتظم درگزر کرنے والا ہے۔'' (67/2)

انسان کی پیدائشِ نو مجرموں کی اصلاح اور جہنم کی سزا پانے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ (104/6) الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (104/7)

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جہنم کی آگ دلوں پر جا لپٹے گی۔ دل گوشت پوست سے بنے جسم کا ہی ایک حصہ ہے جس پر آگ کی سزا کا اطلاق انسان کو دوبارہ پیدا کر کے دنیا میں بھیجے بغیر ممکن نہیں۔ دلوں پر لپٹنے والی آگ ہماری موجودہ اور اگلی زندگی میں آنے والی تنگی، مصیبتوں، پریشانیوں اور صدموں کا بھی استعارہ ہے جو گزشتہ زندگی میں کئے گئے اعمال کی پاداش

میں ہم بھگتتے ہیں۔ جسمانی اور ذہنی معزوریاں، تنگدستی، فاقے، نت نئی بیماریاں، کشیدگی، لڑائی جھگڑے اور ذہنی تناؤ سابقہ زندگی کے گناہوں کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ یعنی عمر بھر اس آگ میں سلگتے رہیں گے جاجائیکہ اپنی مرضی اور قوتِ ارادی (Free Will) کو استعمال کر کے اپنے اعمال درست کر لیں اور آنے والی زندگی میں مزکورہ پریشانیون سے چھٹکارہ پالیں۔ مرضی اور قوت ارادی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر چھوڑ رکھی ہے جس کا استعمال ہم آزادی سے کر سکتے ہیں جو آگے چل کر مکافاتِ عمل بنتا ہے۔ بار بار موت اور پیدائش کے ذریعے انسان ارتقائی منازل طے کرتا ہے اور عمل کی بھٹی میں سے گزرتے گزرتے ایک دن وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کے استقبال کے لئے آسمان کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں۔ یہ انسان پر اللہ تبارک تعالیٰ کی خاص رحمت اور عنائت ہے۔ مندرجہ ذیل آیتِ مبارکہ (7/40) میں اسی اصول (Theory) کو واضح کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ۔

''بے شک جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے اور نا ہی وہ جنت میں داخل ہوتے ہیں یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے اور ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔'' (7/40)

مندرجہ بالا آیتِ جلیلہ میں حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ (یہاں تک یا جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے) کے الفاظ بہت اہم اور غور طلب ہیں۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے نعوذ و باللہ کسی تمسخرانہ انداز میں نہیں کہے جیسا کہ بہت سے علمائے کرام نے ان کا مطلب ''ناممکن'' (impossible) لیا ہے۔ اگر مقصود ناممکن ہی کہنا تھا تو اتنے بڑے جملے کی بجائے صرف ایک ہی ''نا'' کا لفظ کافی تھا یا پھر اس آیت کو وَ لَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ پر ختم کر کے اس کے ساتھ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُجْرِمِیْنَ لگا دیا جاتا۔ بالکل وہ ہی مطلب نکلتا جو ہمارے علماء کرام اور مترجمین نکالتے ہیں۔ ''حَتّٰی'' کے بعد آنے والا دوسرا جملہ جسے عربی گرامر میں ''جملہ من سبیتشا لثانی'' کہا جاتا ہے وہ ''حَتّٰی'' سے پہلے آنے والے بند (clause of sentence) یعنی ''الفقرۃ الاولی منسبیتش'' کو مشروط اور زیر التواء رکھتا ہے۔ لہٰذا عربی

گرامر کا مکمل اطلاق کئے بغیر اِدھر اُدھر کی ٹامک ٹوئیاں مار کے اور لفظوں کے ہیر پھیر سے قرآن کا ترجمہ کرنا قرآن کے ساتھ سخت ناانصافی اور پوری امتِ مسلمہ کے ساتھ بد دیانتی کے ساتھ ساتھ گناہ کا موجب بھی ہے۔ اس بات کو نہ ہی مترجمین مدِ نظر رکھتے ہیں اور نہ علماءِ کرام۔ بہر حال عربی گرامر کی رو سے اس آیت کا سیدھا اور رواں مفہوم یہ نکلتا ہے کہ **"گزشتہ زندگیوں میں جن سے گناہ سرزد ہوئے ہیں وہ بھی سخت محنت اور مشقت کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ اپنے اعمال کو سدھار کے بالآخر جنت میں داخل ہو جائیں۔"** اس آیت کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر واضح کر دیا ہے کہ وہ مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ بات صاف ہوگئی کہ سزا پانے کے لئے گنہگاروں اور مجرموں کو بار بار دنیا میں آنا پڑے گا۔ سزا کا دوسرا نام اصلاح بھی ہے جو اگر بتانے، سمجھانے اور وعظ و نصیحت سے نہ ہو تو ایک وقت آنے پر زمانے کی ٹھوکروں سے خود بخود ہو جاتی ہے خواہ وہ وقت کتنا لمبا اور کتنی ہی زندگیوں کے کتنے ہی ادوار پر محیط کیوں نہ ہو۔ گنہگار ہوں یا راست باز مگر بندے تو سب اللہ ہی کے ہیں جن سے اللہ کو دشمنی نہیں بلکہ پیار ہے۔ چنانچہ گنہگاروں اور مجرموں کی بخشش کا سامان پیدا کرنے کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ نے سوئی کے ناکے میں سے اونٹ کے گزرنے کا جو آپشن رکھا ہے وہ اگرچہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ تکبر کے اونٹ جیسے بڑے بڑے پہاڑ جب ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور انسان اپنے اللہ کے سامنے سربسجود ہو جائے گا تو سوئی کے ناکے میں سے اونٹ کا گزرنا کوئی مشکل نہیں رہے گا۔ ہر آنے والی نئی زندگی کو عمل کی بھٹی میں جھونک کے اور بار بار موت اور زندگی کی گردشوں کی چھلنی میں چھن کے جب انسان فرشتوں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے گا تو اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور آخر کار وہ اپنے ربِ ذوالجلال سے جا ملے گا جو کہ انسان کی حقیقی منزلِ مقصود ہے۔

اللہ تبارک تعالیٰ نے اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے انسان کو اس دنیا میں بھیجنے کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اصلاحی پروگرام بھی مرتب فرمائے، انبیا علی السلام کو مبعوث فرمایا اور انسان کی رہنمائی بذریعہ وحی فرمائی۔ جس کا مقصد یقیناً انسان کی اصلاح (reform) تھا۔ تاہم جن لوگوں کے نفس مزکورہ اصلاحی پروگرام کے باوجود بھی ترقی کر کے "النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ" نہیں بن

سکے ان کی اصلاح ارتقائی عوامل کے ذریعے انہیں بار بار عمل کی بھٹی میں جھونک کر پیدائشِ نو سے کرنے کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ نے یہ عظیم الشان نظام قائم کیا ہے جو فطرت کے تقاضوں کے ساتھ بدرجہ اتم ہم آہنگ ہے۔ دیکھئے اللہ تبارک تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ. (84/19)

" آگے بڑھنے کے لئے مرحلہ وار عمل پے عمل ضروری ہے / ایک حالت سے دوسری حالت میں آنے کا بتدریج عمل / درجہ بدرجہ ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں ترقی کرنا / مرحلہ وار عمل کے مطابق رفتہ رفتہ انشاء ہونا۔" (84/19)

مودودی صاحب اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کرتے ہیں، "تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے" اور احمد علی صاحب کا ترجمہ ہے، "کہ تمہیں ایک منزل سے دوسری منزل پر چڑھنا ہوگا" محمد جونا گڑھی صاحب نے لکھا ہے، "یقیناً تم ایک حالت سے دوسری حالت پر پہنچو گے" گویا تمام مترجمین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ انسان یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا بلکہ یہ منزل بمنزل اور درجہ بدرجہ تمام ارتقائی مراحل طے کر کے ترقی کرتا ہوا اپنی منزلِ مقصود تک ضرور پہنچ جائے گا اور قرآن کے ذریعے اللہ تبارک تعالیٰ کا حقیقی پیغام بھی یہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

وہ منزلِ مقصود کیا ہے جہاں انسان کو پہنچنا ہے اور جس کے لئے اتنا عالی شان انتظام کیا گیا ہے؟ اللہ تبارک تعالیٰ نے اس راز سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے۔

ارشادِ عالی ہو رہا ہے:

يَاأَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ۔ (84/6)

"اے انسان ! تو اپنے رب تک پہنچنے میں سخت مشقتیں برداشت کرتا ہے بالآخر تجھے اسی سے جا ملنا ہے۔" (84/6)

اس آیتِ مبارکہ کا ترجمہ تو سبھی مترجمین نے کم و بیش ایک ہی جیسا کیا ہے مگر اصل میں جو بات کہی جا رہی ہے اس کے تشریح طلب پہلو پر شاید ہی کسی نے قلم اٹھایا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایمان کے لالے پڑ جانے کا ڈر ہو یا فتویٰ زنی کا خوف ہو اور یا پھر کولہو کے بیل کی طرح ہمارے سوچنے

سمجھنے کی صلاحیت ہی اتنی محدود ہوگئی ہو کہ ہم ابھی تک اندھوں اور بہروں کی طرح ''روایات'' کے سمندر میں اوندھے منہ غوطہ زن ہوں! راقم الحروف نے بھی اس آیت کا ترجمہ نقل کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے کیونکہ ہم ابھی اس مضمون میں اس سطح تک نہیں پہنچے جہاں اس آیت کی تشریح کا حقیقی پہلو منظرِ عام پر لایا جائے۔ جب اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ نظامِ حیات وممات سمجھ میں آ جائے گا اور اس پر وہ یقینِ کامل ہو جائے گا جو قرآن چاہتا ہے تو اِس آیت کا مطلب اور تشریح خود بخود سمجھ میں آ جائے گی۔ اس کے علاوہ بالائی آیت کی تشریح کرنے سے پہلے قرآنی نظریہ حیات کو سمجھنا بہت ضروری ہے جس پر راقم الحروف دن رات تحقیق کر رہا ہے اور انشااللہ جلد ہی آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔

قارئینِ کرام ہم آگے بڑھنے سے پہلے مندرجہ ذیل قرآنی بیانات کا ایک بار پھر سرسری سا جائزہ لیتے ہیں۔

مرنے کے فوراً بعد ہمارے اعمال کی جانچ (assessment) کر کے ہمیں تین مختلف اقسام (categories) میں بانٹ دیا جاتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً۔(56/7)

''اور تمہارے تین دھڑے ہو جاتے ہیں۔'' (56/7)

1:......وَالسّٰبِقُوْنَ 'سب سے اوّل۔'' (56/10)، اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (56/11) وہ ہوتے ہیں جو اللہ کے مقرب ہیں۔فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (56/12) وہ ''نعمت بھری جنتوں میں'' جاتے ہیں۔

2:......فَاَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ (56/8) پھر دائیں طرف والے، جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (56/24) جو اپنے اعمال کے بدلے میں، وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (56/30) گھنی چھاؤں میں ہوں گے (مروجہ ترجمہ)۔ پھر ان کو پروان چڑھا کے ایک مقررہ مدت تک زندہ رکھا جاتا ہے (اصل ترجمہ)۔ یعنی ان کو دوبارہ زندگی دے کر پروان چڑھایا جاتا ہے جس میں ان کے شعور کی مزید ترقی بھی ہوتی ہے اور آنے والی زندگی میں ان کا مقام بھی گزشتہ زندگی کی نسبت بلند ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل ہم اسی مضمون کے گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔

3:......وَ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ (56/9) اور بائیں طرف والے، وَكَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ (56/46) بڑے سے بڑے گناہوں میں ملوث، فِیْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِیْمٍ (56/42) لوکی لپیٹ اور کھولتے ہوئے پانی میں ہوں گے (مروجہ تراجم)۔ پریشان حال دربدر زہر آلود زندگی اور خراب انجام (اصل ترجمہ) والی زندگی میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اس کی مفصل تشریح مکمل حوالوں کے ساتھ اسی مضمون کے گزشتہ صفحات میں آپ کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے۔

مروجہ تراجم میں بھی گرم پانی محاورہ تا مشکل اور پریشانی سے مستعار لیا گیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے انگریزی میں مشکل یا پریشانی کی حالت میں ہونے کو محاورہ تا کہا جاتا ہے They will be in hot water یہ محاورہ عام طور پر وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں بھول چوک سے یا دانستگی میں کسی غلطی یا جرم کا ارتکاب ہو جائے اور اس بات کا احساس کوئی دوسرا کرا دے یا خود سے احساس ہو جائے کہ جو غلطی ہم سے ہوئی تھی اس کی وجہ سے اب ہم یقیناً مشکل میں پڑنے والے ہیں۔ اسی مقام پر احساسِ ندامت ہوتا ہے اور خطا کار کی روح اپنے رب کے حضور فریاد کرتی ہے کہ اے میرے مالک مجھے اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھا!

اس مضمون میں ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کے مرنے کے بعد جو زندگی دی جاتی ہے وہ سابقہ زندگی میں کئے جانے والے اعمال کے مطابق ہوتی ہے جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

جنتی کہتے ہیں۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ۔(37/58)

''پھر کیا اب ہم مرنے والے نہیں۔'' (37/58)

اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ۔(37/59)

''سوائے ہماری پہلی موت کے اور کیا ہم عذاب دیئے جانے والوں میں سے نہیں ہیں نا؟'' (37/59)

اللہ تبارک تعالیٰ اس بات کی توثیق کرتے ہیں اور ناکام رہنے والوں کو کامیاب لوگوں جیسا عمل کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں۔

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ۔(37/60)

’’بے شک یہی بڑی کامیابی ہے۔‘‘(37/60)

لِمِثۡلِ ھٰذَا فَلۡیَعۡمَلِ الۡعٰمِلُوۡنَ۔(37/61)

’’ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔‘‘(37/61)

اگر موت کے بعد کوئی دوبارہ زندہ ہو کے دارالعمل یعنی دنیا میں واپس نہیں آتا تو کامیاب لوگوں کی طرح عمل کرنے کی ہدایت دینے کا کوئی مطلب ہی نہیں کیونکہ ہمارے غیر قرآنی عقائد والی جنت اور دوزخ میں تو عمل کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔ایسا بھی نہیں کہ اللہ نے یونہی بطور مثال کامیاب لوگوں کی بات کر کے ان جیسا عمل کرنے کی ہدایات جاری کر دیں ہوں کیونکہ یہ بیانات موت کے بعد کے ہیں جہاں پر لوگوں کے تین دھڑے بنتے ہیں اور تیسرے دھڑے میں شمار کئے جانے والے ناکام لوگ پہلے دونوں دھڑوں کے لوگوں کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔یہ ایک الگ بات ہے کہ قرآن کے مقابلے میں ہم اپنے عقائد اوپر رکھنے کے لئے حسبِ عادت قرآن کی اس آیت کا بھی انکار کرتے ہوئے اس کی کچھ بھی تفسیر گھڑ کے یہ فتویٰ دے دیں کہ مرنے والوں کے بیانات تو قیامت سے پہلے نہیں ہو سکتے اور قیامت کا ابھی وقت نہیں آیا!۔

ابھی مروجہ قیامت نہیں آئی مگر کامیاب ہو جانے والے مقربین کے کئے اللہ کے بیانات قرآن میں بار بار آرہے ہیں کیونکہ قرآن قیامت سے مراد موت اور اس کے فوراً بعد قائم ہونے والا نظامِ عدل لیتا ہے۔جس قیامت کا تصور ہمارے عقائد میں ہے وہ تو اللہ کی آیات سے انکار اور اللہ کے احکام کو نظر انداز کرنے کا ایک بہانہ ہے کہ کلمہ پڑھ کے جو مرضی کرتے پھرو۔موت آئے تو اتنی میٹھی نیند سو جاؤ کہ اربوں کھربوں سال کے بعد بھی اگر کبھی فرضی قیامت آ ہی جائے اور ہماری قبر کو کھول کر کوئی ہمیں اٹھائے تو ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلے کہ کس نے ہمیں نیند سے جگا دیا؟۔دراصل یہ سب مفروضے بداعمالیوں کی حمایت اور سرپرستی کرنے والوں نے گھڑے ہیں جس سے نا صرف ظالموں کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں بلکہ دنیا میں ظلم بھی بڑھتا جا رہا ہے اور اس قسم کے غیر قرآنی نظریات سے انسانیت پر ظلم ڈھانے والوں کو ’’دلی دور است‘‘ جیسی جھوٹی تسلی بھی

ملتی رہتی ہے کہ جو مرضی میں آئے وہ کرو جب قیامت آئے گی تو دیکھا جائے گا۔قیامت کے ذریعے تو اللہ تبارک تعالیٰ نے فوری انصاف کا وہ شفاف نظام قائم کیا ہے جسے اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے والے ہی نہیں سمجھ پائے تو باقی کے لوگ کیا سمجھیں گے۔

ملاحظہ فرمائیے اللہ تبارک تعالیٰ بار بار فرما رہے ہیں۔

لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡھَا الۡمَوۡتَ اِلَّا الۡمَوۡتَۃَ الۡاُوۡلٰی وَ وَقٰھُمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ۔

’’نہیں چکھنی پڑتی اس میں موت سوائے پہلے گزری ہوئی موت کے اور دور رہتا ہے ان سے دوزخی عذاب۔‘‘(44/56)

فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکَ ذٰلِکَ ھُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ۔(44/57)

’’بڑا انعام/مہربانی ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ جو بڑی کامیابی ہے۔‘‘(44/57)

مندرجہ بالا آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ راست باز لوگ موت کا ذائقہ صرف ایک ہی بار چکھتے ہیں،انہیں سزا بھی نہیں دی جاتی کیونکہ یہ لوگ دوزخ کی پہنچ سے بہت بلند ہوتے ہیں وَقٰھُمۡ میں ھُمۡ ان لوگوں کی ضمیر (they) ہے جس کے شروع میں لگا ہوا لفظ وَقٰ ان کو اونچے، وزنی اور اس کے بعد آنے والے الفاظ عَذَابَ الۡجَحِیۡم یعنی دوزخ کے عذاب کی پہنچ سے دور قرار دیتا ہے جو ان لوگوں کے لئے ایک بڑی کامیابی کی صورت میں اللہ کی مہربانی اور انعام ہے۔بالائی آیات سے یہ بات تو چھٹ کر صاف ہو گئی کہ یہ بات موت کے بعد بننے والے تین دھڑوں میں سے صرف ایک دھڑے یعنی مقربین کی ہو رہی ہے جن کو سزا نہیں دی جاتی اور انہیں ان کی اس عظیم کامیابی کے انعام کے طور پر صرف ایک ہی بار مرنے کے بعد آسمان کے طول و عرض میں اعلیٰ مقام کے ساتھ ایک نئی زندگی عطا کر دی جاتی ہے جس کے بعد وہ دوبارہ نہیں مرتے اور نا ہی دوبارہ پیدا ہو کر دنیا میں آتے ہیں۔مگر دوسرے اور تیسرے دھڑے والے لوگوں پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔دوسرے دھڑے یعنی دائیں ہاتھ والوں کو مزید ترقی کے لئے انعام و اکرام کے ساتھ اچھی زندگی دے کر واپس دنیا میں بھیج دیا جاتا ہے تاکہ اگلی موت کے بعد ان کے اعمال کی پھر سے جانچ کر کے ان میں سے اہل لوگوں کو مقربین میں شامل کیا جائے اور جو ترقی نہیں کر سکے انہیں ترقی کے لئے واپس بھیجا جائے۔تیسرے دھڑے میں آنے والے یعنی

جن کوان کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جاتا ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی بداعمالیوں اور بڑے بڑے گناہوں کی وجہ سے مذکورہ اعلیٰ زندگی کی راہ پر ترقی کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ان لوگوں کو بھی ان کی سزا کی مناسبت سے دوبارہ زندگی دیکر ایک نئے جسم اور نئے ماحول کے ساتھ واپس زمین پر لوٹا دیا جاتا ہے جہاں ان کا رہنا سہنا اور اوڑھنا بچھونا جہنم کا سا ہوتا ہے۔ان کے دلوں میں سلگی ہوی دوزخ کی آگ نہ تو انہیں چین سے جینے ہی دیتی ہے اور نا ہی وہ سکون سے دوبارہ مر سکتے ہیں۔ وہ بار بار جیتے ہیں، بار بار مرتے ہیں اور موت وحیات کے اس محور سے اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتے جب تک کہ وہ اپنے اعمال کو درست نہ کرلیں اور آنے والی موت کے بعد ہونے والے حساب کتاب میں کامیاب نہ ہوجائیں۔

یہی وہ نقطہ ہے جس کو سمجھانے کے لئے قرآنِ کریم کی آیت 40/11 میں دو بار موت اور دو بار زندگی دینے کا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ صرف گنتی کے اعتبار سے دو بار نہیں بلکہ کبھی نہ ختم ہونے والا ایک ایسا دائرہ (cycle) ہے جو بار بار موت وحیات کے عمل کو رواں دواں رکھنے کے لئے ایسے استعمال ہوتا ہے جیسے دورسیوں کو ان کی دم اور سروں (head and tail) سے جوڑ کر ایک لامتنٰہی سلسلے کا حلقہ (loop) بنا دیا جائے۔ یہ ایک خاص سائنسی اصطلاح ہے جو دہرائے جانے والے کسی عمل کو ایک غیر معینہ مدت تک جاری رہنے والی گردش (cycle) میں تبدیل کردیتی ہے۔فزکس کا یہ قانون پوری کائنات میں کارفرماں ہے جس کا ایک عام سا مشاہدہ منخنی موجوں (sinusoidal waves) کے مثبت اور منفی نصف دائروں کے عروج اور زوال یا پستی اور بلندی سے بننے والے مکمل دائروں (cycles) سے کیا جاسکتا ہے۔

قرآنِ کریم کی آیت 40/11 کو گرامر کے لحاظ سے دیکھنے کے بعد سائنسی انداز سے بھی دیکھنا ضروری ہے کہ دو بار موت اور دو بار زندگی کی قرآنی اصطلاح سے کیا مراد ہے؟

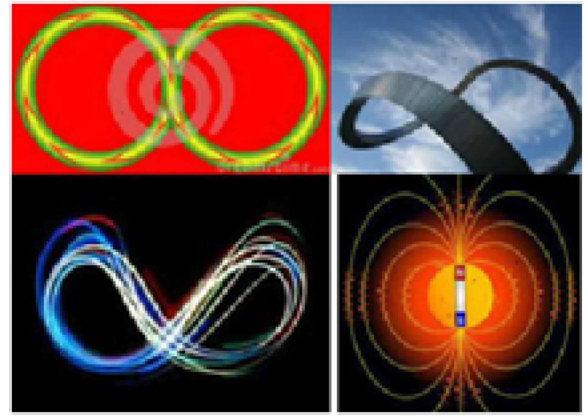
قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَ اَحۡیَیۡتَنَا اثۡنَتَیۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَهَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ۔(40/11)

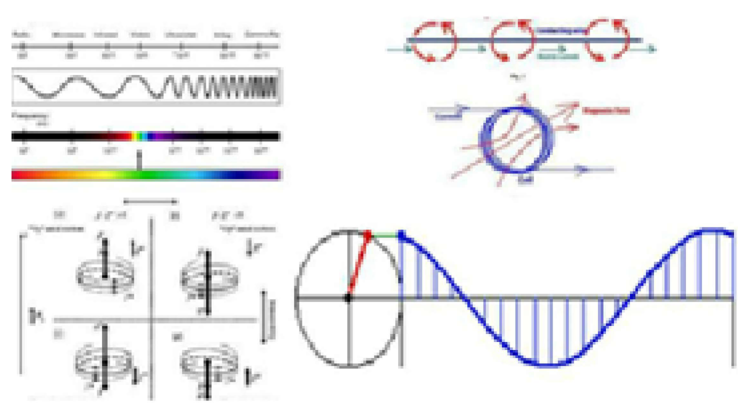
کہا: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور تو نے ہمیں دو بار زندگی بخشی، سو ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، پس کیا (عذاب سے بچ) نکلنے کی طرف کوئی راستہ

ہے۔(40/11)

دو اموات اور دو زندگیوں کی ترتیب کو ان کے آغاز اور اختتام سے جوڑ دیا جائے تو یہ موت و حیات کے کسی لامتناہی سلسلے کا وہ مکمل دائرہ بن جاتا ہے جس کی تعمیر کی ترکیب موجودہ سائنس اور علومِ ریاضی سے بعینہٖ ثابت ہوتی ہے۔اس نظریئے (Theory) کا بڑے پیمانے پر عملی اطلاق انجینئرنگ کی تمام شاخوں کے ساتھ ساتھ طبیعات، کیمیا، حیاتیات، طبی تشخیص، مقناطیسیت، برقیات، صوتیات، نشریات، ٹیلیفون، ٹیلیویژن، ریڈیو، نیوی گیشن (Navigation)، موبائل، وائی فائی اور خلائی سائنس کے میدانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس قانونِ قدرت کا مشاہدہ تمام کائناتی مظاہر مثلاً گردشِ سیارگان یعنی اپنے اپنے دائرے میں محوِ گردش چاند، سورج، زمین اور دیگر ستاروں اور ان کی کششِ ثقل پر غور کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔مشہور سائنس دان نیوٹن کے دوسرے فارمولے میں بھی یہ ہی اصول ثابت کیا گیا ہے۔موجودہ سائنسی انقلاب کے دور میں سر اور دم (Head and Tail Rule) کو جوڑ کر بنائی جانے والی موثر (Live) لوپ (Loop) کا استعمال بجلی (electricity) کی پیداوار اور ترسیل وتقسیم سے لے کر ہوائی جہازوں اور مصنوعی سیاروں میں استعمال ہونے والی پیچیدہ ترین ٹیکنالوجی تک میں کیا جارہا ہے۔ ایکسرے، ایم۔آر۔آئی اسکین، ای۔سی۔جی اور الٹرا ساؤنڈ میں بھی یہ ہی اصول کارفرماں ہے۔ اسی سلسلے کی ایک لامتناہی لوپ کمپیوٹر پروگرامنگ کی ہدایات (instructions) میں بھی استعمال ہوتی ہے جس کا کبھی اختتام نہیں ہوتا اور وہ بار بار نقطۂ آغاز سے پھر شروع ہو جاتی ہے۔ یہ لوپ کمپیوٹر پروگرامنگ میں دی گئی ہدایات کا اعادہ اس وقت تک بار بار کرتی رہتی ہے جب تک کہ وہ خاص حالت عمل پزیر نہیں ہو جاتی جو اس کے لئے مقرر کی جاتی ہے۔

قارئین کرام اوپر بیان کئے گئے سائنسی نظریئے (Scientific Theory) کی کچھ تصویری اشکال آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔مزید تفصیل کے لئے سائنس کی درسی کتب بالخصوص طبیعاتِ جدید (Modern Physics) یا اطلاقی سائنس (Applied Science) کی کتابوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔





آپ شاید یہ جان کر حیران ہوں گے کہ "الأمـــر مـــزدوجة" یعنی کسی عمل کے دوبار اطلاق (Double Command) سے عملِ مسلسل بنانے کا فارمولہ صرف زیرِ بحث آیت نمبر 40/11 میں ہی دو بار موت اور دو بار زندگی دینے کی بات کر کے نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اس خاص سائنسی اصطلاح کو قرآنِ کریم میں دیگر متعدد مقامات پر بھی بالکل اسی انداز میں استعمال کیا ہے جیسے آج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ انجینئر، ڈاکٹر، سائنسدان اور ماہرین ریاضی اپنے مضامین میں علمی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ اللہ نے اپنے آپ کو عـــــلیـــــم یعنی اعلیٰ تعلیم یافتہ (Highly Educated) کہا ہے جس کے لحاظ سے اس نے قرآن میں سائنسی اور علمی اصطلاحات کا استعمال بھی کیا ہے جنہیں دراصل سمجھنے کی ضرورت ہے تا کہ قرآن کا اصل مفہوم

سامنے آ سکے۔

جی تو چاہتا ہے کہ قرآنِ کریم کی سبھی آیات جن میں double command کی live loop کا یہ فارمولہ استعمال ہوا ہے یہاں نقل کر دی جائیں مگر ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے اس لئے معذرت کے ساتھ چند ایک آیات کی مثالوں پر ہی اکتفا کیا جائے گا جنہیں مروجہ تراجم کے ساتھ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے کیونکہ فی الحال اس مضمون میں ان آیات کے تراجم سے کسی بات کا دھرا حکم (double command) ہی دیکھنا مقصود ہے لیکن ہمارے جن مضامین میں ان آیات کا بیان آئے گا وہاں ہم ان کے تراجم بھی درست کر کے لکھیں گے۔ ڈبل کمانڈ کی اور بھی بہت سی آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں جن کا مطالعہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ۔(9/101)

اور تمہارے گرد و نواح کے کچھ گنوار منافق ہیں اور بعض مدینہ والے بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں تم انہیں نہیں جانتے ہم انہیں جانتے ہیں ہم انہیں دو بار سزا دیں گے پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔(9/101)

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔(28/54)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔(28/54)

وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔(17/4)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں وحی بھیجی کہ تم ضرور زمین میں دو بار فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے۔(17/4)

وَ قَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ۔

اوراللہ نے فرمایا ہے کہ دومعبود نہ بناؤ۔ معبود وہی ایک ہے۔تو مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔(16/51)

قارئینِ کرام مندرجہ بالا آیات کودیکھ کر مکمل غوروفکر کے ساتھ فیصلہ آپ کوخود کرنا ہے کہ کیا یہ محض اتفاق ہے یا حقیقت کہ ''الأمـــر مـــزدوجة''یعنی کسی عمل کے دوبارا طلاق (Double Command) سے عملِ مسلسل بنانے کا اصول جو دوبار موت اور دوبار زندگی دینے کے سلسلے میں آیت نمبر 40/11 میں بتایا گیا ہے وہی اصول اور فارمولہ ان آیات میں بھی دکھائی دے رہا ہے؟

آیئے ہم ان آیات کوایک ایک کر کے ان میں دی ہوئی ڈبل کمانڈ کا تجزیہ کریں۔

آیت 9/101 میں ان چھپے ہوئے منافقین کا ذکر کیا گیا ہے جن کا علم نبی کریم ﷺ کو بھی نہیں تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی نشان دہی فرمائی۔سبھی جانتے ہیں کہ چھپے ہوئے مجرم زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اس لحاظ سے ان کے جرائم کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔وہ کوئی ایک دو گناہ کر کے معافی نہیں مانگ لیتے بلکہ گناہ پہ گناہ اور جرم پہ جرم کرتے چلے جاتے ہیں۔ان کے جرائم اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے منصوبے اس قدر بڑھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کو وحی کے ذریعے ان منافقین کی نشان دہی کرنا پڑی۔تو کیا نبی ﷺ اور ان کے صحابہ کے ساتھ منافقت کے جرم میں ان منافقین کو صرف دو بار سزا ملنے کے ان کی چھٹی ہو جائے گی؟۔یا بہت سی سزاں کا دیر تک چلنے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا؟

آیت 28/54 میں ان راست باز لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جنہوں نے برائی کا راستہ چھوڑ کر بھلائی کا راستہ اختیار کیا۔کیا ان کی ثابت قدمی کے بدلے میں انہیں صرف دو ہی بار اجر دیا جائے گا؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسی قرآن میں یہ بھی فرمایا ہے کہ راست باز لوگوں کو دیا جانے والا اجر اللہ کی طرف سے ایک ایسا تحفہ (Gift) ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

آیت 17/4 میں بنی اسرائیل کو کتاب میں وحی بھیجی گئی کہ وہ زمین میں دو بار فساد کریں گے اور بڑی خرابی کریں گے۔کیا واقعی میں بنی اسرائیل نے زمین میں صرف دو بار فساد کیا؟۔ہم سب بخوبی واقف ہیں کہ بنی اسرائیل کے برپا کئے ہوئے فسادات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔گزشتہ فسادات اور خون خرابے کی تاریخ کی ورق گردانی میں تو بہت وقت لگ جائے گا صرف حالیہ فسادات کا ہی

جائزہ لے لیں تو یہ ثابت ہونے میں ہرگز دیر نہیں لگتی کہ بنی اسرائیل نے زمین میں صرف دو فساد ہی برپا نہیں کئے بلکہ ان کے فسادات کا ایک لمبا سلسلہ (cycle) ماضی سے ہوتا ہوا حال تک پہنچا اور اب آگے مستقبل کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔عراق میں فساد، افغانستان میں تباہی، پاکستان میں ڈرونز حملے، لیبیا میں قتل و غارت، مصر میں خانہ جنگی، فلسطین میں آئے دن خون خرابہ۔ یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں میں جو ہمیں اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ قرآن کے یہ الفاظ کہ بنی اسرائیل زمین پر دو بار فساد کریں گے دراصل بنی اسرائیل کی طرف سے مستقل اور ہمیشہ کے لئے یا ایک طویل مدت تک زمین پر فساد کرنے کے لامتنٰہی سلسلے کی بات کرتے ہیں جو بل کمانڈ کی لوپ کے قانون کے عین مطابق ہے۔

آیت 16/51 میں تنبیہ کی گئی ہے کہ دو معبود نہ بنا- کیا لوگ صرف دو ہی معبودوں کو مانتے ہیں؟۔یا پھر نزولِ قرآن کے زمانے میں ان لوگوں کے صرف دو ہی معبود تھے؟ جنہیں تنبیہ کی گئی تھی کہ دو خداؤں کو نہیں صرف ایک خدا کو مانو۔قرآنِ کریم کی آیات 53/19-20 بتاتی ہیں کہ اس زمانے میں بھی لوگ ''لات''، ''منات'' اور ''عزہ'' کو اپنا معبود مانتے تھے۔ان کے علاوہ بھی بہت سے بتوں کی پرستش کی جاتی تھی جو مقامی لوگ بھی تراشتے تھے اور تجارتی قافلوں کے ہاتھ ہندوستان سے بھی منگوائے جاتے تھے۔فتح مکہ کے بعد جب ان نام نہاد معبودوں کو توڑا جا رہا تھا تو ان کے پجاریوں نے ان میں سے کچھ بت تجارتی سامان میں چھپا کر واپس ہندوستان اسمگل کر دئے جو بعد میں سومنات کے مندر میں رکھے گئے اور بالآخر محمود غزنوی کے ہاتھوں چکنا چور ہوئے۔

قارئینِ کرام مندرجہ بالا حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح؟

قرآن کی ان سبھی آیات میں جو کچھ بھی ''دو بار'' ہونے کے حوالے سے کہا گیا وہ سب غلط ثابت ہو گیا جس کے نتیجے میں دو باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱......یا تو قرآن غلط ہے جو حقیقت کے برعکس اور اپنے ہی بیانات کے خلاف بات کرتا ہے۔

۲......یا پھر ہم غلطی پر ہیں جو قرآنی الفاظ کا صحیح مفہوم لینے میں ناکام رہے اور تراجم میں کی

جانے والی دیگر غلطیوں کے ساتھ ساتھ ہم نے کسی عمل کے دوبار اطلاق یعنی ''الأمر مزدوجۃ''کو صرف گنتی کے لحاظ سے ہی دوعدد سمجھا مگر حقیقت کے لحاظ سے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔

ہمارا ایمان ہے اللہ تعالیٰ پر، اس کے بنائے ہوئے فرشتوں پر، اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر، اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر۔اس لئے قرآن کا غلط ہونا بعید از قیاس ہے۔پھر غلطی کس سے ہوئی؟

یقیناً غلطی انسانوں کی ہی ہے جو نہ تو خود قرآن سمجھے اور نا ہی دوسروں کو سمجھا سکے۔آج نہیں تو کل۔ یہ فیصلہ تو ہو کے رہے گا۔ ورنہ ہم کبھی بھی کفار کے ان ناپاک سوالوں کا جواب نہیں دے پائیں گے جو وہ آئے دن میڈیا، انٹرنیٹ اور سوشل نیٹ ورک پر کرتے رہتے ہیں کہ قرآن غلطیوں اور تضادات کا مجموعہ ہے۔

غلطیاں اور تضاد قرآن میں نہیں بلکہ اس کے تراجم میں ہیں لیکن بدنامی اور بے حرمتی قرآنِ کریم کی ہورہی ہے اور نام خراب اللہ کا ہو رہا ہے۔اسی طرح قرآن کے نام پر لکھی جانے والی ضخیم تفسیروں میں بھی کوئی ایسا مدلل مواد موجود نہیں ہے جو کسی کو قائل کر سکے اور نہ ہی یہ کتابیں قرآنی تعلیمات کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ان میں تو صرف علماءِ کرام کے اپنے خود ساختہ نظریات کی بھر مار ہے جس کا قرآن سے کوئی لینا دینا نہیں بلکہ یہ تفسیریں قرآن کی ساکھ کو الٹا نقصان پہنچا رہی ہیں۔قرآن کو صرف قرآن ہی سے سمجھنا فائدہ مند ہے۔علما کی لکھی ہوئی لغات بھی کوئی خاص فائدہ مند نہیں کیونکہ وہ بھی وہی معانی دیتی ہیں جو علماء نے اپنی تفاسیر میں لکھے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ غیر قرآنی تفسیریں من گھڑت روایات کا ہی دوسرا رخ ہیں جن کی مدد سے قرآن سمجھنے والا ہمیشہ بے یقینی کی کیفیات میں مبتلا رہتا ہے کیونکہ وہ قرآن سمجھ ہی نہیں سکتا۔ بڑے سے بڑے عالموں کی تفسیروں میں انہیں آیات کو دیکھ لیجئے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔آپ کو ایسے ایسے خود ساختہ اور مضحکہ خیز بیانات ملیں گے جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے تفسیر لکھنے والے علماء وہیں کھڑے تھے جب قرآن کا بیان کردہ کوئی واقعہ پیش آیا۔اللہ کا فرشتوں سے مکالمہ ہوتا ہے تو یہ اس کے چشم دید گواہ بن کے اندر کی ایسی بات بتاتے ہیں جو قرآن کے احاطہِ بیان سے بالکل باہر ہوتی ہے۔آدم سے شیطان کا مکالمہ ہو یا پھر فرعون کے جادوگروں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ ہو یہ علماء

وہاں بھی یہ دیکھنے کے لئے موجود ہوتے ہیں کہ وہ واقعی میں سانپ تھے یا رسیاں تھیں۔ کچھ ایسی چشم دید گواہی بھی جو یہ کہتے ہیں کہ وہاں نہ سانپ تھے نہ ہی رسیاں اور معاملات محض بات چیت کے ذریعے ہی طے ہو گئے تھے۔دو معبودوں کو نہ ماننے کا مطلب لیتے ہیں کہ ایک ہی معبود کو مانو۔ یہ کون سی تفسیر ہوئی؟ یہ تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی اسی آیت کے اگلے حصے میں فرما دیا ہے۔راست باز لوگوں کو دو اجر ایسے ملیں گے ایک تو دنیا میں اور دوسرا آخرت میں۔ گنہگاروں کی سزا دو بار اس لئے بتائی گئی کہ انہیں آخرت میں دگنی سزا دی جائے گی۔ دو بار موت آنے اور دو بار زندگی ملنے کی تفسیر ایسے کرتے ہیں کہ جیسے انہیں ابھی تک یاد ہے کہ انکی پہلی موت کب اور کیسے واقع ہوئی تھی اور اس کے بعد انہیں پہلی حیات کیسے ملی؟ بقول ان کے تمام روحیں پہلے ہی بنا دی گئی تھیں پھر انہیں موت دے کر سلا دیا گیا اور جوں جوں کسی کی باری آتی گئی اسے جسم دے کر دنیا میں رخصت کر دیا گیا۔ یہ تو پہلی موت کا آنکھوں دیکھا حال ہو گیا۔اب فرماتے ہیں کہ چونکہ زندگی ملنے سے پہلے یعنی دنیا میں آنے سے پہلے ہم مردہ تھے اور دنیا میں آ کر ہمیں پہلی بار زندگی ملی تو یہ حیات الاولی کہلائی اور دنیا میں آنے سے پہلے کی حالت موت الاولیٰ شمار ہوئی۔ دنیاوی موت یعنی دوسری موت کے بعد ہم قیامت تک کے لئے ایسے سو جائیں گے کہ گویا ہمیں وقت کا احساس ہی نہیں ہوگا اور قیامت والے دن جب ہمیں زندہ کر کے قبروں سے اٹھایا جائے گا تو ہم افسوس کا اظہار کریں گے کہ ہمیں گہری نیند سے کس نے جگا دیا؟ یہ ہماری دوسری اور آخری زندگی ہو گی۔ کچھ فرشتے ہمیں آگے سے ہانکتے ہوئے اور کچھ پیچھے سے دھتکارتے ہوئے حشر کے میدان میں تختِ خداوندی تک لے جائیں گے۔ جہاں اللہ تعالیٰ پوری خلقت کو اسی میدان میں جمع کر کے فرداً فرداً سب کا حساب لیں گے۔ کچھ ڈھکا چھپا نہیں رہے گا۔سب کے پول سب کے سامنے کھول دیئے جائیں گے۔راست باز لوگ ہمیشہ کے لئے جنت میں بھیج دیئے جائیں گے اور گنہگاروں کو دوگنا عذاب دے کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا، جہاں انہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔

قارئینِ کرام ہوشیار! یہ کمنٹری ہرگز قرآنی نہیں بلکہ بالکل غلط ہے۔جہاں پہاڑ تجلیِ رب العزت برداشت نہ کر سکے اور جل کر خاک ہو گئے وہاں قبروں سے نکال کر زندہ کئے ہوئے مردے اپنے مریل خاکی جسم کے ساتھ آنکھیں موندتے ہوئے بھیڑ بکریوں کی طرح رب ذوالجلال

کے سامنے کیسے حاضر ہوں گے؟ قرآن کو نہ تو کسی عالم کی ضرورت ہے اور نہ ہی یہ کسی کی تفسیر کا محتاج ہے۔ کلام اللہ کی یہی خوبی ہے کے وہ سب تفسیروں سے بے نیاز ہو کر اپنی تفسیر خود کرتا چلا جاتا ہے صرف تھوڑی سی سوجھ بوجھ اور عقلِ سلیم چاہئے جو آپ کو ودیعت کر دی گئی ہے بس خالی الذہن ہو کر غور و فکر کے ساتھ قرآن پڑھئے۔ صحیح راستہ خود بخود ملتا چلا جائے گا۔ قرآنی تعلیمات کے جمود کی وجہ ہی یہ تفاسیر اور تراجم ہیں جنہوں نے تحقیق کا راستہ بالکل بند کر رکھا ہے۔ دنیا لمحہ بہ لمحہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے سے آگے بڑھتی جا رہی ہے اور ہم ہیں کہ وہی صدیوں پرانی روایتی تفسیروں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مفسروں کے گن گا رہے ہیں کہ واہ فلاں صاحب نے تو کمال کی تفسیر کی ہے۔ درسِ قرآن کے نام پر انہیں کے پرانے ریکارڈ کئے ہوئے لیکچر چل رہے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم بہت بڑا نیکی کا کام کر رہے ہیں۔ بعضوں کیسٹ بجانے والوں کو تو یہ بھی کہتے ہوئے سنا گیا کہ اصل میں یہی وہ صلاۃ ہے جس کا بار بار قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا تو قرآن موجودہ اور آنے والے دور کے تقاضے پورے نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ پہلے کے علم اور موجودہ علم میں بہت فرق ہے۔ انسانی سوچ اور عقل نے بھی خاطر خواہ ترقی کی ہے مگر ہم نے اس ترقی یافتہ علم اور عقل کا استعمال قرآن پر بالکل نہیں کیا۔ بس دشتِ صحرا میں ایک سراب ہے جس کے پیچھے ہم آنکھیں بند کئے چلے جا رہے ہیں نہ منزل کی خبر ہے نہ انجام کا پتہ!

قارئینِ کرام ہم یہ بات قرآن کریم سے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ "الأمر مزدوجة" یعنی کسی عمل کے دو بار اطلاق (Double Command) سے عملِ مسلسل کے لامحدود ادوار (Infinite Cycles) بنانے کا اصول جو دو بار موت اور دو بار زندگی دینے کے سلسلے میں، آیت نمبر 40/11 میں بتایا گیا ہے وہ درحقیقت گنتی کے اعتبار سے صرف دو بار نہیں بلکہ کئی بار ہونے والا جاری عملِ مسلسل ہے۔

اسی قرآنی اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس سے مندرجہ ذیل فارمولہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔

پس: X2 عمل = عملِ مسلسل کے لامحدود ادوار

2 X actions = A series of countless repetitions

جہاں کوئی رقم یا اعداد و شمار کی گنتی اس قدر بڑھ جائے کہ پڑھنے والوں کے لئے اس کا تخمینہ لگانا مشکل ہو وہاں علمِ ریاضی اور دیگر سائنسی علوم میں اختصار سے لکھنے کی سائنسی اصطلاح (Scientific Term) استعمال کی جاتی ہے۔

مثلاً: اگر 1000000000 لکھنا ہے تو اتنی بڑی رقم کی بجائے ہم اسے اختصار کے ساتھ 10^9 بھی لکھ سکتے ہیں۔ اور 81 کی بجائے 9^2 بھی لکھا جا سکتا ہے۔ اگر آج کے انجینئر اور سائنسدان اپنے نقشہ جات (technical drawing) مخطوطات ونوشتہ جات (manuscripts) میں یہ تکنیکی اصطلاحات لکھ سکتے ہیں تو اللہ تبارک تعالیٰ جو بذاتِ خود انجینئر، آرکیٹیکٹ اور مینوفیکچرر ہیں وہ اپنے لٹریچر میں ان فنی اصطلاحات کا استعمال کیوں نہیں کر سکتے؟

قارئینِ کرام اب ہم سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 28 کا مطالعہ کرتے ہیں:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔(2/28)

کیسے منکر ہوتے ہو تم اللہ سے اور جب تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر وہی تم کو موت دیتا ہے، پھر وہی تم کو زندہ کرتا ہے، پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاتے ہو۔(2/28)

اس آیت کے تراجم اور تفاسیر میں بھی بڑے بڑے جید علمائے کرام نے حسبِ عادت خوب قلابازیاں کھائیں۔ تاکہ اس آیت کے زمانہ حال میں آنے والے بیان کو مستقبل میں گھڑ کے اپنے روایتی نظریات کی رو سے کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کر دیں کہ قیامت کے دن سے پہلے زندگی کی دوبارہ فراہمی بالکل ممکن نہیں۔ حالانکہ اس آیت کی ابتداء ہی "كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ" کے تنبیہی الفاظ کے ساتھ ہوئی ہے یعنی جو کچھ اس آیت میں بیان کیا جا رہا ہے اس کا تم انکار کیسے کر سکتے ہو؟ مگر صد افسوس کہ اس انکار کو عین قرآنی تعلیم کا حصہ بنا کر پیش کیا گیا اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے لفظوں کی ہیرا پھیری سے قرآن کی دیگر آیات کے حوالے دے کر من گھڑت جواز تراشے گئے اور انہیں تفسیری کتب میں بڑی ہوشیاری سے مرقوم کر دیا گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ مجمع لگا کر درسِ قرآن بھی شروع کر دیا جس سے غیر قرآنی خیالات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ان کے غیر قرآنی عقائد کی تبلیغ بھی چالو ہوگئی۔ پھر جگہ جگہ ان کے چرچے ہو گئے۔ کچھ یار لوگوں نے کفر کے فتوے بھی

لگائے جن سے ان کی شہرت میں اور چار چاند لگ گئے۔ جب وہ ملکِ عدم کو سدھارے تو ان کے نونہال حواریوں نے ان کی جگہ سنبھال لی اور قرآن کے نام پر غیر قرآنی دروس کا وسیع پیمانے پر انتظام کر دیا جو تا حال جاری ہے۔

قارئینِ کرام سورۂ بقرہ کی (2/28) مندرجہ بالا آیت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ یہ یاد دہانی کرا رہے ہیں کہ جب تم مر گئے تھے تو تمہاری زندگی پوری طرح بحال کر دی گئی تھی۔ ''اَمۡوَاتًا'' کسی پہلی زندگی کو ختم کر کے دی جانے والی موت کی طرف صاف صاف حوالہ دے رہا ہے نہ کہ اس حالت کا کہ جو بنا کبھی زندگی ملے ہوتی ہے۔ جیسا کہ علماء نے زندگی ملنے سے پہلی حالت کو موت سے تعبیر کیا ہے۔

اس ضمن میں سورۂ مریم کی آیت 19/67 ملاحظہ فرمایئے:

اَوَ لَا یَذۡکُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ یَکُ شَیۡئًا۔

''کیا انسان کو یہ بھی یاد نہیں کہ ہم نے جب اسے پیدا کیا اس سے پہلے وہ کوئی چیز نہیں۔'' (19/67)

مندرجہ بالا آیتِ کریمہ سے بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ جب پہلی بار انسان کو پیدا کیا گیا تو وہ اگر کوئی چیز تھا ہی نہیں۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا تو وہ حالتِ موت کیسے ہوئی؟ موت تو اسے ہوتی ہے جسے پہلے زندگی دی جائے یا جو پہلے کبھی جیتا جاگتا انسان ہو!

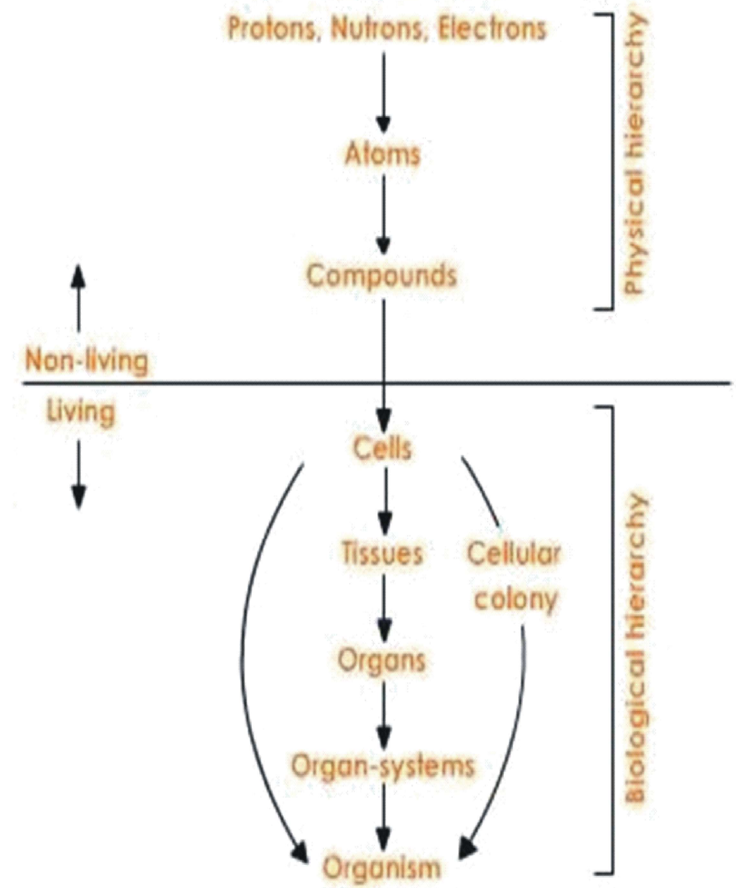
''اَحۡیَا'' بحال کرنے (Restore) اور ''إعادة تأهيل'' یعنی دوبارہ بسانے یا دوبارہ زندگی دینے (rehabilitate) کے معنی میں آتا ہے نہ کہ پہلی بار پیدا کرنے کے لئے۔ پہلی بار پیدا کرنے کو ''خلق'' کہا جاتا ہے جس کا حوالہ آپ سورۂ مریم کی آیت 19/67 میں اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کی دیگر آیات میں بھی انسان کی تخلیق کے بارے میں ''خلق'' ہی استعمال ہوا ہے ''اَحۡیَا'' نہیں۔ ''اَحۡیَا'' اور ''خلق'' کا اتنا بڑا فرق بحث کرنے والے تفسیری علماء اور ان کے درسی پیروکاروں کے پلے کیوں نہیں پڑا؟

''فَاَحۡیَا'' کے شروع میں ''ف'' چار ڈگری بلند پیمانے پر تقریری سچائی بیان کر رہا ہے۔ جو کہ کسی انتہائی سچے بیان کی دلیل ہے کسی مفروضے کا استعارہ (Metaphor) نہیں کہ اگر کسی کو کچھ

نہیں ملا تو اپنے غیر قرآنی خیالات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یونہی بڑ بڑا دیا کہ یہ تو اصل میں فلاں بات کا استعارہ ہے۔

2/28 کا دوسرا حصہ بھی بالکل شفاف ہے ''پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے اور وہی تمہیں زندہ کرتا ہے، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاتے ہو'' فرق صرف اتنا ہے کہ تراجم اور تفاسیر میں اس بیان کو زمانۂ مستقبل سے بدل دیا گیا ہے تا کہ قیامت کو قبروں سے مردے اٹھنے کے تصور پر کوئی آنچ نہ آنے پائے بھلے ہی کلامِ اللہ میں مستقبل کا کوئی صیغہ ہے یا نہیں مگر ہمیں لوگوں کو گمرہ کرنا ہی ہے۔ انہیں عقل کے ناخن دے کر یہ بات کون سمجھائے کہ قرآن کی رو سے یہ ایک ایسا عملِ مسلسل ہے جس کا کسی زمانے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ قانونِ قدرت تو ہر دور میں عمل پذیر رہتا ہے اور یہی وہ قرآنی تصورِ آخرت ہے جس پر ایمان لانا بحیثیت مسلمان ہمارے ایمان کا لازمی حصہ ہے۔

جو لوگ اب بھی ''اَحۡیَا'' اور ''خَلَقۡنا'' کا فرق سمجھنے سے قاصر ہیں اور بضد ہیں کہ 2/28 میں بیان کردہ پہلی موت جس سے پہلی بار زندگی ملی وہ موت انسان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے کی حالت ہے جب وہ کچھ نہیں تھا اور اس بات کو بھی نہیں مانتے کہ موت تو صرف اسی کو آتی ہے جسے کبھی زندگی نصیب ہوئی ہو۔ ان کے علم میں اضافے کے لئے تجربات اور مشاہدات سے حاصل ہونے والے دورِ جدید کے سائٹیفک علم کی متفقہ ثابت شدہ دستاویز اور حوالے مندرجہ ذیل ہیں:



جانداراور بے جان چیزوں کے درمیان انکی بناوٹ میں فرق کی سائنسی ترکیب

مندرجہ بالا چارٹ میں مردہ چیزوں یعنی وہ اشیاء جو کبھی جاندار تھیں اور زندگی کے بغیر چیزوں کے درمیان وہ واضح فرق بتایا گیا ہے جو انسان بہت عرصہ پہلے دریافت کر چکا ہے۔ اگرچہ کچھ علماء سائنس کے علم اور اس میں ہونے والی ترقی کو نہیں مانتے مگر موجودہ دور میں سائنس ہی ایک ایسا مصدقہ اور قابلِ اعتماد علم ہے جس کی بنیادیں کسی فردِ واحد کے ذاتی نظریات کی بجائے مدلل اور مصدقہ ثبوتوں پر استوار کی گئی ہیں۔

سائنسی اصولوں کے مطابق وہ بے جان اشیا جن میں کبھی زندگی تھی ہی نہیں اور نا ہی ان میں

کبھی زندگی پائی جاسکتی ہے ان کی بناوٹ میں ایٹم (Atoms) استعمال ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کو سائنس مردہ نہیں مانتی بلکہ ان کی تعریف زندگی کے بغیر (Non-Living) اشیاء کے طور پر کی جاتی ہے۔ جبکہ مردہ چیزوں میں ایٹم کی بجائے سیل (Cell) پائے جاتے ہیں جو مردہ اور بے جان اشیاء میں تمیز کرتے ہیں۔ سائنس مردہ کی تعریف ایسے کرتی ہے کہ ان میں کبھی زندگی تھی کیونکہ مرنے کے بعد بھی ان میں مردہ سیل (Dead Cells) کی موجودگی ہی ان کے کبھی زندہ ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ لہذا قرآن اگر کسی شے کو مردہ (dead) کہتا ہے تو وہ شے بے جان (non-living) نہیں کہلائے گی بلکہ سائنسی لحاظ سے وہ شے مردہ کہلاتی ہے جو کبھی زندہ تھی۔ اس لئے مردوں کو زندگی دینے کا قرآنی بیان عدم وجود سے وجود میں آنے کے لئے نہیں لیا جاسکتا بلکہ قرآن ان مردوں کو دوبارہ زندگی دینے کی بات کرتا ہے جو پہلے زندہ تھے اور اپنی زندگی گزار کے جب مر گئے تو انہیں دوبارہ زندگی دے دی گئی۔ یاد رہے کہ مردوں کو زندگی دینے کا یہ عمل جو قرآن بیان کرتا ہے وہ ہمارے عقائد والی قیامت سے پہلے کی باتیں ہیں جو ہمارے موجودہ عقائد کی کلی طور پر نفی کرتی ہیں۔

سب سے پہلے مشہور سائنسدان انٹن وین لیون ہوئیک (Anton van Leeuenhoek) نے مردہ اور زندگی کے بغیر چیزوں کے درمیان فرق اس وقت دریافت کیا جب اس نے ایک انسانی مردہ جسم (Dead Body) کو اپنی خوردبین سے دیکھا تو اسے اس مردے میں سیل دکھائی دیئے۔ تاہم یہ سیل مردہ ہونے کے باعث بالکل خالی اور ناکارہ ہو چکے تھے مگر وہ پھر بھی مردہ جسم میں موجود تھے۔ اس کے بعد مردوں پر بے شمار تجربے کئے گئے اور ان تجربات کی روشنی میں مردہ کی سائنسی تعریف یہ کی گئی کہ چونکہ ان میں سیل پائے جاتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان مردوں پہلے جان تھی اور پھر انہیں موت آئی جس کی وجہ سے وہ مردہ (Dead) کہلائے۔ اسی طرح سوکھی لکڑیوں اور جانوروں پر بھی تجربات کئے گئے اور ان سب میں سیل پائے گئے۔ جو اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان میں کبھی زندگی تھی۔ ان کے برعکس جب ان چیزوں پر تجربات کئے گئے جن میں کبھی زندگی نہیں تھی تو یہ دریافت ہوا کہ ان میں سیل موجود نہیں ہیں بلکہ وہ خلیات یعنی cells کی بجائے ایٹموں (atoms) سے بنائی گئی ہیں۔ مثلاً جب دھاتی ٹکڑوں پر ایسے ہی تجر

بات کئے گئے تو ان میں سیل نہ ہونے کی وجہ سے زندگی کے آثار نہیں ملے۔ اس لحاظ سے زندگی کے بغیر (Lifeless or non-living) چیزوں کو مردہ نہیں کہا جاتا کیونکہ انہیں موت نہیں آتی۔

ان تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ سائنس ''اَحْیَا'' اور ''خَلَقْنا'' میں بخوبی امتیاز کرتی ہے۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی آیت 2/28 میں بھی مردہ کو زندگی دینے کا ارشادِ عالی اپنی جگہ پر درست ہے۔ ترجموں اور من گھڑت تفسیروں میں مردہ (dead) کی تعریف یعنی زندگی ملنے سے پہلے کی حالت بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

مضمون کے تسلسل میں قرآنِ کریم کی ایک اور آیتِ مبارکہ کا حوالہ حاضر خدمت ہے:

ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَ يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا۔

پھر وہ اعادہ کرتا ہے تمہیں اسی میں لوٹانے کا اور اسی میں سے باہر نکالنے کا۔'' (71/18)

کسی عمل کے بار بار کرنے کو اعادہ کرنا کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے لئے ''**يُعِيدُ**'' کا لفظ آیا ہے جو ''عید'' سے ماخوذ ہے۔ جس طرح عید ہر سال بلکہ سال میں دو بار بطورِ تہوار اعادہ کرتی ہوئی بار بار آتی ہے۔ اسی طرح بار بار موت و حیات کی گردش بھی لگاتار چلتی رہتی ہے۔ جس میں انسان بار بار جیتا ہے اور بار بار مرتا ہے۔

ڈاکٹر کاشف خان

quranguide@hotmail.com

کتاب کا نام : اِحتساب اور پیدائشِ نَو
Rebirth or Reincarnation

مؤلف : ڈاکٹر کاشف خاں : لندن

تعداد : ایک ہزار

منجانب : آپ کا ایک خیر خواہ بھائی۔